

اسلام کے بنیادی عقائد



نختہ الاسلام مجاہدین بنی موسوی لاری



نختہ الاسلام مولانا روشن علی

jabir.abbas@yahoo.com

نام کتاب : ————— اسلام کے بنیادی عقائد
مصنف : ————— مجتہد الاسلام سید محمد بن موسیٰ لاری
ترجمہ : ————— جز الاولیٰ مولانا مدظلہ العالی
خطاطی : ————— سید علی حسین رضوی کشمیری
ناشر : ————— دفتر گسترش فرهنگ اسلامی
تعداد : ————— ۳۰۰۰ (تین ہزار)
ہارڈ بیچ : ————— شوال ۱۴۰۸ھ
مچاپ : ————— اول

فہرست

۵	• عرفی مترجم
۷	• بحث معرفت خدا
۹	• خدا کی معرفت
۱۸	• وجود کی گہرائیوں سے خدا کے جستجو کی آواز۔
۳۱	• خدا اور تجرباتی علوم کی تعلق۔
۴۱	• وجودِ نادیدہ کا قیدہ صرف خدا ہی میں منحصر نہیں ہے۔
۴۹	• اصل علت۔
۵۳	• اصالت نیروی حیات۔
۵۸	• فطرت میں خدا کے جلوسے۔
۶۳	• بارہ قوانین وجود۔
۶۵	• دو طرفہ توازن۔
۶۸	• علمِ طب کا کارنامہ۔
۷۰	• طبیعت کی ظرافت کا دیباچہ۔
۷۳	• موجود مطلق کا تصور۔
۷۷	• خدا علت سے بے نیاز ہے۔

۸۱	● ہر موجود محتاج علت ہے۔
۸۳	● سلسلہ علت کا تتبع۔
۸۶	● عالم حادث ہے۔
۹۱	● انسان کی بے بسی اور محدودیت۔
۹۲	● علمی دعوہ کا بازی۔
۱۰۰	● بے دینی کے اسباب۔
۱۱۳	● خدا کے صفات اور حقائق۔
۱۲۳	● ایڈیل خدا کے شرائط۔
۱۲۸	● دعا شکر کی بہترین علامت ہے۔
۱۳۲	● صفات خدا قابل قیاس نہیں ہیں۔
۱۳۸	● خدا کی بختی۔
۱۴۷	● خدا کی غیر محدود قدرت۔
۱۵۶	● علم خدا۔
۱۶۳	● مباحثہ عدل؛
۱۶۳	● نظریات دربارہ عدل۔
۱۶۳	● عالم پر شر و فساد کی حکمرانی کیوں؟
۱۸۰	● معائبِ عالم بیداری و حرکت ہیں۔
۱۸۸	● نابرابری۔
۱۹۷	● مسئلہ جبر و اختیار؛
۱۹۹	● اصل موضوع پر ایک نظر۔
۲۰۱	● جبر کے قائل حضرات۔
۲۱۶	● قائلین اختیار۔
۲۲۳	● درمیانی بات۔
۲۲۸	● مسئلہ قضا و قدر؛
۲۳۵	● ذہبِ اعتدال۔
۲۳۶	● قضا و قدر۔
۲۴۷	● قضا و قدر کی ناقص تفسیر۔

عرضِ مترجم

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين وآلاف النجاة والاکرام علی سید المرسلین وآل المعصومین
واللعنة الدائمة علی اعدائهم اجمعين۔

اما بعد۔ کتاب اسلامی اصول فقائد اس دور کی بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی
یہ ہے کہ عصر حاضر کے پڑھنے والے نوجوان ذہن کو بہت زیادہ پسند کرتی ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے فزیکل اور مغربی
مفکرین کے فقائد و نظریات پیش کر کے اسلامی اصول کو سمجھا گیا ہے۔ مادہ پرستوں کے سمات سے توحید الہی
قرآن و احادیث سے عدل پروردگار کے اثبات پر انفاذ کرتے ہوئے موجودہ دور کے ایجادات سے بھی ثبات
مطلب کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں صرف توحید، عدل، قضا و قدر، جبر و اختیار سے بحث ایک نوکے انداز سے کی گئی ہے
اہمیت کا احساس تو مطالعہ کے بعد ہی ہوگا۔

مجھ اس کا اعتراف ہے کہ ترجمہ میں بعض مقامات پر مشکل الفاظ کا استعمال ہو گیا ہے۔ کچھ تو غیر ضروری
طور پر مگر بعض مقامات پر مجبوراً ایسا ہوا ہے۔ آخر اصطلاحی الفاظ کا ترجمہ کیا جائیگا؟ اور اگر آپ زبردستی کریں بھی
تو آپ کا یعنی اور بین القوسین کی عبارت اس مفہوم کو ہرگز نہ سمجھا پائے گی جو صرف ایک اصطلاحی لفظ سمجھا
دیتی۔ مگر میں پھر بھی معذرت خواہ ہوں کیونکہ اس سے زیادہ آسان زبان میرے دائرہ امکان سے شاید باہر
کی بات ہو۔

یہ کتاب عربی، فارسی، انگریزی زبان میں شائع ہو چکی ہے اب یہ اردو زبان میں شائع ہونے
جلد ہی ہے۔

اس کتاب کا ایک دوسرا حصہ بھی ہے۔ جو تقریباً قریب اختتام ہے۔ اس کے بعد اس کو پڑھیں وہ

بھی بے ثناء ہے۔

جو اس علم و سلین آماہی سیدتی موسوی لاری دلفلم لائق تحسین ہیں کہ ان مشکل مسائل کو انھوں نے تاح امکان بہت ہی آسان طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے معنف کی ایک اور کتاب یمائے تمدن غرب کا ترجمہ مغربی تمدن کی ایک جھلک کے عنوان سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔

آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ فعلی، ہونسیان خمیر انسان میں شام ہے اس سے صرف ملہنا عصمت ہی محفوظ ہیں۔ لہذا جو غلطیاں میں ان سے حقیقہ کو مطلع کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کا تدارک کیا جاسکے۔

پروردگار بھلائے اس ناچیز ترجمہ کو حضرت دلی عفر کے غفیس سے تیری بارگاہ میں پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ خداوند غفیس محمد و آل محمد میری اس تیسرے کوشش کو قبول فرما کر میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔

سلام روشن علی

jabir.abbas@yahoo.com

بحث مفتخر خدا

jabir.abbas@yahoo.com

خدا کی معرفت

اصولی اور فکری بحثوں کے سلسلہ میں انسانی زندگی کے لئے ادیان کے مباحث کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور ہمیشہ یہ مباحث ممکن فکر و نظر سے ہیں اور ساسی سلسلہ کی طرح انسانیت کی سعادت سے وابستہ رہے ہیں اور یہ مباحث بے فائدہ بھی نہیں ہیں بلکہ وسیع و عمیق پیمانہ پر ان کے عملی و ثقافتی آثار رہے ہیں۔ دینداری کے اسباب و اسل کے سلسلہ میں علماء اور محققین کے وسیع مطالعات ہیں اور ہر شخص نے اپنے خصوصی انداز و فن سے تحقیق بھی کی ہے اور ایسے نتائج و احکام بھی حاصل کئے ہیں جو ان کے خصوصی فکر و نظر کے مناسب ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ معلوم و صفتوں کی طرح بشری عقائد بھی درجہ کمال کو پہنچے ہیں۔ قابل تاریخ کے قدیم ترین زمانہ میں بھی عقائد کا وجود تھا جو بشری حقیقت سے تعلق تھے۔ کسی بھی زمانہ میں ایسے بشری جمیع کا وجود نہیں مگر جو عقیدہ سے خالی ہو۔

دینی افکار ایک دوسرے دوسرے دور میں متغیر ہو کر منتقل ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح فکری اور علمی اصول و لغات و وسائل حیات کی طرح مکمل طریقہ سے تبدیل ہو کر انتقال پذیر ہوتے رہے ہیں اسی کے ضمن میں دینی فکر بھی بدلتی رہی ہے اور وہ اپنی پہلی صورت پر باقی نہیں رہ سکی ہے۔

انسانی زندگی کے تصورات اور اس کے علوم و معارف کے نکال کی کیفیت کے بارے میں بحث و تمحیص اور آفاق تاریخی کی گہرائیوں کا مطالعہ ہم کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ قطعی استدلال کی معرفت سے پہلے بھی ان کی کسی نہ کسی عقیدہ کا پابند تھا۔ اس بنا پر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بشری علوم و صنائع کا پہلا دور انسانی عقائد و ادیان کے پہلے دور سے زیادہ برتر و کامل تر نہیں تھا بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایمان

اور اس کے مختلف ظواہر کے درمیان ارتباط کامل کی وحدت کا ادراک کر سکتا اور یہ سمجھ لیتا کہ تمام نظام ہستی ایک ہیے مبدع دانا و توانا کے زیر ارادہ و اختیار ہے جو انسان یا دیگر موجودات سے کسی بھی قسم کی شائبہ نہیں رکھتا اور چونکہ گونا گون موجودات کی پیدائش کو وہ منطقی بنیادوں پر سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے اس کا خیال یہ تھا کہ ہر مخلوق کے لئے ایک مستقل علت ہے۔ لہذا وہ تعدد موجودات کو دیکھ کر تعدد خالق کا قائل ہو گیا۔ اور آخر کار مقدس کشش اور انسانی عالی تہا و بلند و اصل روحانیت اصل راستے سے منحرف ہو گئی اور خدا کے حقیقی کے بجائے مجسمے خداؤں کی طرف مائل ہو گئی اور ان کو پوجنے لگی اور اصرام کوئے لگی اور نفس انسانی اور اس کے ارد گرد موجودات پر قیاس کر کے مجسمے خداؤں کے لئے صفات معین کر کے اپنے وجدان کو سکون بخشنے کا ذریعہ بنایا۔

اور جب انسان کی رفتار و حرکات و دعائیتوں سے متصف ہو ۱۔ حماات و ثبوت ۲۔ نوع انسانی کے نام افراد میں مضمون و محمول تو یہ بات بالکل منطقی اور فطری ہے کہ انسانی روح کی گہرائیوں میں اس کے رگ و ریشہ کا اعتبار کریں۔

تمام ادوار تاریخ میں جنی قبل از تاریخ میں بھی عقیدہ انسانی کے وجود کو محض رسوم و عادات و تقلید دگر ہوتا نہیں کیا جاسکتا جو ستر صورت میں ہمیشہ سے موجود ہے بلکہ یہ ایک فطری تشنگی اور ضروری احساس اور حقیقت نگری کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے پس یہ تمام مذہبی اعتقادات اپنے گونا گون اشکال کے ساتھ ایک پر جوش و سرشار منبع سے کب فیض کرتے ہیں جو نہ پھیلے ہے نہ تعداد فی۔

ابتدا ہی سے انسانی نہاد و طبیعت میں عقیدہ کی قبولیت و استعداد کی صلاحیت رہی ہے اور اسی ذاتی استعداد کی بنیاد پر عقیدہ تشکیلی پذیر ہوئے اور یہی تشکیلی درونی جو حقیقت وجود کے ادراک کے لئے انسان کو فکری تحقیق پر آمادہ کرتی ہے۔ معرفت دینی کی ضرورت پر وسیلہ قاطع ہے۔ لیکن اس ذاتی استعداد کا لازمی نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ جس عقیدہ کو اس نے مان لیا ہے وہ صدود مد صحیح ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ انسانی بدن میں احتیاج غذا موجود ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو جو غذا ملے وہ شریک اور صدود مد صحیح ہو اسی طرح انسانی روح بھی روحانی غذا۔ ایمان و عقیدہ۔ کی محتاج ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو غذا اس کو ملے وہ صدود مد صحیح ہو۔ کیونکہ ذاتی غذا پر یہ صحیح و فاسد غذائیں میں تمیز نہیں کر سکتی۔

محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہمیشہ دینی عقائد بشری زندگی میں منطوق رہے ہیں لیکن اصولاً آدھ و دھرمی اصول چوتھے
کے بنیان گذاری میں کارفرما تھے اس میں ان کے نظریات مختلف ہیں اور ان محققین کے زیادہ تر فیصلے خرافاتی
اویان اور ناچختہ افکار کے مطالعہ پر مبنی ہیں اس نے بہت ہی واضح سی بات ہے کہ آخری تحصیل دین میں
ان کے فیصلے ناقص و غیر منطقی ہوں گے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بہت سے اویان مبدا و حیل سے مرتبہ نہ ہونے کی وجہ سے
اپنے نگاہوں کو دیر اندیش میں اپنے ماحول کے زیر اثر رہے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ تمام اویان
بطور کلی مادی و اقتصادی یا طبعی و خشتناک عوامل کے خوف یا جہالت کی پیداوار ہیں۔ بے شک دین
کے خلاف جو افکار پیدا ہوئے ہیں یا مکتربین خدا کا جو وجود ہے اس کا سبب کچھ مذہبی لوگوں کی فکری انحرافات
ناجھی و غلط کاری ہے لہذا ہر مذہب کے خصوصیات کو بھی فاسکریہ بحث لایا جائے اور وقت نظر سے مطالعہ
کیا جائے۔

بہت سے تاریخی حوادث میں آپ مذہب کو ملوث نہیں پر جام دیکھیں گے اب اگر مذہب کی کوئی بنیاد
نہ ہوتی تو ہمیشہ اپنے مادی دائرہ ہی میں محدود رہتا۔ آخر یہ کون سا معاملہ ہے جس نے مذہبی شخصیتوں کو اپنے
دینی مقاصد کے لئے اتنا مضبوط و پائدار بنادیا؟ کیا مادی منافع کی توقع اور خصوصی مقاصد کے معائب
و مشکات کی جانکاہ غفلتوں کو ان کے لئے خوشگوار بنادیا تھا؟ جی نہیں ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ اپنی
تمام مادی و روحانی امکانات کو اور اپنی شخصی خواہشات کو مقاصد دینی کے لئے اکٹھا بیدار دمی سے قربان
ذکر دیتے بلکہ انہوں نے تو اس راہ میں جان دیدی ہے۔

اس لئے یہ ناممکن بات ہے کہ محض مادی چیزوں کے لئے انسان دین کی طرف میلان رکھتا ہے بلکہ
اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انسان کے باطن میں اصلی مذہبی حس موجود ہے۔ لیونگٹ ڈوش کہتا ہے:
ہمیشہ دنیا میں عبادت کا کام کرنے والے روح مذہب و میلان پر عقیدہ و میلان پرستش و میلان فروری
اور کمال مطلق سے نزدیک ہے۔ جو قابل تصور اور قابل وصول نہیں ہے۔ کا وجود تھا اور اس ارادہ

کے لئے مبدا الہی تھا جو تمام لوگوں میں برابر موجود ہے۔
لے ارتباکات و جہان منہ

مشہور دانشمند ویل ڈیورانت لکھتا ہے: ایمان فطری چیز ہے۔ یہ ڈائریکٹ احساسات و طبعی اعتبار کا سرمایہ ہے اور حفظ نفس، اگر سستی، امان، اطاعت و انقیاد سے زیادہ قوی ہے۔

اور یہی بات کہ مذہب میں غیر منطقی عقاید کا وجود ہے تو یہ بات مذہبی مسائل ہی کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ بہت سے علوم و معانی پر ہر مذہب سے پہلے خرافات سے مخلوط تھے کیونکہ انسان علم طب حقیقی اور مفید کی طرف جادو اور شعبہ بازی ہی سے پہنچا ہے اور عقلی کیا تاکہ اس کی رسانی فی الواقع کے ذریعہ ہوئی ہے۔ بس یہی فرق غیر منطقی مسائل کی تبلیغ و تحقیق کے بعد صحیح عقائد تک سائی ہو سکتی ہے۔ اور یہ تو کوئی کلمہ ہی نہیں سکتا کہ اگر انسان نے کسی چیز کی تلاش میں ایک مرتبہ منطقی کر لی تو پھر کبھی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتا۔

چنانچہ منکرینِ خدا اسی مسئلہ پر جھڑپ کر کے توجہ نکالتے ہیں کہ خدا تو افکار انسانی کی پیداوار ہے۔ مثلاً برٹرائنڈ رسل (BRUNO RUSSELL) انگریزی دانشور کا کہنا ہے کہ حواسِ طبیعی کے خوف سے مذہبِ نم کی چیز پیدا ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو وہ کہتا ہے: میری نظروں میں مذہب ہر چیز سے پہلے بنیادی طور پر ترس و خوف کی بنیاد پر استوار ہوا ہے۔ ایک ایسا خوف ہے جس کی بنا پر لوگ مذہب کے تابع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں کہ اسی خوف کی وجہ سے انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ شکست میں لڑائی جھگڑے میں اس کا کوئی پشت پناہ ہونا چاہئے۔ اب یہ خوف مختلف ہوتا ہے۔ موت کا خوف، شکست کا خوف، راز کے فاش ہونے کا خوف الخ

اگرچہ یہ بات محض شاعرانہ تخیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ یہ تو محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس کے اثبات پر کوئی دین قائم نہیں کی گئی ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شیول کینگ کہتا ہے: مذہب کا منبع اسرار میں ایک سرسور ہے اور علماء کے نظریات اس سلسلہ میں لاتعداد و لامتناہی ہیں بعض منطق سے قریب تر ہیں اور بعض منطقی ہیں۔ لیکن جو نظریہ سب سے زیادہ منطقی ہے وہ بھی مغل آسکا ہے۔ بس منطقی تصور کے اندر ہے۔ اسی لئے علماء اجتماع منبع مذہب کے سلسلہ میں شدید اختلاف نظر رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود رسل

کے جواب میں کہا جاسکتا ہے، اگر ہم فرض کریں کہ عقیدہ خالص میں سب سے اہم اور اصلی چیز ایک انجیما خوف ہے تو کیا اس سے یہ بھی ثابت ہو جائیگا کہ خدا محض ایک وحی و خیالی چیز ہے اس کا کوئی واقعی وجود نہیں ہے؟ اگر خوف ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے رہائی کے لئے انسان ایک پناہ گاہ تلاش کرتا ہے اور اسی جستجو میں وہ حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے تو کیا ایسے کوئی اعتراض ہے؟ کوئی حرج ہے؟ اگر خوف ہی کسی چیز تک رسائی کا ذریعہ ہوتا کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ علت جس کو انسان نے خوف کی وجہ سے حاصل کیا ہے لہذا موہم و غیر واقعی ہے؟ بھلا کیا یہ بات منطقی ہے کہ ہم کہنے لگیں علم طب کوئی واقعی علم نہیں ہے کیونکہ بیماری و مرگ کے خوف سے انسان اسی پناہ گاہ کو تلاش کیا ہے لہذا یہ وحی و چیز ہے؛ ویسے حقیقت یہی ہے کہ علم طب ایک واقعی چیز ہے چاہے اس تک پہنچنے کا ذریعہ علت بیماری و مرگ کا خوف ہو یا کوئی دوسری علت ہو۔

تمام حوادث و واقعات میں ایک دانا تو انا خدا پر ایمان ایک پناہ گاہ اور حقیقی تکیہ گاہ ہے اور اپنی جگہ پر یہ خود ایک مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا اس کے کوئی ربط نہیں ہے کہ واقعہ اصلی انسان میں خدا پر ایمان لانے کے لئے حوادث کا خوف ہے ان دونوں مسئلوں کو الگ الگ دیکھنا چاہئے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ بشر اپنی ابتدائی زندگی میں فطرت کے مشتاک حوادث — مثلاً طوفان، زلزلے، بیماریوں — سے دوچار ہوتا رہا اور کابوس خوف اس کے تمام زندگی و افکار پر اپنا منحوس سایہ ڈالے ہوئے تھا اور اس مرحلہ میں انسان خوف و عاجزی کے باوجود اپنے مجاہدیت شاقہ کے ذریعہ ایک ایسی پناہ گاہ کا جو یاں رہا جس میں ایسے خوفناک حوادث سے پناہ حاصل کر کے جس سے سکون و روح حاصل ہو آہو کار انسان اپنی سعی و محنت اور دائمی جستجو کے نتیجے میں کابوس ذلت و خوف پر غالب آگیا اور قابل رشک کامیابی تک پہنچ گیا۔

قدیم انسانوں کی زندگی میں بحث و فحش کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی افکار پر خوف غالب تھا مگر اس غلبہ خوف کا موجود ہونا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ خوف و جہالت ہی تعبد بالذین کے اہم اسباب ہیں کیونکہ اہم طرز فکر تنگ نظری کا نتیجہ ہے کیونکہ اگر تمام گونا گون اور بشر کی تاریخ زندگی پر باقاعدہ مطالعہ و تحقیق و ریسرچ کے بعد یہ کئی نتیجہ اخذ کیا جائے تب تو ایک بات سے یکن اگر انسانی

تاریخ کے حسین نشیب و فراز کے صرف ایک گوشہ پر تحقیق کر کے یہ نتیجہ نکالا جائے تو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔
 ادوار محدودہ مہینہ میں تمام مشنوں انسان پر مسلط خوف کو بنیاد بنا کر تمام ادوار بشر پر ایک حکم کی لگاؤ
 غیر منطقی بات ہے اور کیا انسان کے انکار و احساسات دینی اور تمام قانون میں۔ حتیٰ عصر حاضر میں —
 عبادت خدا کی طرف توجہ کو قہر طبیعت کے خوف و ہراس و جنگ بیماری کا نتیجہ قرار دینا جلد بازی نہیں ہے؟
 نیز یہ بھی غلط ہے کہ ہر دین کا بچاری لوگوں میں کمزور ترین شخص ہوتا ہے! نہیں ایسا نہیں ہے معنات
 تاریخ میں آج بھی موجود ہے کہ جن لوگوں نے دین کا پرچم بلند کیا ہے وہ سب زیادہ قوی اور مضبوط انہی میں
 تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کیا ایمان بتنا قوی ہوتا یا یگیا انسان اتنا ہی کمزور ہوتا یا یگیا اور دینی رہبر سب کے زیادہ
 ذلیل و کمزور ہوگا۔

کیا ہزاروں علماء و مفکرین جو دین کے پیرو ہیں وہ زلزلے، سیلابوں، امراض کے خوف کی وجہ
 سے مذہب کے پابند ہوئے ہیں؟ یا یہ لوگ علمی تحقیق و منطقی استدلال و عقلی برائی کی بنا پر پابند مذہب ہوئے
 ہیں؟ کیا ان کی پابندی مذہب کو حوادث طبعہ کی باتوں سے حیات و عدم اطلاع پر مبنی کہا جا سکتا ہے؟ بھلا
 صاحبان عقل کیا فیصلہ کریں گے؟

انسان سکون و اطمینان کے لئے مذہب کو نہیں قبول کرتا بلکہ اعتقاد و ایمان باللہ کے بعد مذہب
 کے فوائد میں سے یہ بات ہے کہ اس کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔ الہی علماء کا عقیدہ ہے، علما
 و معلومات اسباب و سببات۔ جن کا بہت باریک بینی سے حساب کیا گیا ہے۔ کے مجموعہ کا نام
 عالم ہے اور کائنات کا دقیق نظام مبدعہ علم و قدرت کے وجود پر شاہد و دلیل ہے۔ کسی چوکھٹے میں
 مختلف غیر متبصر و غیر مفہوم نقوش کا ہونا کسی ماہر و فنکار معصوم کے وجود پر کبھی دلیل نہیں بنا کرتا۔
 بلکہ ایسی نقاشی جو دقیق حساب پر مبنی ہو اور معانی و علاج مفہوم پر مشتمل ہو اس کو ایک ماہر فنکار
 معصوم کے وجود کی دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

ایک دوسرے لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں جو لوگ مابعد الطبیعات کے عقیدہ کو اقتصادِ محض
 اوضاع کی پیدائش بناتے ہیں اور دین و اقتصاد میں ربط پیدا کرنے کیلئے جان توڑ کوشش کرتے ہیں

وہی لوگ کہتے ہیں: مذہب تو ہمیشہ سے استعارہ و استعارہ کا خادم تھا اور آج بھی ہے۔ اور مگر ان حضرات نے دین کو ایسا دیکھ لیا ہے تاکہ دین کی آڑ میں لوگوں کو ہمیشہ اپنا غلام بنائے رکھیں۔ اور اسی کے سہارے عوام کی ہر بغاوت کو پسپا کر دیں اور ان کی محنتوں کا ثمرہ خواص حاصل کریں اور عقیدہ کا سہارا ایسکران کی محرومیت پر ان کو قائل کر دیں۔ ویسے اس میں بھی شک نہیں ہے کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح مذہب بھی غلط فائدہ اٹھایا گیا اور جب بھی دین کو اس کے اصلی مقصد سے الگ کر کے غلط طریقہ سے استعمال کیا گیا تو نفع جو تاجروں کا تھیوار بن گیا اور انہوں نے شعوب و قبائل کو قیدی بنا لیا۔ لیکن اس قسم کے غلط استعمال کو فرصت طلبوں کے لئے دلیل و حجت ڈبنا دینا چاہئے تاکہ وہ دین و مذہب کے نام پر ہر چیز پر بے رحم حملہ کریں۔ بہر حال غلامہ مطلب یہ ہے کہ مذہب منحرف شدہ اور استعماری خود ساختہ مذہب کو اصلی دین و مذہب الگ کرنا چاہئے۔

یہ کہ بہت سے انسانی معاشرہ میں مذہب و ایمان کے ساتھ نامساعد اقتصادی حالات و ناخوشی وجود ہو سکی یہ ہماری دونوں کے درمیان طائر علیت نہیں ہے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ مذہب و ایمان کی ہمارے سے یہ نامساعد اقتصادی حالات اور ناخوشی وجود پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ بہت سے ایسے بھی انسانی معاشرے ہیں جہاں ہر لحاظ سے آرام و راحت و رفاه و رونق زندگی اور اقتصادی و نفع بھی بہت اچھی ہے اور وہ معاشرہ مذہب و ایمان سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور اسی طرح بہت سے انسانی معاشرے ہیں جو تمام ہونوں اور بہترین اقتصادی کے باوجود مذہب سے روگردان ہیں۔ اسی طرح بہت سے ایسے مقامات ہیں جو فقر و ناخوشی مبتلا ہیں اور دین کا آفتاب وہاں قوہ باہوا ہے اور ہمسے ایسی ہی صورت حال میں بعض ایسے مقامات ہیں جو فقر و ناخوشی مبتلا ہیں لیکن دین کا آفتاب وہاں دائرہ نصف النہار پر چمک رہا ہے۔ پس یہ ہم آہنگی کہیں مذہب پرست اقتصادی لحاظ سے اچھے اور کہیں برے ہیں۔ دیں تین ہے کہ تقارن زمانی علاقہ وقت و معلول کے تشبیہ کے ناکافی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک مخصوص وجہ اور بھی ہوتی چاہئے جس سے تہ چلے کہ ایک کا عدم وجود دوسرے کے عدم وجود کو متضاد ہے اسی قسم کے عدم انسجام و ناہم آہنگی کو ہم ایسے دو معاشروں میں باقاعدہ ملاحظہ کر سکتے ہیں جو استعمارگری کے تحت تسلط ہوئے کہ ایک محیط میں دین اصل زندگی سے خارج ہے اور دوسرے محیط میں اصل زندگی داخل ہے حالانکہ دونوں معاشرے ساوی و برابر ہیں۔

میں پھر عرض کرتا ہوں: دین و مذہب کے وابستگی مادی وسائل کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ مذہب سے دوری کا سبب وہ پرستی اور تجلات دنیا کی دلدادگی ہے جو لوگ خواہشات کے بندے اور دنیا پرست ہیں وہی لوگ مذہب کے دور اور متغیر ہیں۔

واقعات ہم کو اس نتیجہ تک پہنچاتے ہیں کہ انسان بخلاف اوضاع و احوال میں دین کی طرف متوجہ ہوتا ہے لہذا ہم کو ان اسباب عمل کی تلاش کرنی چاہئے جو گرویدگی مذہب کیلئے اصلی و روحی و ذاتی ہوں نہ کہ وضع اقتصادی کے پیکڑ میں پڑیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم آسانی مذاہب کے تعلق کو تلاش کریں تو اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہیں گے کہ پشتِ انبیاء کا ایک سبب اور لوگوں کی مذہب سے گرویدگی کی وجہ عدالت اقتصادی، تنہی اور دین کے من جملہ فوائد میں سے ایک ہی فائدہ ہے کہ انسان اقتصادی عدالت کو پالتا ہے۔

وجود کی گہرائیوں سے خدا کے جستجو کی آواز

پچھیدہ جسم انسانی کے ماوراء انسان کے کچھ وسیع ابعاد ہیں جو محدودیت بدن کے ساتھ محدود نہیں ہیں اور ان ابعاد جو عمارت بدن سے خارج ہیں۔ کے گوشوں کی معرفت کے نئے روحانی بنیادوں اور دروازوں کے راستہ سے تلاش و جستجو کرنی چاہئے تاکہ فیزکی نشاۃ کے ماوراء خواہر طبیعت و عوالم انسانیت کے وسیع آفاق تک رسائی ہو سکے۔

انسانی وجود میں ایک مخصوص اور اکات کا سلسلہ ہے جس کی جڑیں ذاتی ہیں اور وہ اور اک غیر فطرت و طبیعت سے نشوونما پاتا ہے اور اس قسم کے معلومات کی پیدائش کیلئے کوئی خارجی عامل موثر نہیں ہے۔ انسان طبعی علمی محیط اور اس کے ماحول میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اسی فطری معلومات کی بنیاد پر حقائق کا اور اک کر سکتا ہے لیکن علمی و فطری معلومات میں داخل ہونے کے بعد اس کے دماغ میں مختلف دلائل و براہین کے اکٹھا ہونے کے بعد بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی ان فطری و طبیعتی معلومات کو بھول جائے یا ان کے تردد میں مبتلا ہو جائے اور یہی وجہ کہ انسان جب تشخیص مفیدہ میں فطرت سے لگ ہو کر کام کرتا ہے تو وہیں سے اختلافات کا آغاز ہوتا ہے۔

مذہب و وابستگی اور خدا پر ایمان پہلے مرحلہ میں فطری اور اکات کا نتیجہ ہوتا ہے پھر عقل و فکر کے رد سے منزل رشد و تکامل تک پہنچتا ہے۔ انسانی طبیعت میں فطری احساسات کی جڑیں اتنی گہری ہیں اور اس گہرائی کے باوجود اتنی روشن ہیں کہ اگر انسان اپنی فکر و روح کو ہر قسم کے مذہبی تصورات اور مخالف دین انکار سے دھوڑے اور اپنی ذات و جہان ہستی کی طرف متوجہ ہو تو بخوبی اس بات کو محسوس کرے گا کہ کائنات کا قاعدہ ہمیشہ سے ایک عین ہدف کی طرف رواں دواں ہے اور اپنے ارادہ و خواہش کے بغیر نقطہ زندگی کا آغاز کیا ہے اور پھر اپنے ارادہ کے بغیر ایک نقطہ۔ اگرچہ اس کے لئے نقطہ ہمواری

— کی طرف دو حرکت ہے اور اس واقعیت کے وجود کو فطرت کے تمام موجودات میں ایک نظم اسلوب اور ترتیب نظم کے ساتھ شاید کیا جاسکتا ہے۔

ایک روشن فکر انسان جب اپنے گرد پیش کے ماحول کو دیکھتا ہے تو اس کو اچھی طرح یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک عظیم قدرت ہے جو اس کو اور تمام عالم کو محیط ہے جب وہ علم و قدرت و ارادہ کو اپنی ایسی ذات میں دیکھتا ہے جو اس عالم گیر کا ایک بہت ہی چھوٹا سا جزو ہے تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کائنات کے اندر علم و قدرت و ارادہ کا فرمانہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہی موجودہ نظام اور بنی بروقت حسابی حرکت انسان کو اس بات کے ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اس نظام کائنات کا ایک مدبر و حکیم ہے جو اپنے حکم سے اس کے موجودہ نظام کو چلا رہا ہے کیونکہ اس موجودہ نظام کی تعمیر مدبر و حکیم کے وجود کے علاوہ کی ہی نہیں جاسکتی جو شخص بھی سنجیدگی کے ساتھ اپنی توقعات کا اس دنیا میں اور اک کرے گا وہ اس بات کو سمجھ جائیگا کہ اس کائنات میں ایک ایسی معنوی قوت ہے جو اس کو پیدا کرتی ہے، عدم سے وجود میں لاتی ہے اور پھر اس کی اجازت یا حکمت کے بغیر اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

یہ حکم فطری ہے کیونکہ کسی بشر نے کسی زمان یا مکان میں یہ نہیں دیکھا کہ صانع کے بغیر کوئی مصنوع ہو جائے یا عامل کے بغیر کسی عمل کا وجود ہو جائے۔ علت و معلول کے باہم ربط کی جستجو ایک معنی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اور قانون علیت کو کسی سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے لہذا جس مذہبی جستجوئے حقائق بھی انسان نے قابلِ جدائی ہے۔ انتہایہ ہے کہ ابھی جس بچہ نے دنیا نہیں دیکھی ہے اگر اس کے کان میں کوئی آواز پونچے یا حرکت کا شاہد کرے تو فوراً فطری طور پر منبع آواز و منشا حرکت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

عملی زندگی کی بنیاد اور عملی مابانی بھی ہر معلول کے لئے علت کو لازمی قرار دیتے ہیں بلکہ قانون علیت ایک ایسا معمولی قانون ہے جو ایک مورد پر بھی استناد بردار نہیں ہے۔ تمام علوم خواہ وہ علم طبقات الارض یا فیزیا یا کیمیا ہو یا علم اجتماع و اقتصاد ہو ان سب میں علیت و معلولیت کا قانون نافذ ہے۔ اور اس سے بڑھتا ہے کہ تمام علوم و دانش عوامل و معلل کے کشف کا ذریعہ ہیں اور دنیا ہی سے تمام بشری پیشرفت و ترقیاں علماء کے تلاشِ معلل کا نتیجہ ہیں۔

اگر اس دنیا کے کسی گوش میں کسی بھی موجود کے اندر خود سازی مطلق و مطلقیت کا امکان ہوتا تو ہم کو یہ حق ہوتا کہ تمام موجودات میں وجود ذاتی کو قبول کر لیتے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ قانون حلیت و طہر عادی کی صورت میں ہمارے لئے واقع و ظاہر ہو کیونکہ علت کی اتنی زیادہ قسین ہیں کہ تحقیق و بررسی کرنا صرف ایک دہر میں تمام مخلوق کی تشخیص نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ تمام حوادث میں۔ اور یہ مسلم ہے کہ انسانی زندگی کے ماضی و مستقبل میں کسی بھی کلمی یا جزئی صورت میں۔ خواہ وہ فرد کی حالت یا معاشرہ کی۔ کسی ایسے نقطہ کا بھی وجود نہیں ہے جو اتفاقاً پیدا ہو گیا ہو۔

جب تمام تجرباتی علوم کا فیصلہ ہے کہ عناصر طبیعت میں سے کسی ایک عنصر کا وجود مستقل نہیں ہے۔ اور جب ہمارے تمام تجربات و احساسات و استنباطات بھی ایک ایسی تجربہ پر دھونے ہیں کہ طبیعت میں کوئی بھی سرفیصلہ و دلیل کے واقع نہیں ہوا اور تمام حوادث کچھ مخصوص نظام و قوانین کے تابع ہیں تو پھر کیا بات تعجب خیز نہیں ہے کہ کچھ لوگ تمام علمی و فطری و عقلی احکام کو پس پشت ڈال کر خالق کائنات کے وجود کے منکر ہیں :

دوسرے طریقے سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہی غریبہ جوانی جو کامل و متحول ہوئی ہے اور جو خود سے اس قدر باہر آگئی ہے کہ محسوسات کی دیواروں سے گزر کر مجہولات کو درک کر رہی ہے اور انسانی ضمیر سے پیدا ہونے والے ہر حکم و مسئلہ۔ بشرطیکہ وہ ایک مخصوص تربیتی و اعتقادی معاشرہ کے سسٹم سے متولد نہ ہو ہو۔ کا جواب دیتی ہے وہ یہی فطرت ہے۔ اور اہمات و عمومیات کے لحاظ سے اس فطرت میں اور دوسری انسانی فطرتوں۔ جیسے حب فات و حب وجود۔ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہذا یہی فطرت انسان کو وجود فانی کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن تربیت، ماحول و معاشرہ قسم کی چیزیں فطرت کے تقاضے کو پورا نہیں دیتی۔ چنانچہ والٹراڈ سکارلینڈ برگ (WALTRAUD SCARLEND BRG) جو فیئر یا فوجی کا بہت بڑا مشہور عالم ہے کہتا ہے : علمی مطالعات میں بعض علماء جو جو خدا کا احساس نہیں کرتے اس کی بہت سی وجوہ ہیں ان میں سے ایک علت مستقل سیاسی و اشاعہ و احوال یا معاشرتی نظام یا دولت و حکومت کے متغیبات ہیں جو انسان کو وجود پروردگار کے انکار

پر آمادہ کرتے ہیں۔

مبدعہ فطرت سے نمودار ہونے والی چیز نظام طبیعی کی مانند خوبصورت ہے اور جو لوگ اپنی پیدائش کے میسر اصلی میں آزاد رہے ہیں، عادتوں کے زندان میں مقید نہیں رہے ہیں اور نہ ان کی فطرت نے لغات و اصطلاحات کا رنگ پکڑا ہے وہ خمیر کی آواز کو بہت بہتر طریقہ سے سن لیتے ہیں اور اعمال میں نیک و بد اور عقائد میں حق و باطل کی اچھی طرح تمیز کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے افراد میں بیدینی اور فطرت سے انحراف بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی ان سے کہے کہ جہاں رنگ و بو اتفاق سے پیدا ہو گیا ہے۔ تو چاہے وہ اپنی ہڈی کو ہزاروں فلسفی اصطلاحات کے قالب میں ڈھالے پھر بھی ان کی باتیں ایسے افراد پر اثر انداز نہیں ہوتیں کیونکہ انہوں نے اپنی فطرت کے معیار سے تعادف کا یقینات کے نظریہ کو رد کر دیا ہے۔

البتہ جو لوگ علمی خود ساختہ فہم کی میں گرفتار ہیں وہ ان خوبصورت باتوں سے شک و تردید میں مبتلا ہوتا ہیں۔ محدود و غرور انگیز علوم ان رنگ پر نگاشت شیون کی طرح ہیں جو عقل و فطرت کے درمیان کے مائے لگا دیے گئے ہوں۔ اور یہ لوگ دنیا کو اپنے علوم و معارف و فنون کے رنگ میں دیکھتے ہیں اور یہ یقین کرتے ہیں کہ عقل و حواس اور محدود دیکھنے سے جو انہوں نے دیکھا ہے اس اصلی حقیقت وہی ہے اور اس کے ماوراء کچھ نہیں ہے۔ میری اس تجویز کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان تک سائنس و عقلی سے باز رہ جائے تاکہ وہ انحراف سے دوچار نہ ہونے پائے بلکہ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ انسان اپنی محدود دانش و فن پر مغرور نہ ہو جائے۔ بہت سے لوگ علم و دانش کو پائے عقل کی سیڑھی بنا کر اپنے بالاسطح ملک پہنچانے کے بغیر گرفتار نو ہو جاتے ہیں اور اصطلاحات و مفہومات کی چار دیواری میں اپنے کو زندانی بنا کر رہ لیتے ہیں۔

جب انسان خطر سے میں گھرماتا ہے تو یہی فطرت اس کی مدد کے لئے بڑھتی ہے۔ جب کبھی انسان خطرناک مشکلات اور خوفناک سختی میں گھرماتا ہے اور تمام مادی وسائل اس سے منہ موڑ رہے ہیں اور زندگی کے کسی امکان تک اسکی رہائی ناممکن ہو جاتی ہے اور تنگ کی طرح دیلئے حوادث میں غوطہ کھا رہا ہو تب اسے اسکی اور موت کے درمیان ایک قدم سے زیادہ کا فاصلہ نہیں رہ جاتا تو وہی بالطنی عامل بے اختیار ایک غیر مادی پناہ گاہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اسی ذات کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کی طاقت تمام طاقتوں سے بلند

ۛ اثبات دم و خدا ۛ

دبا لے اور وہ سمجھتی ہے کہ وہ ہر ان وجود ناما طاقتور ہے کہ اپنی غیر معمولی طاقت کے ذریعہ اس کو اپنی مٹا سکتا ہے اور اس کی دریافت کی وجہ سے وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ اس کی بارگاہِ اقدس سے طالبِ مدد ہوتا ہے اور دل کے گوش میں اس کی نجات دہائی دینے کی طاقت کا احساس کرتا ہے اور مدد یہ ہے کہ وہ خدوتِ مندِ باری و ماضی و کائنات و مادہ پرست حضرات جو اقدار کے نشہ میں قدرتِ الہی سے بے پرواہ و مستغنی ہوتے ہیں جب نکت و نابودی سے دوچار ہوتے ہیں تو مدد رسوں اور ماحول کی وہ تمام قیلم بجلا دیتے ہیں جس میں ان کو تباہ کیا گیا تھا کہ خدا ہم دخیال ہے وہ کچھ نہیں ہے اور دل و جان سے مبدد و سرشارِ توبائی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور تاریک کے صفات میں آج بھی ایسے لوگوں کے واقعات موجود ہیں جنہوں نے سختی و پریشانی کے عالم میں اپنی فطرت کے چہرے پر پڑا ہوا انقلابِ نوعی پھینکا ہے اور دل و جان سے خدا کے بے تہا کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

چنانچہ دیدرو EDRO فرانس کا ایک بہت بڑا مادہ پرست فلسفی ہے جو اپنی کتاب "اماتِ مادہ و مادیات" کے آخر میں چند ایسے دعاویہ فہرے لکھتا ہے جو خدا کے فطرت و خد و جان کے کس العمل ہیں، وہ کہتا ہے:-

"خدا یا! میں نے اپنے بیان کا آغاز اس طبیعت سے کیا ہے جس کو خدا پرست تیرا شاہکار مانتے ہیں اور میں اپنا بیان تجھ پر ختم کرتا ہوں کہ تیرا نام اہل زمین کے یہاں خدا ہے۔ پرو۔ دگار۔ میں سوچتا ہوں، تو ہے اور میرے خمیر و محالات سے واقف ہے۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ماضی میں تیرے حکم کے خلاف اور اپنی فعل کے خلاف کوئی کام کیا ہے تو اس سے نام و پیشمان ہوں گا۔ لیکن آئندہ کے لئے آسودہ ہوں کیونکہ جب میں اپنے گناہ کا اقرار کروں گا تو تو بخش دے گا۔ اس دنیا میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا، کیونکہ جو بھی ہو گا وہ یا تیرے حکم سے ہو گا یا قانونِ فطرت کی بنا پر ہو گا۔ لیکن اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا عالم ہے تو تجھ سے پاداش کی امید رکھتا ہوں اگرچہ اس دنیا میں جو کچھ بھی کیا ہے وہ اپنے لئے کیا ہے۔" (۱) خدا و آدم بشری (۲۰۰۵)

ان باطنی منابع کے علاوہ جو فطرت انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں اور جو واقعیات کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں تاکہ وہ مکمل آزادی کے ساتھ فطری اصول کے مطابق، مگر ان کوئی پروپیگنڈوں اور ذہنی اختراعات سے دور ہو کر اپنے لئے ایک راستہ منتخب کرے۔ ایک ہدایت و ارشاد کا عامل خارج از وجود بھی ہونا ضروری ہے جو عقل و فطرت کی تقویت اور رہنمائی کر سکے تاکہ کمرش طبعیتوں اور بے لگام افراط کی اصلاح کر سکے اور عقل و فطرت کو بھی انحراف سے باز رکھے اور خود ساختہ معبودوں کے سامنے سرنگوں ہونے سے روک سکے ایک ایسے خارجی آدمی و رہبر کا بھی ہونا ضروری ہے۔

اور یہ خارجی آدمی نبی و رسول کہلاتا ہے اور ان کو — یعنی انبیاء و رسول — بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ یہ انسان کو لطیف فطری اوصاف کی طرف متوجہ کریں اور خدا پرستی اور بندہ تعالیٰ کی طرف قیادت کریں۔ انبیاء کی ہدایت و ارشاد کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ان کی ارادہ کے خلاف شعلوں کو خاموش کر دیں یعنی اسکی قوت و تکرار انتخاب کی آزادی کو سلب کریں، نہیں اب ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ حضرت انسان کے ایمانی رجحان کے لئے ایک مدد و معاون ہیں اور جس کا مقصد صرف انسان کو قید و بند سے آزاد کرنا اور ان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے فطرت و سرشت سے استفادہ کر سکے۔

سب سے پہلے انبیاء کی دعوت قبول کرنے والے وہی لوگ تھے جو پاک دل اور روشن ضمیر تھے اور انبیاء کی مخالفت کرنا یا تو دولت مند اور فخر سوسہ روایات کے پابند حضرات تھے یا ایسے لوگ جو اپنی عقل، ناقص و ناچیز دانش پر مغرور تھے اور انکی باطنی نخوت و غرور ہمیشہ انسانی استعداد سے استفادہ سے مانع رہی۔

ایک دانشمند کہتا ہے :-

”عانون عزمی و طلب معنیات تک میں حاکم ہے کیونکہ اگر دین کی خواہش لوگوں کی فطرت میں موجود نہ ہوتی انبیاء کی تبلیغ بیکار رہتی حالانکہ انبیاء کی تبلیغ بے اثر نہیں رہی، بلکہ انکی دعوت پر لبیک کہنے والے حضرات کافی تعداد میں تھے اور یہی بہت بڑی دلیل ہے کہ لوگوں کے باطن اور ان فی ضمیر میں دین کی طلب موجود تھی۔“

انبیاء کی دعوت ہمیشہ نبی برتوید تھی ذکر انبات وجود خدا پر تھی۔ انبیاء پرستی، ستارہ پرستی، سورج پرستی و چاند پرستی اور وغیرہ اسی لئے روکا کرتے تھے تاکہ بشر کی فطری وحدہ و فیہ پیاس خارجی نقطہ مساوی — مثلاً بت پرستی و ستارہ پرستی وغیرہ — سے نکلے بلکہ ان کی دولت و تہذیب کا مقصد ہمہ کم کی کجروی و انحراف سے دور ہو کر خدا سے برتر و برحق کی طرف انسانی ذہن کو متوجہ کرنا تھا، اور انہ ہدف یہ تھا کہ لوگ کمال انسانی کے گردیدہ ہوں اور ایسے کامل ایمان کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے ہدف نہا کی تک پہنچ جائیں۔

پس یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شرک و بت پرستی اپنی تمام اقسام کے ساتھ خواہ ترقی یافتہ صورت میں ہو — مثلاً ماہ پرستی — یا غیر ترقی یافتہ صورت میں ہو مثلاً بت پرستی — سب فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ علوم کی ترقی بالخصوص دینی انحراف — جس کا آج کی دنیا میں ہر جگہ ظہور ہے — نے ایسے ایسے انکشافات کئے ہیں جن کی بنا پر ہم برسہا برس قیمتی نتائج اپنی موجودہ بحث کے لئے حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک طرف سے تاریخ ادیان نے علمائے مابعد شناسی و ہستان شناسی و مردم شناسی کے ذریعے ایسے ہی قدر مدارک اسناد دہیا کر لئے ہیں جو سابق کی تمام تفاسیر سے الگ تھلک نہیں اور دوسری طرف سے نفس ناموشناخت کی کاوشوں کے ذریعہ ہمیں کا آغاز ضرورتوں کے ذریعہ ہوا اور اڈلر اور یونگ کی کئی مسائل کے سبب انسان کے اعماق روح میں مخفی طاقتوں اور غیر عقلی اور پاک و معرفت کے ہمارے پہنچا اور پھر جن نے عوامل غیر عقلیہ اور ماورائے ارادہ — جیسے دینی احساس — کے لئے علمی تجسبات کا دائرہ کھول دیا۔

اور آج بھی ایک نگری بحث جاری ہے جس کے نتیجہ میں مختلف مکتب فکر کے کافی سے زیادہ مفکرین اس مسئلہ کے متعقد ہو چکے ہیں۔ یعنی اس بات کے قائل ہو چکے ہیں کہ دینی احساس بھی روح انسان کے ثابت و فطری و عناصر اولیہ میں سے ایک عنصر ہے۔ اور فطری اوداک بھی ماورائے عقل کے اوداک کی ایک قسم ہے۔

YOUNG & ADLER, HELMUT & FREUD, ANNA

حدود ۱۹۲۰ء سے یونانی فلسفی روڈلف کھٹ ات پر ثابت کر سکا ہے کہ حس دینی میں عناصر عقلیہ اخلاقیہ کے علاوہ کچھ قطری یا ماورائے عقل عناصر بھی موجود ہیں اور تمام انہی صفات مثلاً قدرت و قدس و اکبریت صرف مفہوم قدس کے افہام و تفہیم کے لئے ہیں کہ مفہوم قدس کی بازگشت کسی عقلی اور ادراک کی طرف نہیں ہے بلکہ مفہوم قدس ایک مستقل مقولہ ہے جو کہ بھی دوسرے مفہوم سے ناشی نہیں ہے اور نہ ہی کسی مفہوم عقلی یا غیر عقلی کے ساتھ اسے ایک شمار کیا جاسکتا ہے۔

اس زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے عالم طبیعت میں ایک بعدد رابع کا بنام زمان انکشاف کیا ہے جو دیگر ابعاد کی طرح جسم میں آغندہ ہے اور اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ دنیا کے اندر کوئی ایسا جسم موجود نہیں ہے جو اس زمان سے علی ہوا ہو جو حرکت و تحول سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح اس زمانہ کے علماء نے ایک بعدد رابع کے وجود کی تحقیق کی ہے جو انسانی روح میں احساس دینی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ باقی تینوں احساسات درج ذیل ہیں :-

① **حس جستجو و معرفت** : اولیہ باطنی شستگی وہی حس ہے جس نے اول روز سے فکر و بشر کو مسائل مجہولہ اور شناخت جہان ہستی اور اس کے گونا گوں نظام کی تحقیق و جستجو پر آمادہ کیا اور اسی تحقیق کے نتیجہ میں علوم و صنائع کا وجود ہوا ہے۔ اور تمام وہ نختیاں و زرخیز ہیں جو محققین و توسعین علوم اور سرطابیت سے پردہ اٹھانے والے علماء برداشت کرتے ہیں اس کا سرچشمہ یہی احساس ہے۔

② **حس نیکی** : جو انسان کے بلند روحانی صفات و فضائل کا مرجع ہے۔ ہر انسان جو اپنے وجدان کے گہرائیوں میں ایک ایسی کشش محسوس کرتا ہے جو اس کو عدل و نوع دوستی اور فداکاری کی طرف کھینچتی ہے وہ کشش پاکیزہ اخلاق کی طرف توجہ اور کثافت و غلاظت سے نفرت کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

③ **حس زیبائی** : نوع ہنر و ذوقیات کے ظہور و بجلی کا سبب یہی ہے اور اجتماعی حوادث کے ظہور میں اس کا گہرا اثر ہے۔

⑦ حسّ دینی : اسی احساس کی وجہ سے ہر شخص فطرتاً اور رائے طبیعت کی طرف ایک نشتر مبداء رکھتا ہے اور یہی مباحثہ علمائے کرام کے استدلال کا ماحول ہے۔ احساس مذہبی کے انکشاف کے ساتھ ہی روحانی ابلاغ و علامت کا احاطہ ٹوٹ گیا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ ان کے اندر تمام مذہبی تمامات ذاتی طور سے موجود ہیں بلکہ ان کا وجود اس وقت بھی تھا جب انسان جنگلوں اور پہاڑوں پر زندگی بسر کرتا تھا۔

مبداء وجود کی معرفت حاصل کرنے کے لئے متعدد طریقے ہیں۔ غیر عقلی (فطری) اور عقلی حاجات کا جواب گو خود خدا کا مہنوم ہے۔ اس طرح سے کہ نظم و آیات و علامات کے ذریعہ عقل وجود پروردگار کا قیام ممکن کرتی ہے اور فطرت غشی و فطری نیاز مندوں کے راستے سے خدا سے ارتباط پیدا کرتی ہے اور وہ ارتباط اتنا قوی ہوتا ہے کہ آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے لیکن بصارت ذریعہ نہیں بلکہ بصیرت کے ذریعہ۔ اگر دل کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کی جائے تو اس میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے۔

آج کا علم اگرچہ استدلال کرنے کے لئے تجربات کا سہارا لیتا ہے لیکن پھر بھی خدا کی توحید جو بحث و استدلال کا براہ راست نتیجہ ہے۔ خواہ استدلال عقلی و فلسفی ہو یا تجربات و حسیات کا نتیجہ ہو۔ وہ بہر حال استدلالی توحید ہے۔

ڈیکارٹ (DESCART) اور سنٹ تھامس ڈاکن (ST. THOMAS AQUINAS) جیسے علماء عقل و برہان اور فکر علمی کے جھروکے خدا کی معرفت کے واضح نتیجہ تک پہنچے ہیں اور یہاں فرانسیسی جیسے عرفاء شہود باطنی اور فطرت کے سہارے اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔ یا سکاں فرانسیسی کہتا ہے: "خدا پر ایمان لانے کے لئے انسانی دل کے پاس ایسے دلائل ہیں جہاں تک عقل کی رسائی ممکن نہیں ہے۔" انسان کا طرز فکر کچھ اس طرح ہے: "زیبا ترین و عقیق ترین احساس جو انسان کو حاصل ہو سکتا ہے وہ حس عرفانی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو تمام واقعی علوم کے بیچ ہمارے دلوں میں کاشت کرتا ہے اور جو شخص اس احساس کا شعور نہ رکھتا ہو اور نتیجہ و بہت نہ ہو سکتا ہو وہ مثل میت کے ہے۔"

(۶۷)

فیلم چینی عالم ٹیون ہاور دینی احساس کو انسان کے اندر انا گھر خیال کرتا ہے کہ اسی حس دینی کو ان کا تمام حیوانات سے فصل میں قرار دیتا ہے اور کہتا ہے :-
 ”انسان وہ حیوان ہے جو مشائخ فیہا کا معتقد ہو“

میں جب جو معرفت، جس نیکی جس زیبائی اپنی تمام احوالات واستقلال اور تاثیر جو اخلاق و ہنر اور علم کی پیدائش میں رکھتی ہیں، ان سب کے باوجود جس دینی ان تینوں سے مستجو جس نیکی جس زیبائی کی تحریک و فعالیت کے لئے زمین ہمارا کرتی ہے اور آمادہ کرتی ہے اور ان تینوں کی حمد و معاون ہوتی ہے عالم طبیعت کے کشف و کبر کے سلسلہ میں جس دینی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

مرد مومن کی نظریں دنیا نقشہ دقیق و حساب شدہ اور قوانین کی بنیاد پر پیدا کی گئی ہے اور خدا مدبر و حکیم پر ایمان کے زیر سایہ انسان کی جس جستجو حرکت کرتی ہے تاکہ علت معلول کے سلسلہ پر پیدا کی گئی دنیا میں طبیعت کے آثار و قوانین کے انکشاف کی راہ میں تلاش و کوشش کرے۔
 دین و دولت کہتا ہے :-

”ہر برٹ اسپنسر کا نظریہ ہے کہ کائنات حضرات ہی پہلے علماء ہیں جس طرح کہ وہ پہلے ادبا و بھی ہیں انکی رسد گاہوں کا مشاہدہ کر کے علم کا آغاز کرنے واسطے ہی لوگ ہیں جس کا مقصد دینی جنسوں کے اوقات کا وقت نظر کے ساتھ تعین کرنا تھا اور اس قسم کے معلومات و اطلاعات کو عابد میں محفوظ رکھا جاتا تھا اور یہ دینی و شرعی سنداً بدو نسل منتقل ہوتا رہتا تھا۔“

ان کے صفات عالیہ اور اسکی رشتہ عدالت اور تعدیل عزائم اور درخت اخلاق و فضیلت کے ٹمر اور بنائے ہیں جس دینی کا جو اچھے ہے وہ ناقابل انکار ہے۔ جو لوگ بھی دین کے راستہ پر چلتے ہیں وہ عزائم کے گنہگاروں اور بلند صفات سے راستگی کو ہم ترین دینی فریضہ خیال کہتے ہیں۔

دور تار پنج کے اندر جس زیبائی کی پرورش میں دینی تفکر کا بہت بڑا حصہ ہے۔

لہذا SHORAN NIGAR نے مشائخ فیہا میں شانہ صراحتاً دینے والے قوانین و احکامات
 سے یعنی باجمہر الطبیعات

کیونکہ قدیم انسان نے اپنے بزرگترین فنی تہا کو صرف اپنے خداؤں کے تعظیم کے لئے ایجاد کئے تھے چنانچہ عجیب و غریب عبادت خانے، مصر کے عظیم اہرام، میکسو کے خوبصورت مجسمے، مشرقِ اسلامی کے خوبصورت اور حیرت انگیز فنِ تعمیر، ساری چیزیں مس دینی ہی کے آثار ہیں۔

ماہرینِ نفسیات کا عقیدہ ہے۔ بلوغ اور جوشِ احساسِ دینی کے درمیان ایک علاقہ ہے اور زندگی کے اسی حصہ میں دینی مسائل کی طرف ان افراد کی بھی مخصوص توجہ ہوجاتی ہے جو اس وقت تک مسائلِ دینی کی طرف بے توجہ نہ تھے۔

اسٹانلی (STANLEY) کا نظریہ ہے کہ یہ مذہبی احساسات سولہ سال کی عمر میں پیدا ہوتے ہیں اور اس مومن کو جوان کی شخصیت کی وسعتوں میں سے ایک سمت حساب کیا جاسکتا ہے۔ یہی احساسات جوان کو "جو مختلف قوتوں کے تحت تاثیر ہے" اس بات کے مجاز بناتے ہیں کہ وہ اپنے وجود کی حلتِ غائی کو ذات پروردگارِ عالم میں تلاش کرے۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ فطرتِ انسانی کی آواز اسی وقت بجلی ہوتی ہے جب اس کے متقابل کوئی مانع نہ ہو لیکن اگر مخالفتِ تبلیغ موجود ہو تو وہ فطرت اور فکرِ صحیح کے فعالیت میں کمی کر دیتی ہے اگرچہ اس قسم کے موانع انسان کے طبعی رجحانات کو جڑ سے ختم نہیں کر پاتے اور یہی وجہ ہے کہ اگر سہ ماہی کو توڑ دیا جائے تو فطرتِ اصلی پھر سے اپنا کام شروع کر دیتی ہے اور خلاق درونی کی تلاش کے ساتھ اپنی تہلی کا آغاز کر دیتی ہے۔

تمام دنیا کے لوگ جانتے ہیں روس کے اندر کمونزم کو آئے ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت گزر گئی لیکن اس کے باوجود روس میں بہت بڑے طبقہ میں دینی احساس اب بھی موجود ہے اور زیادہ اراکانِ حکومت کی طرف سے اس طولانی مدت میں دین و مذہب کے مسائل کے لئے اتنی تلم تر توانائیوں کو صرف کر دینے کے باوجود لاکھوں انسانوں کے دل کی گہرائیوں سے دینی احساس کو خالی نہیں کیا جاسکا۔

نہ ہونے مثلاً نہ سہل چہ میدلم؟

اور اسی بنا پر ہم کہتے ہیں: دنیا کے اندر مسلسل مادی انکارِ عقیدہ خدا کے فطری ہونے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور یہ ناممکن ہے کہ کسی خاص مذہب کی راہِ فطرت سے دوری اور جدائی کو دیگر مکاتبِ فکر اور بالعدا الطبیعات کے قائل مدارس۔ خواہ آج کے ہوں یا پہلے کے۔ کے بقابلِ خدا شناسی کے فطری ہونے کو ناقض نہیں قرار دیا جاسکا کیونکہ ہر عام میں تخصیص پائی جاتی ہے اور ہر شے میں استثناء ہو سکتا۔ تاریخی نقطہ نظر سے مذہب مادی و فلسفی کی بنیاد قرآن ششم و ہفتم قبل مسیح میں پڑتی ہے اور اس عہد میں مذہب مادی کی حمایت کرنیوالے حضرات حسب ترتیب ذیل ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

① تالیس (TALES)۔ یہ یونان کا فلسفی ہے ۶۲۲ ق م میں پیدا ہوا اور ۵۶۰ ق م میں مر گیا۔

② ہراکلیٹس (HERACLITUS)۔ یہ ۵۳۵ ق م میں پیدا ہوا اور ۴۷۵ ق م میں فوت ہوا۔

③ ڈیموکریٹس (DEMOCRITUS) اس کا زمانہ ۵۴۰ ق م ہے۔

④ اپیکور (EPICHORE) اس کا زمانہ ۳۴۶ ق م ہے۔ لیکن ان سب کا مادی ہونا یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ مثلاً بعض علماء جیسے باطون اپنی کتاب تاریخ الفلاسفہ میں طالس کے لئے تحریر کرتا ہے: طالس کا عقیدہ تھا کہ مادی تغیرات، روحانی عوامل کے تحت تاثیر ہو کر رہتے ہیں اور ڈیموکریٹ کیلئے لکھا ہے: ڈیموکریٹ مادی نہیں تھا وہ وجودِ مادی کا قائل تھا البتہ اٹھارہویں صدی میں مادی مذہب کی ترقی شروع ہوئی اور سائمنس والون میں اس کے طرفدار پیدا ہونے لگے اگرچہ ان میں سے بھی بعض کے متعلق مختلف نظریے ہیں مثلاً جان جاگ روسو کے بارے میں بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ مادی مذہب کا قائل تھا اور دوسرے لوگ کہتے ہیں وہ خدا پرست تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی اس لئے کہا گیا ہو کہ چونکہ اس نے اپنی زندگی میں گرجاؤں اور ان کے پوپ حضرات کی بڑی شدت سے مخالفت کی تھی۔

ڈاکٹر محمد رفیع ودیدی اپنی مشہور کتاب انسائیکلو پیڈیا میں (دوسو) کے لئے تحریر کرتے ہیں کہ مبدیہ وجود کے بارے میں دوسو نے کہا ہے: فطری قوتوں کے انہوں جو حوادث پیدا ہوئے ہیں اور بعض کی تاثیر جو بعض میں ہوتی ہے اس کے بارے میں میں جتنی بھی فور و فکر کرتا ہوں قاعدہ الانتقال من تجربہ الی آخری سے میرے نزدیک یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ سبب اقل صاحب ارادہ و ادراک اور صاحب شعور ہے۔ اسی لئے میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ ارادہ خدا ہی نے وجود کو حرکت دیا اور مردوں کو زندہ کیا! لیکن تم کو یہ پوچھنے کا حق ہے کہ پھر وہ خدا آخر کہاں ہے؟ تو میں جواب دوں گا کہ جن آسمانوں کو اس نے متحرک بنایا اور جن ستاروں کو نور بخشا ان سب میں خدا موجود ہے اور خدا نہ صرف یہ کہ مجھ میں ہے بلکہ چرنے والی گولمغناطیس کے واسطے پرندے، زمین پر پڑے پتھر، درختوں کے وہ پتے جن سے ہوا اٹھکتی کرتی ہے ان میں بھی خدا ہے بلکہ خدا ہر جگہ ہے۔ لہذا وہ نظریات کہنے بعید از عقل ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ نظام بدیع ایک ایسی اندھی حرکت کا نتیجہ ہے جو اتفاقاً مادہ میں پیدا ہو گئی۔ ان لوگوں کا جو جی چاہے کہیں لیکن میری نظر میں جو مستمّر نظام موجودات میں ہے اس کا مطالعہ کروں اور اس میں جو حکمت و دلیلت لگائی ہے اس کا ادراک نہ کروں تو یہ محال ہے۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو یہ کہہ سکیں کہ مردہ مادہ زندہ موجودات کو پیدا کر سکتا ہے اور اندھی ضرورت عاقل کائنات پیدا کر سکتی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس خود ہی عقل نہ ہو وہ ایسی چیز پیدا کر سکے جو صاحب عقل ہو؟

خدا اور تجرباتی علوم کی منطق

یہ مسلم ہے کہ اوسلے اجتماعی اور تربیتی و تاریخی ماحول اور انسان کے نوعی مشاغل اپنے عاطفی اور روحانی ماحول اور فطری خواہشات میں بہتے تاثر نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ یہ گونا گوں مشرک انسانانی خواہشات میں ایجادِ جبر و ضرورت نہیں کرتے مگر پھر بھی اس کے لئے ایک سازگار فضا پیدا کر دیتے ہیں جو عملِ انسانی میں ایک قسّسِ ہمہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بلکہ کبھی انسان کی آزادی اور اختیار و انتخاب کے سامنے مانع بن کر خود نمائی کر رہتے ہیں۔

انسان کی دفاعی قوتیں جس کسی مخصوص موضوع پر زیادہ کام کرتی ہیں اسی مخصوص موضوع میں وہ زیادہ مہارت اور طاقت حاصل کرتی ہیں اور اس کے علاوہ دیگر مسائل اپنی اہمیت کو چھوٹے ہیں اور اس مخصوص موضوع کے علاوہ تمام مسائل غیر مسلّی ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر اس کے سارے قبیلے اسی نظر کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھئے کہ سب گمراہ کن طریقہ یہ رہا ہے کہ فکرِ انسانی کو صرف تجزیاتی علوم اور سائنس تک محدود کر دیا گیا اور خدا کی معرفت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اور چونکہ تجرباتی علوم کے متخصّص علماء نے اپنی ساری فکری قوتوں کو محسوسات تک محدود کر رکھا ہے لہذا غیر محسوسات ان کی فکر میں بیگانہ سے ہیں۔ اور غیر محسوسات سے یہ بیگانگی اور دوری اور تجرباتی علوم پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے کا نتیجہ ہوا کہ سسٹم کون دھیت میں ان کے نظریات کی بنیاد اور بنی تجویز اور صرف تجویز ہی ہو گیا۔ اور ان کی نظریں معرفت اور قبولِ صحیح تمایس کا معیار صرف تجربہ ہے اور وہ تمام مسائل کا حل اسی تجویز سے کرنا چاہتے ہیں۔ جن علوم کا وظیفہ حوادث و واقعات کے دریا رابط کا بیان ہے، ان کا سارا مقصد یہ ہے کہ خود واقعات کے درمیان رابط کو برقرار رکھیں کہ خدا اور واقعات کے درمیان تلاشِ رابط کریں اور انسان جب تجرباتی علوم کا مطالعہ کرتا ہے تو خدا کی طرف ذرہ بھر متوجہ نہیں ہوتا

اور ظاہر ہے محسوسات کے پیمانے سے مادائے طبیعت تھاقی کو نہیں پایا جاسکتا اور نہ ہی خدا کو تجربہ گاہوں اور بارگاہوں میں ہے پس یہ دیکھا جاسکتا ہے تجربہ گاہوں میں تجربہ کر کے علوم وجود خدا کے سلسلہ میں فیصلہ نہیں کر سکتے اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اگر خدا کا وجود کوئی چیز موقوفی تجربہ گاہوں اور محاسبات ریاضی سے اس کو دیکھا جاسکتا تھا۔

کوئی بھی تجربہ اپنے تجربہ میں یہ یقین نہیں دلا سکتا کہ موجود غیر مادی کا وجود ہے یا نہیں ہے؛ کیونکہ تجربہ سے صرف اسی چیز کو ثابت کیا جاسکتا ہے جس کی تجربہ سے نفی کی جاسکتی ہو۔ علم اور مینٹا فزیک ادکا لازماً بعد الطبیعات، معرفت کے دو طبقے ہیں اور ان میں سے ہر ایک شیعہ بالاستحکام والا مائل ہے۔ مینٹا فزیک کا ثبات تجربہ سے نہیں کیا جاسکتا لہذا تجربہ سے اس کی نفی بھی نہیں کی جاسکتی اور لاکھوں علمی تجربے ثابت کئے سے عاجز ہیں؛ ہر چیز مادی ہے۔ تجربہ گاہوں کے تمام ذرائع — اپنے پیچیدہ و مکمل یافتہ ہونے کے باوجود — عناصر غیر مغز کی دیئے تارک و واسطہ تک نہیں پہنچ سکتے اور ذرات لامتناہی کے دلوں میں مخفی تمام واقعات تک رسائی نہیں حاصل کر سکتے بلکہ سچی بات تو یہ ہے ابھی تک مادہ کی حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں کر سکے تو خالق مادہ کو کیا پہچانیے گے؟

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آفرینش انسان کے نظام دقیق پر ممکن آگاہی کے تجربہ یقیناً بہت مفید ہے۔ بلکہ اسلوب تجربہ کو نظام خلقت کے مطالعہ کے راستہ سے ایمان پروردگار کے لئے ایک واضح اور جدید اساس قرار دینا ممکن ہے۔ کیونکہ تجرباتی مسائل کے انکشاف کا نظام خود ایک ایسا مکمل اور دقیق نظام ہے جو خالق توانا و عظیم کے وجود کی حکایت کرتا ہے۔ مگر چونکہ اسرار عالم اور مسائل طبیعت کی تحقیق میں علمائے طبیعت کا مقصد کبھی معرفت خالق تک پہنچنا نہیں تھا۔ اس لئے وہ وجود خدا کے قائل نہیں ہوئے۔ انی محققین کے علوم کا مرکز صرف اسرار وجود کے کشف کرنے تک محدود رہا ہے اور یہ لوگ اپنے علم کے ایک محدود و تنگ دائرہ سے باہر نئے بغیر، اذلوہر طبیعت کے نظم و علاقہات کے راستہ سے معرفت کے مرحلہ ثانیہ تک پہنچنے کے لئے تواضع و تجاربے سے جن چیزوں تک رسائی ہوئی ہے اسکو جمع کرتے ہیں اور پھر عقل و فکر کے نمائندے اسکی تفسیر کرتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں یعنی ایک طرف جس اور پر سے حاصل شدہ خیالات کو جمع کرتے ہیں اور دوسری طرف عقل و فکر سے تجربہ نکالتے ہیں اس لئے متعدد مسئلے تک یعنی معرفت الہی تک نہیں پہنچ پاتے۔

یا دیکھنے علوم مختلفہ اور ان کے باہمی ارتباط و ملاقات کے مجبوء کو دیکھ کر خدا نے حکیم کے وجود کا اعتراف کئے بغیر صحیح تفسیر کی ہی نہیں جاسکتی۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ اپنے قواعد و تحقیقات کو خدا سے الگ مستقل سمجھتے ہیں اور اسی کو اپنے تمام امور کا محور بناتے ہیں لہذا دیگر مسائل سے بالکل بیگانہ و اجنبی ہو جاتے ہیں۔

اب چونکہ ان کی عملی زندگی ان علوم سے اتنی مرتبط ہو گئی ہے کہ ان میں جدائی ناممکن ہے۔ سائنس کے ایجادات نے ان کے تمام حیات مادی کے اطراف و جوانب کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان ان کشانات کے جو کچھ ہیں ان کا گھر کھایا ہے کہ وسائل زندگی میں وسائل فطرت و طبیعت کا تلاش کر لینا بہت ہی مشکل ہو چکا ہے اس نے فطری طور پر افراد انسانی کا ان علوم پر قہما و ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وجود خالق و غیبات کے بارے میں لوگ شک و تردید میں مبتلا ہو گئے ہیں اور جب منطقی علمی رائے تمام افکار کو اپنے قاب میں ڈھال کر پیش کرتی ہے تو لوگوں کے افکار بھی سند کون دیتا ہیں اسی طرز کے چلنے میں اور انچاہیہ ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہو جاتا ہے کہ کسی بھی امر واقعی کو اسی معرفت علمی کے ترانوہ پر توڑے بغیر قبول ہی نہیں کرتے۔ مختصر یہ ہے جو چیز دائرہ احساس و تجربہ سے خارج ہو اس کے ثابت کرنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں باوجود الطبیعات کا بہت بڑا ہر پولیٹیکل کانس ابرولڈ (PAUL CLARENCE A.)

کہتا ہے:-

”میں اپنے ابتدائی دور تعلیم میں علمی اسباب کا اتنا شینہ تھا کہ مجھے یقین تھا ایک ذہن ایک دن ہر چیز کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی اور ایک ذہن ایک دن فطرت کے اسرار سرستہ فاش ہو کر رہیں گے۔ لیکن میری تعلیم و میرا مطالعہ جتنا متنازع و متنازعہ ہوا اور اچھے سے دیکھ کر کچھ نہ کچھ اور دیکھو بات سے سیکر ان تک میں نے ہر چیز کا جب مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہونچا کہ ابھی تو بہت سی چیزیں چھوڑ رہی تھیں۔ علم میں اتنی صلاحیت تو ہے کہ وہ انجم کے جزئیات کی یا فطرت کے موجودات کی تشریح کر کے لیکن وہ روح، عقل، انسانی کی تعریف کرنے سے عاجز ہے۔ علماء اس بات کو جانتے ہیں کہ اشیاء کی کثرت و کیفیت کا مطالعہ کریں اور بیان کریں

لیکن جوہر اشیا کی علت اور خواص اشیا کی علت ان کے بس سے باہر ہے۔ علوم یا عقول بشری یہ نہیں بنا سکتے کہ اتم بہکشتان، روح یہ چیزیں کہاں سے آئی ہیں؟ علوم صرف ابتدائے آفرینش عالم کے سلسلہ میں اپنے مفروضات بیان کر سکتے ہیں کہ یہ سارے، یا اتم، یا بہکشتان مادہ اولی کے پھٹ جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں لیکن یہ نہیں بنا سکتے کہ وہ اولیہ، اور اس کے پھٹ جانے کی طاقت کہاں سے آئی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے صاحب عقل، خالق کے وجود کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

یہ تجربہ کار عالم چونکہ دانشمندانوں کے انکار سے انجمنی ہے اس زندگی میں تمام ان چیزوں کو قبول کرتا ہے جو منطقی علمی کے مطابق ہو اور جو چیزیں اسلوب علمی کے مطابق نہ ہوں ان کا منکر ہے۔ اسلوب علمی سے مراد یہ ہے کہ وہ صرف تجربہ پر مبنی ہو اور اس کو دلیل بنا تا ہے ہر استدلال کی صحت کا دار مدار اس کے نزدیک صرف مطابق تجربہ ہوتا ہے۔

ایسا تجربہ کار عالم کہ جسکی مذہبی فکر کی بنیاد مولود و فطرت ہو، خصوصاً وہ دینی و فرائضی مسائل و احکام جو امر و نہی کی صورت میں موجود ہیں اور اس کے پاس بظاہر اپنے علمی مباحث میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں ہے جو اسکی تفسیر کر سکے یعنی جس سے وہ عالم ان احکام و مسائل کو سمجھ سکے۔ حالانکہ وہ علمی زبان اور فارمولوں کے عادی ہونے کے سبب علمی اسلوب کا پابند ہے لیکن اس کے سامنے سادہ اور سب سے تکلف تمام مذہبی احکام و مسائل یقیناً نظر نہ کر غلط ہے۔ یہی معلوم کیا ان کے فارمولے پیچیدہ اور دقیق نہیں ہیں؟ اور کیا ان کے سیکھنے والے کے لئے ان دقیق و خشک مسائل میں غور و فکر کرنا ضروری نہیں ہے؟ یقیناً یہ فارمولے بہت مشکل و دقیق ہیں لیکن اس فن کے علماء جب اسکو علمی زندگی میں پیش کرتے ہیں تو ان مشکل قواعد سے انکار کر اور علمی اصطلاحوں سے الگ کر کے اس کو آسان طریقہ سے پیش کرتے ہیں ورنہ یہ علماء اپنے علمی و صنعتی مراکز میں اور کتب خانوں میں محصور و ہرباتے۔

چنانچہ تمام لوگ ٹیلیفون، ریڈیو سے فائدہ اٹھاتے ہیں یہی صورت دیگر تمام علمی وسائل کی بھی ہے

۱۰ اثبات وجود خدا ص ۱۱

اپنے تمام پیچیدگی و قوتوں کے باوجود ماہرین کی معمولی سی ٹریننگ کے بعد تمام لوگ اس سے فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ اور جو لوگ ان علمی وسائل کو خریدتے ہیں ماہرین ان کو فنی اور تکنیکی معلومات نہیں بتاتے بلکہ صرف ایجاب و کرہیوں کی تمام زمتموں اور پریشانیوں کے بدلے چند جملے کہتے ہیں جس سے خریدار اس کو اپنے استعمال میں لانے کا طریقہ سمجھ لے۔

بنابرین اگر ہم ان مذہبی دستوروں کو جو علمی فارمولوں کی زبان میں نہیں ہیں بلکہ سادہ و عمومی ہیں؟ غیر صحیح و باقی ذہنی اور تصورات کے قالب میں فرض کر کے ان کی اہمیت و ارزش سے انکار کر دیں اور اپنی زندگی میں ان کے حقیقی آثار سے غافل رہیں تو یہ بات انصاف سے اور منطق علم سے بہت بعید ہے۔

یاد رکھئے علمی احکام ہی وقت مفید ہوتے ہیں جب عمومی زبان میں پیش کئے جائیں اور فرد و اجتماع کی زندگی میں سب ہی کے لئے قابل فہم ہوں۔ اس کے علاوہ اگر دینی احکام ہمارے دائرہ اختیار میں ہوں تو پھر کسی نبی یا دین کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بلکہ ہم خود ہی ان کو وضع کر لیا کریں گے۔

اموالا انسان اپنے مقدمات کے سامنے غیر مقدمات سے چشم پوشی کر لیتا ہے اسی طرح علم طبعیت اور اس کے علم علوم تجربیہ میں اپنی معلومات پر غور ہو گئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ انھوں نے عالم حقائق کو مسخر کر لیا ہے۔ حالانکہ کسی زمانہ میں کسی کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ دعویٰ کر سکے کہ اس نے تمام اسرار عالم کا احاطہ کر لیا ہے اور عالم طبعیت کے چہرے سے تمام عجائبات اٹھا دیے ہیں۔

واقعات کو زیادہ وسیع النظری کے ساتھ دیکھنا چاہئے اور اوقیانوس جمہولات کے مقابلہ میں اپنے علم کو ایک ناچیز قطرہ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ایک علمی انکشاف کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ابھی تو ہمارے سامنے جمہولات کا ایک ٹھاٹھیں مارنا ہوا سمندر ہے۔ ہزاروں سال پہلے ہی ہونے والی تاریخ میں انسان نے اپنی نہ بھلنے والی تمام قوتوں اور امکانات کو بروئے کار لا کر کائنات کی بیکراں وسعتوں میں جتنی بھی زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل کی ہے وہ کائنات کے اسرار کثروں سے صرف چند رموز و اشارے ہی ہیں اور اس سرزمین حقیقی میں انسان نے صرف چند مختصر قدم اٹھائے ہیں اور ابھی تو جمہولات کے پہاڑ ہیں جنھوں نے عقل انسانی کو گھیرے میں لئے ہیں۔

پروفیسر وہ دیر کہتے ہیں :-

”تمام وہ اکثافات جو فکر بشری کے لئے ناممکن تصور اور خارق عادت تھے وہ دامن ٹیکنالوجی کے وسعت کی وجہ سے ایک ایسی مدت میں جو دو سو سال سے زیادہ نہیں ہے حاصل ہوئے ہیں اور اجسام و موجودات کی عمروں کے حساب سے یہ دو سو سال کی مدت ایک لمحہ کے برابر بھی نہ ہوگی۔ لہذا کسی انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اختراعات بشریہ کی اس قلیل مدت میں دعویٰ کر سکے کہ وہ اسرار فطرت تک پہنچ گیا ہے یا ان کو استخراج کر لیا ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اکثافات بشری — جو دن بدن زیادہ ہو جا رہے ہیں — پر حکم لگانے کے لئے ہم کو اس سے زیادہ مہر کرنا چاہئے کم از کم ٹیکنالوجی کی عمر ایک ہزار سال گزر جائے جب تک کوئی حکم لگایا جاسکتا ہے۔ دیے یہ ہزار سال بھی کائنات کے لحاظ سے ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہے۔“

انسٹائن کی گفتگو ہمارے مقصد کی موید ہے جیسا کہ علمی بے بنیاد جہان ہستی کے بے انتہا اسرار کے مقابل میں نہ ہونے کے برابر ہے چنانچہ وہ کہتا ہے :-

کائنات کی جو تصویر علم کے لحاظ سے بنائی گئی ہے۔ وہ ایک تمام تصویر ہے کیونکہ دستگاہ اور ادراک بشر کے ضعف کی وجہ سے حلاقیقت تک رسائی ناممکن ہے۔ اور دنیائے فزیک کی ناقص تصویر پر انکار کرنا کوئی ایسا امر نہیں ہے جو جہاں سے مربوط ہو بلکہ زیادہ تر ہم سے وابستہ ہے۔“

اس لئے مبدائی علمی رشتہ انسانی علوم حسی اور منطقہ فعالیت اور اس کے نفع و فائدے کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے اور حقیقت تک پہنچنے کے لئے ہر قسم کے سوابق ذہنی اور موانع سے دور ہو کر صحیح فکر کے ساتھ تجزیہ و تحلیل کیا جائے۔

۱۔ دہنزدانشدہ جب جوئے خدائے بزرگ ص ۴۴

۲۔ انسٹائن کے علمی مقامات ص ۴۴

بے شک معلوم تجربہ نگار ہر کے علاوہ اور کوئی خبر نہیں دے سکتے اور ان علوم کے تحقیقات کا دائرہ مجموعہ میں صرف مادہ اور مادیات تک محدود ہے۔ اور چونکہ تجرباتی علوم کا مقصد جہانِ خارج کی تحقیق ہے کہ ہم مطمئن ہو سکیں کہ تخصیصی درستی یا نادرستی؟ اس کو جہانِ خارج سے بطریق دیگر مقام امتحان میں پیش کرتے ہیں۔ اگر جہانِ خارج نے علم اس کی تائید کی تو قبول کرتے ہیں ورنہ قبول نہیں کرتے۔ لہذا اب علوم تجربہ کے موضوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال کرنا چاہئے کیا حقائق مادہ کے طبیعت بطریق حسن و آزمائش قابلِ تجربہ ہیں؟ اور کونسی تجرباتی تحقیق کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ ایمان و عقیدہ میں مداخلت کرے؟

دانش مادی ایک ایسا چراغ منور ہے جو اپنی شعاعوں سے بعض جمہولات کو روشن کر دے لیکن ایسا چراغ ہرگز نہیں ہے جو ہر قسم کی تاریکی کو دور کرنے میں مفید ہو۔ کیونکہ ہر قسم کا بچا جانا اس کے مجموعہ پر محیط ہونے سے تعلق رکھتا ہے اور اس معرفت سے تعلق رکھتا ہے جو تمام اجزائے شناخت کو اس کے طرف میں قرار دے سکے اور بیش کی تک منجر ہو سکے لیکن علومِ حسی کے تنگ و محدود حصار کے اندر معرفت بشری کو قید ہی بنا دینا انسان کو بیش کی تک نہیں پہونچا سکتا بلکہ یہ ایک نمودائے تجربی میں توقف ہے اور باطن ہستی کے جریاناتِ غیب سے بے خبری ہے۔

خدا پر ایمان رکھنا یا نہ رکھنا معلوم تجربہ کے موضوع میں داخل نہیں ہے کیونکہ جب ان علوم کو موضوع بحث مادہ ہے تو اگر امر غیر مادی ہوگا تو یہ معلوم ثابتاً یا نفیاً اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتے کیونکہ دین کے نزدیک خدا تو جسم مادی ہے اور نہ حواس ظاہر سے اس کا ادراک ہو سکتا ہے اور نہ زبانِ امکان اس کا احاطہ کر سکتا ہے بلکہ وہ ایک ایسا موجود ہے جس کا وجود احوال و اوضاع سے مترتب نہیں ہے وہ ان اوضاع و احوال کا عالم ہے اور ان سے مستغنی ہے وہ کمال کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہے اور انسانی تصور کے حیطہ امکان سے باہر ہے اس کی حقیقت و کذابات کا ادراک نہ کر سکن ہماری قوت و طاقت کی تقصیر کی بنا پر ہے اور ہمارے امکان و استعداد سے ماوراء ہے۔

اسی دلیل سے ہم اگر تمام تجرباتی علوم کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو کوئی معمولی سامورہ بھی نہیں لگا

جس میں خدا سے متعلق تجربوں کا ذکر کیا گیا ہو۔ یا خدا کے سلسلہ میں کوئی حکم لگایا گیا ہو۔ بلکہ اگر ہم وسیع دائرہ واقعات میں صرف جو اس کو ان میں جب بھی ہم اپنے عموماً سے خارج کے بارے میں فنی کا حکم نہیں لگاتے کیونکہ یہ خود غیر تجربی دعویٰ ہے اور کسی میں تجربی کی طرف مستند نہیں ہے۔

فرض کیجئے قانون توحید اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہ بھی پیش کر سکیں تب بھی اس خدا کے عدم وجود کا حکم لگانا جو مادہ و محسوسات، ایک غیر علمی مختار ہے بلکہ محض خیال و دھبہ ہے اور اس طرح کا انکار بے بنیاد بات ہے جو علم و فلسفہ کے شان کے خلاف ہے بلکہ منطقی تجربہ کے بھی منافی ہے۔ جارج پولیستر (GEORGE POLISTER) اپنی کتاب - اصول مقدماتی فلسفہ - میں کہتا ہے:

ایک ایسی چیز کا تصور جو زمان و مکان سے مستثنیٰ ہو اور تغیر و تحول سے مستثنیٰ ہونا ممکن ہے۔ ان کلمات میں ایک ایسی فکر کا وجود ہے جس کے بارے میں نہیں معلوم کیا جاتا ہے؟ اور کس چیز کی تلاش ہے؟ اگر اسے معلوم ہو کہ کس چیز کی تلاش ہے تو اس کو یہ معلوم کرنا چاہئے کہ کس طرح تلاش کیا جائے کیونکہ پولیستر کا مرکز تحقیق صرف طبیعت اور محسوسات ہیں لہذا جو چیز اس کے علمی میدان سے دور ہے اور تجربہ حسی کے لحاظ سے اس کا وجود قابل ثبات نہ ہو وہ اس کو بحال ہی سمجھے اور اس کے عقیدہ کو اسلوب فکری علمی کے منافی سمجھے گا۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جب معلوم ہے کہ عالم مادہ - اپنے تمام اسرار و رموز کے ساتھ صرف اسی کرہ میں محدود نہیں ہے جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اور خصوصاً جب کہ اسی کرہ کے مہولات بشریہ بے شمار ہیں جو عالم طبعی کا مرکز نظر ہے تو پھر علمائے طبیعت کو اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ مادہ رائے طبیعت ہمارے وسائل علمی سے خارج ہے لہذا ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے صرف سکوت اختیار کرتے ہیں نہ یہ کہ اس کا انکار کرنے لگیں کیونکہ ان کے لئے یہ کیونکر جائز ہے کہ تمام نظام ہستی کے وسعت کے ماننے کے مدعی ہوں جبکہ ان کا علم کائنات کے مقابلہ میں مغرب ہے۔

بھلا کون سی دلیل ہے جس کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ وجود صرف مادی مادہ ہے؟ اور کائنات وجود کا انحصار صرف مادیات میں محدود ہے؟ اور مادہ رائے طبیعت کا منکر کون سا عالم

ہے جس نے آج تک اپنے انکار کی بنیاد کی ٹلی اس میں یا منطقی دلیل پر رکھی ہو؛ اور کوئی دلیل یا برہان اس بات پر قائم ہے کہ حدود جس تجربہ سے جو چیز خارج ہے وہ عدم میں ہے؟ علم اگرچہ بطور قطع و صریح ان تمام جہولات کا مضمّن اس نے منکر نہیں ہے کہ ان تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ اس انتظار میں ہے کہ شاید کسی دن اس کا انکشاف ہو جائے اس کے باوجود اسی حضرت اللہ کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کرتے حدیث ہے کہ بطور شک و تردید بھی اس مسئلہ میں بحث کے بغیر جلد بازی اور بر خود غلط انداز سے بطور قطع و صریح خالق کائنات کا انکار کر دیتے ہیں۔

یہ لوگ مخصوص چیزوں کے لئے کچھ تعیّاس و معیار قرار دیتے ہیں اور اسی تعیّاس کو دوسری چیز کے بارے میں قبول نہیں کرتے مگر معیار سطح کو مخصوص فی مجموعہ کی معرفت میں استعمال کرنے کو ناجائز کہتے ہیں۔ لیکن یہی حضرت جب عالم معنی میں پہنچتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ خدا، روح، وحی کو اسی مادی تعیّاس و سؤل سے سمجھا جائے اور جب ان امور کو ان تعیّاس سے نہیں سمجھ پاتے اور عاجز ہو جاتے ہیں تو فوراً انکار کر بیٹھتے ہیں۔

اگر منطقی تجربہ میں محصور انسان عالم وجود کے صرف انہیں چیزوں کے وجود کا قائل ہے جو تجارب محسوس سے ثابت ہیں اور ان کے علاوہ تمام چیزوں کا منکر ہے تو اس کو جان لینا چاہئے کہ یہ ایک ایسا راستہ اس نے انتخاب کیا ہے جو تجرباتی علوم کے آزمائش و تحقیقات کا حاصل نہیں ہے بلکہ اس قسم کی روشن فکری عینان فکری کی ایک قسم اور حار و طبیعت و فطرت سے خروج ہے۔ اور علماء الہی کے نزدیک جس خدا کو یہ علماء طبیعت اپنے علمی وسائل اور طبعی اسباب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ خدا ہی نہیں ہے۔ اور مادی علوم اس معینہ تک پہنچنے سے عاجز ہیں۔

فیزیا لوجی کا مشہور عالم ڈاکٹر آیوی کہتا ہے :-

منطقی وجود خدا کو تو ثابت کر سکتی ہے مگر نفی وجود خدا سے عاجز ہے۔ ہو سکتا ہے

بعض لوگ وجود خدا کے منکر ہوں میسا کہ ماضی میں بھی رہے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے دعویٰ پر معقول دلیل نہیں پیش کر سکا۔ اگر کسی کے پاس کسی چیز کے وجود

کے انکار پر دلیل عقلی ہو یا کسی چیز کے وجود کے مشکوک ہونے پر دلیل عقلی ہو تو وہ انکار کر سکتا ہے لیکن میں نے ابھی تک اپنے مطالعوں میں کسی کو نہیں دیکھا جو انکار وجود خدا پر معقول دلیل رکھتا ہو۔ اس کے برخلاف وجود خدا پر بے شمار اور معقول ادلہ دیئے ہیں۔

۱۔ اثبات وجود خدا ﷻ

موجودنا دیدہ کا عقیدہ صرف خدا ہی میں منحصر نہیں ہے!

جس خدا نے واحد دیکھنا کی طرف انبیاء و رسولوں نے ہم کو دعوت دی ہے کہ اس کی معرفت حاصل کریں اور عبادت کریں۔ اس کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ماحولوں مطلق ہے۔ ازلی وابدی ہے ہر جگہ موجود ہے اور کہیں نہیں ہے۔ عالم طبیعت کے تمام محسوسات میں اس کے مظاہر متجزیہ جسم ہو کر موجود ہیں۔ عالم وجود کے ہر نقطہ میں اس کا اسادہ ظاہر و باطنی ہے اور اس قوت اور ذات عالم کے لئے تمام خواہر طبیعت آئینہ ہیں وہ صرف غیر مرئی ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے محاسن اس کے اور اک سے عاجز ہیں کیونکہ جو چیز بھی ہمارے ذہن میں آئے گی وہ محدودیت کے چوکھٹے کے اندر ہی ہوگی مگر خدا مطلق و غیر محدود ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ایسا موجود جس کو انسانی حواس درک کر سکیں! ہمیں ادراک کی نشانی و رنگ روپ نہ ہو جہاں مشاہدات و تجربات میں آنا نہ ہو! ان کا تصور ہمارے بہت دشوار ہے اور ان کی جیسی چیز کو ہمیں نہیں کرنا تو فوراً اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ جو لوگ وجود خدا کے مسئلہ کو اپنے محم و د فکری چوکھٹے میں اور ادنیٰ تک نظر ہی میں مل کرنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں: نابدیدہ موجود کا عقیدہ کیونکر ممکن ہے! مگر وہ اس حقیقت سے باخبر مبالغہ ہیں یا پھر اس سے تغافل کرتے ہیں کہ انسان اپنے طبعی حواس سے یہ جانتے ہوئے کہ یہ حواس محدود ہیں — صرف اس حیثیت دنیا کے ظاہر کا تو ادراک کر سکتا ہے لیکن وجود کے تمام ابعاد کی معرفت پر قادر نہیں ہے اور نہ یہ اپنے حسی آلات کے سہارے ظاہر کے ماوراء ایک قدم آگے بڑھ سکتا ہے، جس طرح خود علوم تجربہ میں اتنی صلاحیت تو ہے کہ افکار انسانی کو محدود طبیعت تک پہنچا دے لیکن ماورائے طبیعت تک نہیں پہنچا سکتا۔

اگر انسانی علوم و وسائل و معاہدے کی ذیل کو کسی چیز کے ادراک پر قادر نہیں ہے تو جب تک اس کے ہستیا اور ارتقاء پر دلیل نام نہ ہوئے عرفی بنیادیں اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہمارے مادی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ لیکن ہم تو رتے توئی نہیں کہ انشائیہ ان مجرور ظواہر کے کرتے ہیں جن کی تفسیر وہی قانون نہیں کرتا ہے۔

اور اگر حقائق علمی کائنات احاس مستقیم کے بغیر ناممکن ہو تو بہت سے علمی حقائق کا ثبوت اور ان کا علمی ہونا بھی خارج ہو جائیگا۔ کیونکہ ان میں سے بھی بہت سے حقائق حس و تجربہ کے اندر نہیں آتے۔

کوئی بھی عقل مند اپنی روزمرہ کی زندگی میں واقعات مادیہ کا انکار اس بنیاد پر نہیں کر سکتا کہ وہ دکھائی نہیں دیتے اور محسوس نہیں ہوتے اور نہ ہر اس مادی چیز کا انکار کر دیتا ہے جو اس کے احاس کے دائرہ میں نہ آئے تو پھر اس غیر مادی چیز کا انکار کیونکر جائز ہے؟ جو مادے اور اک ہے۔

علمی تجربات کے اندر بھی یہ بات مسلم ہے کہ اگر معلول خاص کی علت ہم کو نہ ملے تو ہم فوراً قانون علیت کو باطل نہیں کہہ دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس کی علت نہیں معلوم ہو سکی؛ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے قانون علمی تجربات کی بنا پر مستقل ہے صرف تجربہ میں نہ آسکنے کی وجہ سے نفی علیت نہیں کی جاسکتی۔

اچھا کیا جن چیزوں کو ہم قبول کرتے ہیں اور ان کے وجود پر عقیدہ رکھتے ہیں سب ہی کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ کیا اسی مادی دنیا میں ہم ہر چیز کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں صرف خدا ہی نہ دیکھتے ہیں آسمان اور زمین محسوس ہوتا ہے؟ جی ہاں! ایسا کہہ کر نہیں ہے تمام مادی علم کا اتفاق ہے کہ ہمارے بہت سے ایسے معلومات ان حقائق و قضایا میں داخل ہیں جو نہ محسوس ہوتے ہیں اور نہ اس سے پہلے ہم مانوس تھے۔ کائنات کے اندر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو اب دیدہ ہیں۔ خصوصاً اس عطر فر میں تو کاروان علم نے ایسے بہت سے حقائق کا انکشاف کیا ہے اور سب سے بڑا مسئلہ جو اس زمانہ میں علماء مادی نے حل کیا ہے وہ تبدل المادة بالطاقۃ کا مسئلہ ہے۔

اسی دنیا کے بھی موجودات اور اجرام جو قابل رویت ہیں جس وقت یہ جا ہیں کہ اپنی طاقت کو باقی رکھیں تو اپنی پہلی صورت کو بدل کر طاقت کی طرف بدل جائیں۔ لیکن کیا یہ طاقت جس کی بنیاد پر بہت سے مادی انفعالات کا دار و مدار ہے یہ قابل رویت ہے؟ یا قابل لمس ہے؟

ہم اتنا تو جانتے ہیں کہ یہ طاقت ایک ایسا منبع ہے جو دارائے قدرت ہے لیکن اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا راز ہے جو ابھی تک مخفی ہے۔ انسان کے بعض علمی نتائج استدلال و برهان کے مرمر بن چکے ہیں ان کا شہدہ نہیں ہوتا ہے۔ بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذرات کی معرفت ان استنتاجات کی وجہ سے

ہوتی ہے جن کا دار مدار مشاہدہ و تجربہ پر ہے۔ ایٹم کے فزک کی ذروں کے اتفاق کی حقیقت کا سمجھنا صرف دلیل ہی پر موقوف ہے۔ اگر یہ آٹا مظاہر نہ ہوتے تو انسان ایٹمی واقعات و حوادث کے اندرونی حالات سے ہمیشہ جاہل ہی رہتا۔

”ہی بجلی جو آج ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے اور جس کے بغیر انسانی تمدن دم توڑ دے گی کئی فیصدی نے تجربہ گاہ کے اندر اس کو دیکھا ہے یا ایسکرائٹنگ کپڑائی آلات کے استعمال کرنا اور اسے اسکو چھو کر دیکھا ہے کہ یہ نرم ہے یا سخت؟ یا اس کی آواز کو سنتا ہے؟ یا اس کے مزو کو چکھا ہے؟ بلکہ بجلی کے تار میں دوڑتی ہوئی بجلی کو کبھی نے نہیں دیکھا بلکہ صرف آلات و تجربات سے پتہ لگا یا جاتا ہے کہ اس تار میں بجلی ہے یا نہیں ہے؟۔۔۔ لیکن نہ دیکھنے کے باوجود بجلی کا کوئی منکر نہیں ہے۔

جدید فیزکس کا کہنا ہے، جن چیزوں کو ہم محسوس کرتے ہیں وہ سخت و جامد ہیں آنکھوں سے ان میں کوئی حرکت نہیں دکھائی دیتی۔ لیکن اس کے باوجود ہم کو ہم دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں وہ ایسے ذرات کا مجموعہ ہے جو نہ سخت ہیں نہ جامد نہ ثابت ہیں بلکہ ساری چیزیں یہ خوب و تغیر و حرکت میں ہیں، اور ہماری آنکھوں سے اور ہمارے حس سے جو یہ ثابت و غیر متحرک دکھائی دیتی ہیں، نہ تو ان میں کسی قسم کی ثابت و پائیداری ہے اور نہ سکون و آرام ہے۔ بلکہ ان کے روگردیسر و حرکت و دوران کا اعلاطہ کئے ہوئے ہیں جن کو ہم براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔

جو ہوا ہمارے وجود کا اعلاطہ کئے ہوئے ہے۔ کافی وزن اور ثقل ہے اور بدن ہمیشہ اس کے نیچے دبا رہتا ہے۔ تقریباً ہر انسان سولہ ہزار کیلو گرام ہوا کو برداشت کرتا ہے اور اگر کبھی بدن کے اندر دباؤ کی وجہ سے اس وزن میں کمی آجائے تو ہم کو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ اب یہ ہوا ایک ثابت شدہ علمی حقیقت ہے جس کو گیلیلو (GALILEO) اور پاسکال (PASCAL) سے پہلے کوئی جانتا بھی نہیں تھا اور اس کے باوجود ہمارے حواس اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ پس ہوا بھی ایسا موجود ہے جو دکھائی دیتی ہے۔

نہ ایمین العابدین نے صیغہ سجاد یہی اس کی تشریح فرمائی ہے: اے خدا تو پاک و منزہ ہے تو سامان کے

بلکہ محی تجربات اور عقلی استدلال کی بنیاد پر علماء جن مفاتح کی نسبت موافق طبیعت کی طرف دیتے ہیں وہ بھی براہ راست ہمارے لئے قابلِ دیکھ نہیں ہے مثلاً ریڈیو کی موجیں ہر جگہ ہیں اور کسی جگہ نہیں ہیں، باہمی قوتِ مبادیہ سے کوئی مگر عالمی نہیں ہے۔ بغیر اس کے کہ اس مادہ سے کچھ کم ہو یا اس پر کچھ زیادہ ہو۔ تمام طبی تحقیقات کا مقصد مادہ کے محسوس جزئی آثار کا مطالعہ کر کے عواملِ خفیہ اور قوانینِ عامہ تک پہنچنا عام جالوجی میں کروڑوں سال پہلے طبقاتِ زمین کے تشکیلات کے بارے میں خبر دی جاتی ہے اور پھر یقین کے ساتھ طبعی حور سے سطحِ زمین میں پیدا ہونے والے نشیب و فراز، طبقاتِ زمین کی حد بندی، آثارِ قدیمہ کو ہزاروں میں وسیع اور پھیلے ہوئے اوقیانوس، شور و زار زمین کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ ان اکتشافِ کریموں میں سے ایک شخص بھی زمین پر چھوٹے والے ان حادثات و واقعات کا نہ دیکھنے والا ہے اور نہ ہی اس کا عینی قیاس ہے۔

ہمارے ذہن میں آنے والے مفادِ عداوت، خوبصورتی، محبت، عداوت، بغض، علم کی کوئی شخص معین صورت نہیں ہے اور نہ یہ دکھائی دینے والی چیزیں ہیں اور نہ ان کا کوئی فیزیکی اثر ہے اس کے باوجود ان کو امور و قیام میں شمار کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان کی ہمت، لاسکی، عواجز، اہم کوانٹن نہیں جانتا۔ اسی طرح الیکٹرون، ذیوٹرون کو صرف ان کے آثار و نتائج سے پہچانا جاتا ہے۔ دیکھیں یہ چیزیں بھی نہیں آتیں۔ تو پھر خدا کو آثار سے پہچاننے میں کیا پریشانی ہے؟

اچھا، زندگی کا تو وجود ہے اور ہم اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے؛ لیکن ہم اس کی وسیلہ و ذریعہ حیات کی اندازہ گیری کی جا سکتی ہے؛ فکر و خیال کی سرعت رفتار کس پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے؟

ہرفیہ سرستانی کو گنگوٹان (SITANLY CONADOAN) لکھا ہے: "میں نے اپنے سات گرووں سے کہا

۵۔ وزن کو جانتا ہے۔ لے خدا تو پاک و منزہ ہے جو زمینوں کے وزن کو جانتا ہے۔ لے خدا تو پاک و منزہ ہے تو آفتاب و قمر کے وزن کو جانتا ہے۔ لے خدا تو پاک و منزہ ہے غلٹ و نور کے وزن کو جانتا ہے۔ لے خدا تو پاک و منزہ ہے تو سایہ اور مہاکے وزن کو جانتا ہے۔ جیغہ مبارکہ دعا ۵۵۔

کیا وہی تو ان کو عقلی تفکیر و تطبیق کرنے کا طریقہ لکھو۔ مجھے اس کا طول سمجھ میں، اس کا وزن کیوں گم میں، اس کا رنگ اس کی شکل، دباؤ، اندرونی کشش، فاعلیت، جہت حرکت و سرعت کو مجھ سے بیان کرو۔ لیکن وہ اندیشہ و فکر کو کسی فیزیائی تعبیر یا ریاضی معادلہ سے بیان نہیں کر سکے۔ ہاں اگر کوئی نیا لغت لکھا جائے جس میں فیزیائی طول و وزن کے مخصوص معنی تحریر کئے جائیں تو اود بات ہے۔

علم معرفت ایک آزمودہ علم ضرور ہے لیکن وہ بھی معرض اشتباہ و گمراہی میں ہے۔ زندگی میں اپنے مخصوص محدود کے علاوہ ناسمیں کوئی قانونیت ہے اور نہ صحت۔ تو ضعیف و بیہوشی کے لحاظ سے وہ مکمل طور سے معلومات کثمتی کے حصار میں محصور ہے۔ اور اسکی ابتداء و انتہاء احتمالی ہے یقینی نہیں ہے۔ اور اس کے نتائج بھی محض ارباب طاعت بن الظواہر المغلفہ حقیر ہیں اور ظن و تخمین کی غلطی سے برابر نہیں ہیں، وقتی اور غیر یقینی ہیں بسا اوقات جدید معلومات کی وجہ سے تغیر پذیر بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ علمی استخراج کی کوئی حد نہیں ہے۔ ایک عالم کہتا ہے: زمانہ ماضی تک کے افعیات ختم و چنان ہیں۔ خواہر طبعیت کے لحاظ سے ہمارے شخصی اور کائنات ماضی نسبتی اور محدود ہیں۔ اسی دنیا سے عجیب و پر تلاطم مہم کی کوئی ایسی واقعیت نہیں ہے جو بغیر کسی شرط کے وجود فعالیت خدا کی نفی کر سکے یا اس کے عدم کو ثابت کر سکے۔

اس بنا پر یہ بات نہایت ہی واضح ہے کہ غیر مرئی اور غیر مسموع کا انکار کرنے منطقی اور عقلی اصول کے برخلاف ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ منکرین خدا کیوں اس قاعدہ کو جو تمام مسائل علمی میں معمول رہے صرف خدا کے بارے میں اس کا انکار کرتے ہیں؟

در اصل یہ بات ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ ہم العباد مادہ کے چوکھٹے میں محصور و محبوس ہیں اس لئے موجود مطلق کا تصور عادی توجہ کے ساتھ کر ہی نہیں سکتے۔ مثلاً ایک دیہاتی سے اگر یہ کہا جائے کہ دنیا کے اندر ایک ایسا شہر بھی ہے جو بہت وسیع اور لاکھوں آدمی کی رہائش پر مشتمل ہے اور اس کا نام لندن ہے تو اس کے ذہن میں ایک ایسا گاؤں آئیگا جو اس کے گاؤں سے دس بیس گنا بڑا ہو

لیکن اس کی حالتیں، وہاں کے لباس، معاشرت، روابط کے بارے میں اس کا تصور یہی ہوگا کہ وہاں کے لوگ بھی ہمارے جیگاؤں کی طرح ہوں گے۔

لہٰذا نئے واقف افراد کے سٹے ہی کہا جاسکتا ہے کہ مہذبانہ ایک آبادی ہے لیکن اس طرح کی نہیں جیسا کہ تم سوچ رہے ہو اور نہ وہاں کی وضع تمہاری یہاں کے وضع کی طرح کی ہے۔ اسی طرح ہم پروردگار تعالیٰ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ موجود ہے نہ نہ ہے قادر ہے، عظیم ہے لیکن ان موجودات اور ان قدرتوں کی طرح نہیں ہے۔ اس طرح ہم کسی حد تک دائرہ محدودیت سے خارج ہو سکتے ہیں اور یہ بات تو مادہ پرست بھی جانتے ہیں کہ مادہ دنیا کی حقیقت و ذات کا تصور ناممکن ہے۔

اگرچہ ہماری نظریں یہ محسوسات ہماری واضح اور دقیق ترین معلومات میں شامل ہیں لیکن علمی اور فلسفی مسائل میں تب ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا بلکہ تعصب کی عینک اتار کر ان کی حقیقت و اہمیت اور کثرت و تفاوت کے سلسلہ میں وہ انسان کی کتنی مدد کر سکتی ہیں اس بات کی شخص ضروری ہے درجہ محسوسات ہم کو گہرائی و وضاحت سے دوچار کر دیں گے کیونکہ حسی اور کائنات خواہر محسوسات کی مخصوص و معین کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ حسی اور کائنات کا تعلق نہ تو نام خواہر محسوسات سے ہوتا ہے اور نہ ہی اشیائے غیر محسوس سے ان کا تعلق ہوتا ہے یہ صرف محدود دائرہ کے اندر ہی درک کیا جاسکتا ہے۔

اب آپ اپنی آنکھوں کو نے بچے کہ واقعات کے درک میں رہے مہذب ذریعہ سے مگر بہت مقامات پر حقیقت کے دیکھنے میں غلطی کرتی ہے۔ یہ انوار کا مشاہدہ صرف فانی وقت کر سکتی ہے کرب طوں موج ۲ فی صد میکرون سے کم اور ۸ فی صد میکرون سے زیادہ نہ ہو اسی لئے ماورائے بنفشی اور ماورائے قرمز کے نور کا دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ اور علمی کتابوں میں حواس کی غلطیوں کے لئے ایک مخصوص بات قائم کیا گیا ہے۔ ہم جن رنگوں کو اس دنیا میں دیکھتے ہیں یہ درحقیقت رنگ ہی نہیں ہیں بلکہ موج مختلف کے طوائفی ارتعاشات کا نام ہے۔ پس جس چیز کو ہم اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں وہ حدود قدرت میں محدود ہوتا ہے۔ مثلاً یہی حیوان گائے، بکری بعض واقعات کو مختلف رنگوں میں دیکھتی ہیں۔

اگرچہ ابھی تک اندوئے تحسین علمی یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ انسان کے حس مینائی میں مختلف رنگوں کے ادراک کی کیا کیفیت ہے؟ اور اس سلسلہ میں جو تحقیقات اب تک دنیا کے سامنے آئی ہیں یا جو نظریات ظاہر ہوئے ہیں دفعیہات سے لگے نہیں بڑھ سکے۔ رنگوں کی رویت کا مسئلہ بھی اسی طرح مبہم و پیچیدہ ہے۔

قوت لامرہ کا قریب اگر دیکھنا ہو تو تین برتنوں میں پانی پھر دیکھئے ایک میں بہت گرم پانی ہو۔ ایک میں بہت سرد پانی ہو اور ایک میں گنگنا پانی ہو اس کے بعد ایک باجمہ کو گرم پانی میں ڈالئے اور دوسرے کو سرد میں پھر دونوں کو ایک ساتھ لکال کر لگنے پانی میں ڈال دیکھئے تو آپ کو عجیب و غریب احساس ہوگا۔ ایک ہاتھ میں ضرورت سے زیادہ سردی اور دوسرے میں ضرورت سے زیادہ گرمی کا احساس ہوگا۔ حالانکہ پانی ایک ہے اور درجہ حرارت بھی شخص و میں ہے یہ لامرہ کا قریب ہوا کہ نہیں؟ لیکن عقل و منطق کہتی ہے یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں پانی گرم بھی ہو اور سرد بھی ہو اور اس میں دو متضاد صفیتیں پائی جائیں۔ یہ درحقیقت قوت لامرہ کی خطا ہے کہ جو پہلے دے پانی میں! تھوڑا لٹنے کی وجہ سے اپنے کنٹرول سے خارج ہو گئی ہے اور فعلاً یہ حس حقیقت کے برخلاف ہے جس کی غلطی پر عقل و ذہن متوجہ کرتے ہیں۔

ایسی حالت میں عقل کی رہبری اور تعیاس فکری کے بغیر صرف حس پر کیونکر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ اور حس کی غلطیوں سے بچنے کے لئے ادراک عقل کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ لہذا ماننا پڑے گا کہ یہ عقل کا حکم ہے جو اصلاح حواس کی ذمہ داری ہے اور جو حواس سے بلند و بالا ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ محسوسات واقعہ نبی اندیش نہیں رکھتے۔ صرف اندیش علمی نہیں ہے۔ اور جو لوگ اپنے مطالعات میں صرف حواس پر تکیہ کرتے ہیں وہ مسائل ہستی اور معاملے آفرینش کے حل پر کبھی بھی موفقی نہ ہوں گے۔

حواس کے واقعہ غائی کی قدرت کے سلسلہ میں جو کچھ ہم کو معلوم ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مملکت حس و تجربہ میں بھی نہ ہا حواس انسان کو علم یقینی تک پہنچانے پر قادر نہیں ہیں پھر بھلا ان مسائل میں جو حواس کی پہونچ سے ماوراء ہیں اسیں حواس کی رہبری کر سکتے ہیں؟

مدرسہ ماورائے طبیعت کے پیرو اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس طرح علوم حسیہ میں تحقیق

و معرفت کا طریقہ تجربہ ہے، اسی طرح مسائل و بعد الطبیعات میں انکشاف حقیقت کا ذریعہ وسیلہ عقل ہے۔

مشہور محقق - کیمیل غلاماریون - اپنی کتاب "اسرار الموت" میں تحریر کرتا ہے:

انسان جبل و نادانی کی حاوی میں زندگی بسر کر رہا ہے اسے یہ نہیں معلوم کہ انسان کی پر جسمانی ترکیب متعلق تک بہی نہیں کر سکتی۔ اور یہ حواس پنجگنا نہ انسان کو ہر چیز میں دھوکہ دیتے ہیں نہ وہ چیز جو انسان کو متعلق تک پہنچا سکتی ہے وہ صرف عقل و فکر و وقت علمی ہی ہے۔

آج انسان کی عقل و دانش کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ ایسے ذرات و طاقت کا وجود ہے جس کو ہم دیکھ نہیں سکتے اور نہ ان کا کسی حس سے ادراک کیا جاسکتا ہے۔ پس اس بنا پر بہت ممکن ہے کہ بہت سی چیزیں اور ایسے زندہ موجودات پائے جاتے ہوں جو ہمارے حواس کے دائرہ اختیار سے خارج ہوں۔

لہذا جب یہ بات دلیل قطعی سے ثابت ہوگئی کہ حواس ظاہری میں تمام موجودات کے شناخت کی طاقت نہیں ہے بلکہ یہ حواس کبھی تو ہم کو خیر و برے میں اور خلاف واقع کی نشاندہی کرتے ہیں تو ہم کو یہ کبھی تصور نہ کرنا چاہئے کہ تمام موجودات صرف ان میں موجود ہیں جن کا ہم احساس کرتے ہیں اور جس کا ہم احساس نہ کر سکیں وہ موجود ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف کا عقیدہ رکھنا چاہئے۔

جس طرح پہلے لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہر جسم میں کروڑوں میکروبزات موجود ہیں اور ہر زندہ جسم میں ان کی جولا نکلاہ ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ جو چیز واقعات کی طرف ہماری رہبری کر سکتی ہے وہ صرف اور صرف عقل و فکر ہے۔

اصل علیّت

اصل علیّت ایک عمومی قانون ہے۔ انسان کے تمام مادی علمی یا عادی کی بنیاد ہے۔ کوئی بھی حادثہ خواہ طبعی ہو یا اجتماعی علماء اس کی علت تلاش کرنے میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں کیونکہ علماء و دانشمند حضرات کبھی بھی تیسیم کرنے کے لئے یار نہیں ہیں کہ خود بخود علت و معلول کے بغیر کوئی چیز پیدا ہو جائے۔

عالمی چمکانے پر علماء اور دانشمند حضرات کی تحقیقات نے ان کو یہ صلاحیت عطا کر دی ہے کہ طبیعت کے طاقتور نظام کو بہتر طریقہ سے پہچان سکیں، باور علوم و ضاعات میں جتنی جتنی ترقی ہوتی گئی وہ قانون علت و معلول کے پابند سے پابند ہوتے گئے۔ یہ علاقہ علیّت و معلولیت اور یہ کہ کوئی بھی حادثہ ممکن عام میں اس وقت تک قدم نہیں رکھتا جب تک کہ اس کے لئے کوئی علت نہ ہو یہ قوی ترین عقلی دلیل اور فکر کش کی واضح صورت ہے اور یہ ایک ایسا فطری و طبعی امر ہے کہ ہمارے ذہن میں اپنے فعل و انفعالات کو آؤمیک طریقہ سے انجام دیتا ہے۔

غیر متدن انسان بھی حوادث و ظواهر کی علت کا متلاشی رہتا تھا کیونکہ علمی و مادی سے محروم تھا اس لئے ان حوادث کی نسبت ناپاک روحوں یا پاکیزہ ارواح کی طرف دیدیا کرتا تھا اور خود اہل فلسفہ نے انسان کی سرشت و باطن سے مفہوم علیّت کا استنباط کیا ہے اور ان مفہوم کو فلسفہ کے قارئین ڈھالا ہے۔

مادی ہی کے برخلاف ہم — جو مادہ کی چہار دیواری میں محصور ہیں — نے اپنا زندگی میں کسی چیز کو اتفاقاً پیدا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ طول تاریخ میں کسی کے سامنے ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ بغیر علت کوئی چیز خود بخود اتفاقی طور سے عالم وجود میں آجائے۔ اگر کبھی ایسا ہوتا تو مادی ہی کے

نظر کے لئے ذیل بن سکتا تھا کہ کائنات دفعتاً اتفاق طور سے پیدا ہو گئی۔

وقت و حساب و تعالیٰ اس فاعل کے قدرت و ارادہ و فکر کا نتیجہ ہے جو اپنے عمل کو کسی مخصوص مقصد کے بنیاد پر یکجا کرتا ہے۔ اور جو چیز عامل غیر عامل کے ہاتھوں موجود ہوتی ہے اس میں ہر گوشہ سے ہر صرح و مرجع و لافانویت کا اظہار ہوتا ہے۔ اب آپ سوچئے بھلا یہ کون سا تصادف ہے جس کے نتیجے میں طلوع ہستی سے اب تک ایسا عجیب و غریب، دقیق و منظم نظام موجود ہے؟ کیا اتنا ممکن نظام صدقہ و بقعہ ہو گیا؟ مجھے بتائیے کس مادی یا انسانی علم میں یہ بات دیکھی گئی ہے یا کسی نے دعویٰ کیا ہے کہ بغیر علت و سبب کوئی چھوٹی چیز بھی خود بخود موجود ہو گئی ہے؟ سلسلہ علت و معلول کا لالہ الی نہایت باقی رہنا اور علت اولیٰ کا نہ بچنا انکار علت کا مجوزہ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا مجوز ہو سکتا ہے کہ نیز جی کے پہلے ذیہ کو آخری ذیہ قرار دیدیا جائے۔ اگر یہ کائنات عین حکمت ارادہ عالمہ اور تدبیر مہندی کا نتیجہ نہ ہوتی اور ایک منظم نظام کے تحت نہ چل رہی ہوتی تو ابتدائے آفرینش ہی سے ہر لحاظ نابودی و دیرانی کے خطوط میں ہوتی۔ کیونکہ اگر کوئی واقعہ اتفاق کی بنیاد پر ناگہانی طور سے زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں رونما ہوتا تو خدائے عالم کیلئے اس اتفاق کا وجود بہت ہی سادہ ہوتا۔ کیونکہ نظام میں یا تو ان میں عناصر میں متحد اس داخل اور تو ان میں مل میں معمولی سا رد و اجرام سماوی کے ٹکرانے کیلئے کافی ہے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں نظام کا فنا ہو جانا بہ ہی ہے۔

اور اگر پیدائش عالم بر بنائے تصادف ہے تو پھر یہ مادی حضرات وجود کائنات کی تفسیر ایک محکم نظام و مکمل تدبیر پر ہے۔ جس میں کسی اتفاق کو دخل نہ ہو۔ کیوں مبنی جاتے ہیں؟

اگر پوری کائنات تصادف و اتفاق کا نتیجہ ہے تو وہ کونسی چیز ہے جو تصادف کی بنیاد پر موجود نہیں ہوتی؟ اگر کوئی موجود تصادف کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے وجود میں آیا ہے تو اس کے معجزات و خصوصیات کی ہیں تاکہ ہم تحقیق کریں اور دیکھیں کہ کیا وہ اس دنیا میں مختلف ظواہر متنوعہ پر منطبق ہوتا ہے کہ نہیں؟ حالانکہ نظام ہستی میں کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی جس کا وجود اتفاق پر مبنی ہو۔ بلکہ کاغذ آفرینش کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو فکر و تدبیر و وقت کا نتیجہ نہ ہو اور آثار کے یہی خصوصیات ہماری رہبری و موثر کی خصوصیات کی طرف کھینچتے ہیں۔

اگر نظام توانا زن کا مطلق اتفاق و صدقہ ہوتا تو جتنی بھی چیزیں ہندسہ و دقیق حساب پر مبنی ہیں سب غیر منسجم اور ناہم انگ ہوتیں کیونکہ ہندسہ و دقیق حساب اتفاق و صدقہ کے مذہبیں اسی لئے ہم کہا کرتے ہیں صدقہ و انصاف کو نظام عالم کی اساس قرار دینا کسی منطقی برهان اور علمی دلیل نہیں ثابت کیا جاسکتا۔ اور نظام وجود کے لئے بطور آخری حل کے قبول کیا جاسکتا ہے۔

اگر لفظ صدقہ کا استعمال بعض مسائل میں ہوتا بھی ہے تو وقتی اور عدم معرفت کی بنا پر ہوتا ہے اگاہی و علم کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ اور جبکہ حوادث پر حاکم قانون — یعنی علت و معلول — کا انکشاف ہو جائے اس لفظ سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب مستمر علمی تحقیقات کے نتیجہ میں پیچیدہ حوادث کی علت و حقیقت متکشف ہو جاتی ہے تو اس لفظ کو طاق نسیان میں رکھ دیا جاتا ہے اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ تصادف کی تعبیر ایک آخری علمی فیصلہ نہیں ہے۔ بدستخت علمی اور نظام جہاں کے کشف و موزع کے بعد اس لفظ کے لئے کوئی مجال باقی نہیں رہتی۔

یورپی نہفت علمی کی ایک برجستہ شخصیت فرانسس بیکن (FRANSIS BACON) کہتے ہیں: میرے لئے یہ تو ممکن ہے کہ تمام افانوں پر ایمان لاؤں لیکن یہ ہرگز نہیں مان سکتا کہ اس کائنات کی بنیاد بدون علم و شعور رکھی گئی ہے۔ ایک علمی فلسفہ تو ذہن بشر کو اسحاق کی طرف لے جاسکتا ہے لیکن فلسفہ دقیق ان کو ہمیشہ دین کی طرف لے جا بیگا۔ کیونکہ اگر کسی نے نزدیک علت کو دیکھا اور گہرائی میں نہیں کیا تو ممکن ہے کہ وہ خدا کا قائل نہ ہو۔ لیکن اگر تمام سلسلہ علل و معلولات کو نظر میں رکھے گا تو بہر حال شیت ازلی اور خدا لئے واحد پر ایمان لائے گا۔

یہاں پر مشہور ریاضی دان نیوٹن - NEWTON اور انگریزی مشہور منجم کی ایک دوست سے گفتگو کو نقل کرنا بہت مناسب ہے۔ نیوٹن (NEWTON) نے ایک ماہر میکینک اور خوش ذوق آدمی سے نظام شمسی کا ایک چھوٹا سا نمونہ (ماڈل) بنانے کو کہا اس ماڈل میں ایک ستاروں کا مرکز اور متعدد ستارے بنائے گئے تھے لیکن یہ ستارے چھوٹے چھوٹے گیند کی طرح کے تھے اور ذیلی کے تاروں سے ایک دوسرے سے مرتبط تھے اور ایک چھوٹے سے ہینڈل کے ذریعہ

نہ تار۔ یہ تاروں میں دھڑکتا تھا

ان تمام ستاروں کو اپنے اپنے مدار میں حرکت کرنے پر آمادہ کر دیا جاتا تھا اور یہ سارے ستارے اس مرکز کے ارد گرد گھومنے لگتے تھے۔

ایک دن نیوٹن (NEWTON) اپنی میز کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا وہ مکینک دوست بھی پاس ہی بیٹھا تھا جس نے یہ نظام مسمیٰ بنایا تھا اتنے میں نیوٹن (NEWTON) کا ایک دوست جو علمائے مادیہ میں سے تھا ناگہانی طور پر آگیا اور جس وقت اس کی نظر اس مصنوعی نظام مسمیٰ پر پڑی اس کی خوبصورتی و استحکام کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا اور جب اس چھوٹے سے ہینڈل کو حرکت دیکر تمام سیاروں کو مرکز کے گرد متحرک دکھایا گیا تب تو وہ اپنے تعجب کو چھپانہ سکا اور بولنا لگا بھائی اس خوبصورت چیز کو کس نے بنایا ہے؟ نیوٹن نے کہا کسی نے نہیں بنایا یہ تو اتفاقی طور سے وجود میں آگیا۔ عالم ہادی نے کہا میرے دوست تم نے میرے سوال کو نہیں سمجھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارے سامنے رکھا ہوا نظام مسمیٰ کو کس نام مکینک نے بنایا ہے؟ نیوٹن "NEWTON" نے کہا برادر میں نے آپ کا سوال حرف بحرف سمجھ لیا ہے اس کو کسی مکینک نے نہیں بنایا بلکہ اس کے ذرا اور مواد اولیہ اتفاقاً جمع ہو گئے۔ اور اس صورت میں بن گئے۔ دانشمند ہادی نے ایک ایسی نظر سے دیکھا جس میں حیرت و طبعی کی بارش تھی اور بولا: میرے دوست نیوٹن! تمہارا خیال ہے کہ میں جو خوف ہوں؟ کہ اس جیسی نادر و نایاب چیز کے بنانے والے کو مادہ کی طرف نسبت دوں؟ اسی وقت نیوٹن نے اپنا مطالعہ روک کر کتاب بند کی اور میز کے کنارے سے نکل کر اپنے دوست کے پاس آکر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا میرے دوست! یہ چیز جو تم دیکھ رہے ہو اور اس کے بنانے والے کے بارے میں پوچھ رہے ہو سو اسے ایک چھوٹے سے مائیکٹ کے علاوہ کچھ بھی نہیں اس کو ایک مخصوص سسٹم کے ذریعہ بنایا گیا ہے تم اس کے لئے تیار نہیں ہو کر یہ خود بخود بن گیا ہے اور یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اس کا بنانا یوں آسان و آگاہ نہیں تھا۔ بس پورا نظام مسمیٰ اپنی تمام غفلت و

نے نمونہ و ماڈل

(۵۲)

دو دعت اور عیدگی کے باوجود بغیر کسی بنائے دے کے خود بخود بن گیا ہے اور مادہ کی کارفرمائی ہے اور اس کی
 آفرینش اتفاقی ہے! دانشمند مادی یونٹ کے معقول دلیل کے سامنے لاجواب ہو گیا اور اس پر
 ایک گہری خاموشی چھا گئی اور اسی کے ذریعہ وہ ماہر فنکار جو مادی عقائد رکھتا تھا اور حقیقت سے
 کنارہ کش تھا وہ بھی لاجواب ہو گیا۔

jabir.abbas@yahoo.com

اصالت نیروی حیات

آج کا علم یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ زندگی زندگی کو ایجاد کرتی ہے۔ زندگیوں کی زندگی ہمیشہ توالد و تناسل کے ذریعہ پاتی و مستحضر ہے۔ آج تک کوئی ایسا خلیہ نہیں دیکھا گیا جو بے جان چیز سے پیدا ہوا ہو۔ حدیث ہے کہ کبوتر مکور سے کچھوٹنے تک اگر ان کا پیدا کرنا والد ارٹے حیات نہیں ہے تو چاہے وہ جہاں بھی ہو کسی دوسرے کا خالق نہیں ہو سکتا۔

آج کا علم کہتا ہے: اس کرہ زمین پر ایک مولائی زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ فوقی العادت گری کی وجہ سے اس پر زندگی کے آثار تھے نہ مبرزے کا وجود تھا اور نہ نہیں اور چسپے تھے جہاں اس کی فضا پگھلی ہوئی دھاتوں اور آتش فشاؤں سے برقی اور پھر جب پشت زمین سرد ہو گئی تب بھی لاکھوں سال تک اس پر مواد غیر آبی کے علاوہ کسی جاندار کا وجود نہیں تھا۔ مختصر آیوں سمجھے کہ سطح زمین پر چھوٹے و بڑے تغیرات کے درمیان کسی زندگی کا وجود نہیں تھا تو پھر اس روئے زمین پر زندگی کیونکر آئی؟

محققین کا خیال ہے کہ زمین کی پیدائش کے تین ارب سال سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد حیات کا وجود ہوا ہے لیکن اس نے اپنے آفوشن میں کتنے سالوں کو دکھا ہے اور کیا کیفیت تھی یہ کچھ معلوم نہیں ہے؟ سیکڑوں سال گزر گئے جب سے علماء و محققین و ازجیات کو کشف کرنے کے لئے اپنے تجربہ گاہوں کی چار دیواری میں دن رات سعی و کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس معمہ کے حل میں ناکام ہیں۔

جرمنی کا مشہور محقق و دانشمند بروڈولف لگ (۱۸۹۱ء-۱۹۶۵ء) اپنی کتاب "العوالم البعیدہ" میں تحریر کرتا ہے: زندگی: کتنا سحر آفرین کلمہ ہے! کیا وجود عدم سے پیدا ہوا ہے؟ کیا موادِ آبی موادِ غیر آبی سے وجود میں آسکتے ہیں؟ یا یہاں پر کسی قادر مطلق پیدا کرنے والے کا: تمہ کا فرما ہے؟

کبھی یہ بات بھی جاسکتی ہے ممکن ہے دوسرے اجزاء ملکی سے ہمارے سیارہ میں زندگی آگئی ہو ؟
 کیونکہ زندہ میکروبات نباتی جو کسی ملکی کسے میں گردش کرتے کرتے بہت اونچے اٹھ گئے ہوں اور
 فضا کے نتیجے میں سورج کی شعاعوں نے ان کو کسی ایسے فضا کے افلاک میں پھینک دیا ہو جو اس کرہ
 کی سطح تک پہنچ گئے ہوں اور وہاں نشوونما پاکر تکامل کی صورت اختیار کر گئے ہوں !

ان مفروضات کے باوجود اس معاملے میں سرسوزن پیش رفت نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس
 صورت میں بھی ظہور زندگی کی کیفیت خواہ کوئی ایسا سیارہ ہو جو ہمارے نظام شمسی کے تابع ہے
 یا شعریہ بیانی کے تابع ہے — ہمارے لئے بھول ہے اور غیر واضح ہے۔

جس طرح فز، چرخی، وغیرہ کے اکٹھا کر دینے سے گھڑی نہیں چلا کرتی اسی طرح جب تک مرکب
 حیات اور زندہ ہوجانے کی صدا مطلقہ ہوگی زندگی ناممکن ہے۔

اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ مادہ دارائے زندگی نہیں ہے اور کوئی بھی مادی عنصر تنہا زندگی
 کی خاصیت نہیں رکھتا اس لئے یہ فرض کرنا کہ مادے کے ذرات کے تشکیل کے نتیجے میں زندگی آجاتی
 ہے ناممکن ہے۔ کیونکہ پھر ہمارے سامنے یہ سوال خنکھوٹے کھڑے ہے کہ مادہ تناسل و تولید
 کے علاوہ کسی اور صورت سے مکرر اور بشکریہ کیوں نہیں ہوتا ؟ زندہ اجسام میں برابر یکساں و ی
 فعل و انفعالات کا سلسلہ باقی ہے۔ اس کے باوجود حیات کا اس میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اب یہی
 یہ بات کہ مادہ ترکیب کی طرف تہا میں رکھتا ہے اور اس کے دورہ ہونے تک وہ تکامل میں زندگی گزارتا
 کھاتی ہے تو یہ زندہ حوادث کے مظاہر کی توصیف ہے جس کو ہم خود بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیفیت
 وجود حیات اور اس کے سبب کی معرفت کا بیان نہیں ہے۔

ذاتی طور پر اجزائے مادہ میں کوئی اختلاف تو تھا نہیں پھر آخر بعض اجزاء تو دوسرے سے مرکب
 ہوئے اور بعض اجزاء دوسروں کے ساتھ مرکب نہیں ہوئے، بعض اجزائے مادہ دارائے حیات
 ہوئے اور بعض دیگر محروم رہے آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟ یہ تفاوت کہاں سے پیدا ہوا اور حیات
 جیسا کہ اختلاف کی علت کیا ہے ؟

دو یا چند مختلف عناصر سے مل کر جو چیز حاصل ہوتی ہے اسیں ریات ہوتی ہے کہ ایک عنصر کے اندر جو غایت ہوتی ہے وہ دوسرے کو بخش دیتا ہے لیکن جو فاقہ غایت ہے وہ کیونکر دوسرے کو بخش سکتا ہے؟ البتہ عام مرکب ہونے کے بعد ان میں ایک خاصہ عمومی پیدا ہو جاتا ہے جو ہر حال فوفا و فوفا عناصر مرکب کے خواص سے خارج نہیں ہوتا۔ لیکن حیات کے جو منفرد خصوصیات ہیں ان میں اور مادہ کے خصوصیات میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ کیونکہ حیات کے لئے جو تجلیات ہیں وہ مادہ کے لئے ہرگز نہیں ہیں اور بہت سی حیات مادہ پر حاکم ہے اگرچہ صورت و شکل میں وہ مادہ کے تابع ہے لیکن پر تو حیات جو لہی مادہ پر چمکتا ہے اسی حرکت و جنبش و ارادہ اور حرکت کار اور حرکت معرفت تعالیٰ ہوتی ہے۔ لہذا زندگی کی تفسیر فعل کی یاد کی مدد سے کرنا غیر معقول ہے۔ ایک فلسفی لکھتا ہے: کارخانوں کی طرح زندگی جامد و بے روح سسٹم کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا سسٹم ہے جس میں قدرت تکرار اور اپنے لئے قوت تجدید ہے اور اگر تعبیر درست مانی جائے تو اپنے اوپر توفیق و برتری بھی رکھتی ہے اور اس کے اندر ایک فطری و طبعی ہدی و مرشد ہے جو اندر سے اس کی ہدایت کرتا رہتا ہے۔

آخر یہ کون سا عامل ہے جو مادہ کو مختلف انواع میں منظم کر دے؟ ماتحت بنانا رہتا ہے جو جسم اندر پانی جگہ بنالیا ہے۔ مادہ منور کے اندر آباد و ابعاد کی خصوصیات کو بلا استثناء اور بغیر کسی غلطی و خطا کے جتنوں کے اندر منتقل کر دیتا ہے۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ زندہ خلا کے ترکیب میں بھی خصوصیات ہوتی ہیں مثلاً کیوں کو چھو کرنا، حلق شدہ کو پھرنے سے بچانا، استعداد السورع اور حفظ الزوق وغیرہ۔ انسانی بدن میں جس وقت عمل کرنا چاہئے ہر سول اسی وقت بہت ہی شائستہ طریقے عمل کرتے ہیں تقسیم کار اور اپنے وظیفہ پر عمل حیرت انگیز ہے۔ بدن کے بنانے کے لئے بمقدار ضرورت تقسیم ہو جاتا ہے اور ہر خلیہ اپنی جگہ پر دماغ، دیر، ہیکل، دل، گردہ میں پہنچ جاتا ہے۔ پس ایک جسمانی عمارت میں نظم و انتظام کے بعد خلیہ کے حیاتی وظائف میں کسی قسم کا قصور نہیں ہوتا غیر مفید اور فاضل مادہ کو ختم کر دیتا ہے۔ اور مکمل طور سے حجم مناسب کی حفاظت کرتا ہے۔

اس حیرت انگیز تقسیم بندی — جو اجسام موجودات میں اجزاء و لوازم و متناسبہ کی موجود ہے —

کی نسبت ناگاہ و دیکھائی مواصل کی طرف دنیا بہت ہی ناقص ہے۔ یہ سہ اور بھلا کون سا انسان جو حریت فکر کا
 ایک ہوگا اس منطق کو قبول کرے گا۔؟

اسی لئے ہم کہتے ہیں: حیات و زندگی ایک ایسا نور ہے جو اس مادہ سے — جو جاندار ہونے کی استعداد
 رکھتا ہے۔ بالاتر افق سے چمکتا ہے اور اس کو بنیشت و حرکت پر آمادہ کرتا ہے۔ اور یہ اس اندک یس و یکم و قادر
 و خیر کا ارادہ ہے جو زندگی کو اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ بے جان مادہ پر فائز کرتا ہے۔ اور
 حقیقت میں وہ گاہ انسان مادہ متحرک و سیر کے درمیان حیات کے رشتہ ثابت کو دیکھتا ہے اور خدا کو
 ملائقت کے جوہ میں مستحضر شاہدہ کرتا ہے۔

فطرت میں خدا کے جلوے

خداوند عالم کی معرفت کے لئے ذیل مآد و طبیعت بعنوان مصنوع بہترین و روشن ترین اور عمومی دلیل ہے۔ اور یہی مادہ مخلوقات خدا کے حکیمانہ ارادہ کے کاشف ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی طاقت و شاعری میں سے یہ بھی ہیں جو موجودات کو مدد و زندگی بخشتا ہے اور تمام موجودات اپنے وجود و ترقی میں اس سے کسب فیض کرتے ہیں۔

خدا کی معرفت کے لئے دو طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرا فلسفی جس کے ذریعہ اس حقیقت قطعی تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے اور عقیدہ میں مضبوطی آ سکتی ہے اور شناخت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

پرتوجہ طریقہ استدلال تو صرف دانشمندوں کے لئے لائق آفرین ہو سکتا ہے۔ لیکن کتاب قریش کے اسرار اور دنیا کے گونا گون موجودات کا مطالعہ خود گواہ ہیں کہ اس کی حقیقت میں عقل عالی کی نہایت بڑی کتاب موجودات کا مطالعہ بھی اس خدا سے جو عاقی و حکیم ہے اور پورا نظام کائنات اپنی تمام غفلت و وسوسہ کے ساتھ جس کے مظاہر قدرت کا معمولی سا جز ہے۔ پر ایمان لانے کے لئے اگرچہ دلیل و برهان کا محتاج ہے مگر یہ بران انسا سادہ و بسیط ہے کہ جس میں فلسفی دلائل کی گتھیاں نہیں ہیں اور ایک طرح سے یہ راستہ تمام لوگوں کے لئے کھلا ہے۔ جس سے ہر مفکر، عالم، عاقل استفادہ کر سکتا ہے۔

ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق تمام مظاہر قدرت میں آثار ترکیب و توازن و تدبیر کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اس کو ہر ذرہ میں وجود مبدد پر محکم و قوی دلیل مل سکتی ہے۔

اگر ایک سادہ آدمی بھی کسی حیوان کے بدن پر غور کرے تو اس کے اعضاء اور ہڈیوں کی

خصوصی ترکیب اور ظاہری جہاں کو دیکھ کر یہ یقین کر لیگا کہ یہ دقیق نظام یہ محاسبات و تقادیر کا تحقق کسی عظیم قدرت کاملہ و عللہ کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور ایک عالم فیز یو لوجی معائنہ نظر کے ساتھ جب دیکھا کہ وہ مگر وعدہ اور وصول غذا کے نظام کو دیکھتا ہے تو اس کو علم و قدرت لا متناہی کے آثار بخوبی دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ سادہ آدمی اور عالم فیز یو لوجی کے غور و فکر کا طریقہ ایک نہیں ہو گا ایک کا دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ علمائے علم کی جو چوٹیاں سر کی ہیں اور فطرت کے راز ہائے رب بستہ کے کھولنے کے لئے جو اقدام کئے ہیں اور نظام کائنات کے حیرت انگیز و تعجب فیض معرفت کیلئے جو قواعد اٹھائے ہیں ان کا تعادل عام آدمی سے نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ دونوں عالم و شخص سادہ — کے مطالعہ کا نتیجہ ایک ہی ہے۔

عام طبیعت کے لا متناہی اسرار کا مطالعہ کرنے والے تجرباتی علوم سے ہر شخص کے مستفید ہونے کے باوجود ان علوم میں ایک خصوصیت ہے کہ عبا ئب خلقت اور فطرت پر حاکم موصوفی نظام کی معرفت انسان کو حقیقی کائنات کی معرفت ملے ساتھ اس کے صفات کمال جیسے علم و قدرت متناہی کائنات نمائی بھی عطا کرتی ہے۔

یہ دقیق نظام — جو مختلف امور کے درمیان مناسب و معقول رابطہ کے برقرار رکھتا ہے۔ حیوانات، نباتات، زمینوں، آسمانوں، کروں، پہاڑوں، سینہ دروں، ایٹموں کے اندر اسکی وسیع حکمت پر دلالت کرتے ہوئے خواہ از روئے ابداع و ایجاد دیکھا جائے یا اسکی مصنوعات میں چھوٹی سے لیکر بڑی تک چیزوں میں جو علم و قدرت و دلالت کی گئی ہے، اسی کو مطالعہ کیا جائے۔ بنیادی طور پر علمی ہیئت سے مادہ کی خود سازی محال ہے۔ اور مادہ کسی نظریہ کہ ”جہان مادی ہمیشہ تحول اور برزخ کا طوفان میں رہا کرتا ہے۔“ بھی علمی میزان اور فطری واقعات کے مخالف ہے۔ بلکہ حادثات کے اندر ہونیوالے تمام تحولات یا تو خارجی قوت کے زیر اثر ہوتے ہیں یا اجسام مختلفہ میں داخل تبدل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور نباتات کے اندر ہونے والے تحولات اور ان میں نمود و توسع بارش، شعاع فحس، اور زمینی تغذیہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اسی طرح عالم جو انات میں بھی یہی صورت ہے اس میں حرکات ارادیہ کا اعناض بھی ہے۔
ان موارد مذکورہ میں اشیاء موجودات کا انضمام و ہم کاری جو فارسی کے ساتھ واضح و
روشن ہے۔ اور ان چیزوں کے باطن میں جو اثر و خواص و دیوت کئے گئے ہیں اور جو قوانین و قیود
ان کے لئے لازم قرار دیے گئے ہیں مجاہل نہیں ہے کہ کوئی موجود اس پر لازم کئے گئے قانون کی مخالفت
کر سکے۔

انسان اپنے حواس کے ذریعہ جن واقعات کا ادراک کرتا ہے اس کے مختلف خصوصیات
ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ موجودات عالم تغیر و تحول و غیر ثابت ہیں۔ ایک مادی موجود
اپنے تمام دودھ ہستی میں یا تو بستر شدہ دکھل پر برقرار ہے اور یا پھر فرمودگی و انحطاط کی طرف
مائل ہے مختصر یہ کہ کائنات ہستی میں کوئی بھی موجود مادی ثابت و برقرار اور ایک حالت پر نہیں ہے۔
محدودیت بھی موجود محسوس کے حقائق سے ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لیکر
بزرگ ترین گہشت نون تک ہر چیز زمان و مکان کی محتاج ہے۔ بس انما فرق ہے کہ بعض چیزیں بزرگ
مکان یا طولانی زمان پر مشتمل ہیں۔ اور بعض چیزیں مختصر مکان یا مختصر زمان پر مشتمل ہیں۔ اس کے
علاوہ ہر مادی موجود اصل ہستی کے لحاظ سے اور کمالات کے لحاظ سے نسبی ہے۔ قدرت و عظمت
و ذریعہائی و دانائی بلکہ چیزوں کی ہر صفت دوسری چیزوں کے اعتبار سے نسبی ہے۔

اسی طرح موجود محسوس کی خصوصیت تعلق و اشتراط بھی ہے۔ ہم جس موجود کو بھی فرمیں کری
وہ کچھ دیگر امور سے مشروط و متعلق ہوگا۔ اس لئے وہ ان شروط کا محتاج کہلائے گا۔ اس دنیا کے
اندہ کوئی ایسی مادی چیز نہیں ہے جو بالذات ہو اور غیر سے مستغنی ہو۔ لہذا فقر و احتیاج تمام
مادی موجودات کو محیط ہے۔

حواس کے برخلاف انسانی عقل و فکر جو مجاہد و کھربور کر کے ہستی کے اعماق میں نفوذ کرتا
ہے وہ کسی بھی ہستی کو امور نسبی و محدود و تغیر و محتاج میں منحصر ماننے پر تیار نہیں ہے۔ بلکہ فکر
انسانی ایک ایسے وجود کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے جو دائمی حقیقت اور غنی مطلق ہو اور وہ

حقیقت ایسی ہو جو تمام زبانوں اور مکانوں میں حاضر موجود اور تمام موجودات اسی کی طرف مستند ہوں۔ کیونکہ پورے کائنات کا جو عالم بنات خود موجود نہیں ہو سکتا۔

پس معلوم ہوا کہ عالم ایک ایسی حقیقت مستقلہ کا محتاج ہے جو نہ قید بردار ہو نہ کسی پر معلق ہو اور کسی غیر سے مشروط ہو بلکہ وہ تمام امور مشروط و مدنی و دنیوی کی حفاظت کنندہ ہو اور ہر چیز اسی حقیقت کی محتاج ہو کہ اس کے درون کو ہستی سے پر کرے۔ غلام یہ کہ ہر موجود میں اس کی حیات و دائمی و قدرت و سبب اتہا حکمت کی نشانی موجود ہو۔ اور انہیں موجودات کو دیکھ کر اس حقیقت کے بارے میں یقینی معلومات حاصل کر سکیں اور ہر ذہن جو اس حقیقت شخص اس طریقہ سے وجود خالق پر دلیل قائم کر سکتا ہے۔

مادہ اور قوانین وجود

مادہ اور قوانین وجود کے درمیان لازمی تقابل کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مادہ مستغنی ہو گیا ہے بلکہ وہ سے مختلف اقسام کا پیدا ہونا اور ان کے درمیان شدید ارتباط و تلازم سے پہچلتا ہے کہ مادہ خود اپنے وجود میں چند سنی قوانین کا پابند ہے جو اس کو ملک نظم و نسبی میں پروتی میں۔ کیونکہ وجود دو اساسی عناصر پر موقوف ہے ایک مادہ اور دوسرے نظم و ضبط اور ان دونوں میں مستحکم قسم کا ارتباط ہے اور وہ اور نظام کے مستحکم ارتباط کی وجہ سے جہاں مناسب کا وجود ہے۔

جو لوگ مادہ کو بے نیاز مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ مادہ خود اپنا خالق ہے اور اپنے لئے اس نظام کو پیدا کر نوالا ہے وہ لوگ بھدیہ کیونکر قبول کر سکتے ہیں کہ مادہ جن و کسب اور ایکسٹرون اور پروٹون نے خود ہی اپنے کو پیدا کیا ہے اور پھر ہی چیزیں دیگر موجودات کے وجود کا سرچشمہ بنی ہیں اور پھر انھیں چیزوں نے کچھ ایسے قوانین بنائے ہیں جو خود ان چیزوں پر اور تمام عالم مادی پر حاکم ہیں۔

مادہ پرست حضرات کا خیال ہے کہ اشیاء پرست موجودات عالیہ کی پیدائش کا سرچشمہ ہیں مگر وہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ مادہ جب اپنے اور جہاں کی حالت میں اپنے کو ایجاد کرنے سے یا قوانین حاکم کی نافرمانی کرنے سے عاجز ہے تو اپنے حفیض ہستی کی صورت میں اپنے ایجاد کرنے یا نظام وجودی کے بجا پر کیونکر قادر ہو سکتا ہے؟ لہذا یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ پرست مادہ موجودات عالیہ کا خالق ہے یا یہ کہ اس کو زندگی بخشنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟

مدیہ سسٹم میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ہر مقصد زندہ عناصر سے مرکب سسٹم یا معین پروگرام کی بنیاد پر خارج سے منظم شدہ سسٹم سے مرکب نظام میں یا ممکن ہے کہ ان کا تھوڑا سا ہی ہو سکیں

ہر مادہ سسٹم یا مرکب جو خارجی امداد اور تباہی کا محتاج ہو اور جو خود اپنی سازندگی پر قادر نہ ہو وہ تمام موجودات کا خالق کیونکر ہو سکتا ہے؟ جبکہ تمام سسٹموں کا مجموعہ بھی جب تک ارادہ، توانائی و شعور کا دارا نہ ہو وہ نہ قدرت ایجاد رکھ سکتا ہے اور نہ ہی کامل و متحرک دستگاہ کا ادارہ کر سکتا ہے!

قانون — حساب الاحتمالات — میں یہ بات مسلم ہے کہ مجموعی حرکت جو غیر منظم ہو وہ صرف تفرق و پراگندگی پیدا کرتی ہے اور ہلاکت سے قریب تر کر دیتی ہے۔

قانون احتمالات اس خیال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ دنیا کی پیدائش اتفاقی طور سے ہو گئی ہے بلکہ نہ صرف مخالفت کرتا ہے بلکہ اس کو نامعقول و ناممکن بھی سمجھتا ہے اس کے برخلاف قانون احتمالات ریاضی دنیا کے لئے ایک صحیح قیادت اور دقیق پروگرام کی ضرورت کو لازمی بتاتا ہے۔

قانون احتمالات نے پیدائش عالم اتفاقی سے "کے ماننے والوں کے منہ پر بھر پور طمانچہ مارا ہے۔ اگر بعض چیزوں کی خلقت کو اتفاقی مان لیں — تو اگرچہ یہ بات بہت بعید ہے — مگر ناممکن نہیں ہے۔ لیکن ایک ایسے عالم کے بارے میں جو نہایت ہی متوازن و منظم اور باریک بینی پر مبنی ہے۔ اس کا وجود اتفاقی مان لینا ناممکن ہے۔ اور نظام وجود میں جزئی اور مادہ قسم کے تغیرات کا ہونا عالم کے اتفاقی وجود پر ہرگز دین نہیں ہے۔

اگر فطرت خود بخود حالت ترکیب و تشکیل میں تھی تو اب اس سبب تغیر میں کوئی اجکار کیونکر نہیں ہوتا۔ اور اب یقیناً آئینہ کسم کے تحولات کیوں نہیں رونما ہوتے؟

آج بھی دنیا میں حیرت انگیز واقعات جو ہوتے ہیں وہ خود اس حقیقت کی راہ نمائی کرتے ہیں کہ اس حیرت انگیز تحولات کے پیچھے کوئی عام و دانا طاقت موجود ہے جو کائنات کے انداز بارش اور عجیب خیز نظام کو بروئے کار لاتی ہے اور عالم آفرینش میں شگفتگی پیدا کرتی ہے۔ اور کائناتوں و تنظیم کا نقشہ ہستی پر ترسیم کرتی ہے۔

فطرت کے کرداروں ظواہر میں یہ حماکتی اور ارتباط اور زندگی سے ان کے رابطہ کی صرف ایک ہی توجیہ ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وسیع کائنات کے لئے ایک خالق فرض کریں کہ جس نے اس

کہہ خاکی میں اپنی غیر محدود و بے انتہا قدرت کے ذریعہ مختلف عناصر کو زندہ رکھا اور ہر ایک کے لئے ایک زمین پر و گرام ترتیب کیا اور یہی توجہ فطرت کے تمام طواہر میں ارتباط و توازن سے مطابقت رکھتی ہے اور اگر اس توجہ کو قبول نہ کریں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم یہ احتمال دین کہ انوع خواہر بہ یعین یہ ارتباط و انسجام اتفاقی طور سے بغیر کسی مقصد کے قائم ہے؟ اور یہ کیوں نہ کر مانا جاسکتا ہے کہ وہ مادہ کروڑوں صفات و اوصاف میں اس خدا کے مساوی ہے جو عالم و فانا مدبر و قادر مطلق ہے؟

اگر یہ کائنات — جس میں مجیر العقول عجائب ہیں اور عقل بشر اس کے حیرت انگیز اذخار کے درک سے عاجز ہے — موجود نہ ہوتی اور دنیا صرف ایک تھوڑے موجود میں منحصر ہوتی جو صاحب خلیتہ واحدہ ہوتا تب بھی اس موجود غیر کے اتفاقی وجود اور نظم و ضبط کا احتمال، احتمالات کے حساب کی بنیاد پر شامل اور نہ گوی کے محاسبات کے مطابق — ایک ایسی ریاضی رقم تک پہنچتا ہے جس کے استيعاب پر خود فکر انسانی قادر نہ ہو سکتی۔

(BASHMIL) "بشمن" کہتا ہے — اے مادہ پرستو تم لوگ زمین و سورت کی حرکات و ادوار اور پورے نظام شمسی کے قائل ہو اور یہ بھی اعتراف کرتے ہو کہ علم ریاضی ایک مضبوط اور قطار دار نہیں ہے اس کے باوجود ان حرکات اور متحرکات کثیرہ و غظیمہ و دقیقہ و محکمہ و نظم کے پیچھے کسی مدبر طاقت کے قائل نہیں ہو تو تم کو یہ کہنا چاہئے کہ اس نظام میں خود اپنے کو پیدا کیا ہے اور اپنے لئے ایسا مجیدہ نظام بنایا ہے جس نظام کے مطابق وہ حرکت کرتا ہے اور گھومتا ہے اور پھر اپنے لئے ایک ایسے زمین و دقیق و مستور بنایا ہے کہ جس کی بنا پر وہ کسی دوسرے سے نہ ٹکرائے اور یا پھر اپنی اس سرسام و دیریت میں ایک ایسا مانع بنا دیا ہے کہ جس کی بنا پر وہ کبھی کسی سیارہ سے ٹکرائے نہ سکے — میں شخصی طور پر کسی باہوش آدمی کے لئے یہ نہیں سوچ سکتا کہ وہ ایسا عقیدہ رکھتا ہوگا؟ یہ تو کوئی دیوانہ ہی عقیدہ رکھ سکتا ہے۔

دو طرفہ توازن

تمام اجزائے وجود اور موجودات ہستی اپنی داخلی ترکیب میں اور ایک دوسرے سے روابط میں ایک مضبوط نظام کے تابع ہیں۔ ان کی ترکیب اور باہمی رابطہ کچھ اس قسم کا ہے کہ ہر ایک سر کو اس کے مقصد اور پیش نظر خط سیر میں مدد دیتا ہے۔ اور ہر موجود اپنے اس رابطہ کے ذریعہ جو دیگر موجودات سے رکھتا ہے اپنے ہدف و مقصد کی طرف خود سیر کر سکتا ہے۔

علم مادی کا سب سے بڑا کام اس دنیا کے ظواہر و کیفیت کی شناخت ہے۔ لیکن مخلوقات کی ماہیت و حقیقت کی شناخت علوم مادی کے دسترس سے باہر ہے۔

مثلاً ایک دانشمند ہلکی زیادہ سے زیادہ رہتا سکتا ہے کہ فضا میں کروڑوں کرات موجود ہیں بعض ثابت ہیں بعض متحرک ہیں اور بتا سکتا ہے کہ قوتِ جاذبہ سیاروں کو آپس میں گرا جانے سے روکے ہوئے ہے اور ان کے توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور بات کے ذریعہ سیاروں کا زمین سے حاصل زمین کی سرعت رفتار اور سیاروں کا حجم بتا سکتا ہے لیکن ان تمام تجربوں کا نتیجہ صرف سطحِ آخری کے ظواہر کی تفسیر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ قوتِ جاذبہ کی حقیقت اور مرکزی طاقت کی ماہیت اور ان کی پیدائش کی کیفیت بتانے سے یہ علوم مادی عاجز ہیں۔

مادی علمائے سیارہ اور مشین کی تفسیر تو کرتے ہیں لیکن ان کا محرک کون ہے؟ اس کی تفسیر نہیں جانتے۔ اسی لئے مادی علوم ان کروڑوں حقایق سے ناواقف ہیں جو طبیعت اور نفسِ انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ یہی انسان جو فطرت کے باطن تک پہنچ گیا ہے، ایک ذرہ حیاتی کے پیچیدہ اسرار و غوامض کے مقابل میں عاجز ہے۔ مختصر یہ کہ علوم مادی کے ماہرین ان اسرار کے کشف و تفسیر سے درماندہ رہ گئے ہیں۔

آفتوش ہستی کے مجاہدات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دوطرفہ تواریق ایسی دو چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے ہم نمانہ بھی نہیں ہیں۔ اور یہ مماثلگی ایک ایسی کیفیت ہے کہ جس کا تعیُّر ابھی سے ایک آنے والے کے لئے کر دیا گیا ہے۔

اس مماثلگی کا بہترین نمونہ مادر و فرزند میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ ماں سخواہ وہ کسی انسان کی ہو یا کسی دوسرے جاندار کی ہو۔ کے حاملہ ہوتے ہی دودھ کے ہر منوات اپنا عمل شروع کر دیتی ہیں اور کچھ جتنا جتنا رحم مادر میں بڑھتا جاتا ہے یہ ہر منوں بھی رو بہ افزائش ہوتے رہتے ہیں۔ اور جب وضع حمل کا زمانہ آجاتا ہے تو مولود کی غذا دودھ کی صورت میں۔ جو بچہ کے تمام جسمانی اعضاء کے مناسب ہوتا ہے۔ تیار ہو جاتی ہے۔ اور پہلے سے تیار شدہ غذا بچہ کے ضعف یا قہم کے لئے بہت ہی مناسب ہوتی ہے۔ اور ایک پورٹ یہ وہ مناسب خزانہ۔ پستان میں محفوظ رہتی ہے۔ اور یہ خزانہ بچہ کی پیدائش سے سالہا سال پہلے ماں کے جسم میں بدولت کر دیا جاتا ہے اور غذا کو آسان بنانے کے لئے پستان کے نوک میں چھوٹے چھوٹے سودا خ ہوتا ہے جس جو بچہ کے دہن کے لئے نہایت موزن ہوتے ہیں کیونکہ بچہ میں ابھی اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ کھلا لگے دودھ اس کے گھے میں انڈیل دیا جائے۔ بلکہ ان سودا خوں کے ذریعہ اپنی غذا چوس چوس کر مکمل کرتا ہے۔ بچہ جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی حساب سے شیر مادر میں تغیرات پیدا ہوتے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اطباء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نومولود بچہ کے لئے اس صورت کا دودھ قطعاً نقصان دہ ہے جس کے یہاں ولادت کو ایک مدت گزر چکی ہو۔

یہاں پر قدر تا ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مستقبل میں آنے والے موجود کے لئے بہت پہلے سے ایک دوسرے موجود میں اس کی ضرورت کا لحاظ رکھا گیا ہے کیا یہ عمل ایک پیش بینی اور وقت و تدبیر پر مبنی نہیں ہے؟ اور یہ مستقبل بینی اور عجیب و غریب حکمت ایک قادر قویٰ عالم مدبر کے بغیر ممکن ہے؟ اور کیا یہ قدرت بے پایان کی وسیل نہیں ہے؟

تمام مشینی اور صنعتی وحدتوں میں جو محاسبہ اور وقت ہم دیکھتے ہیں یہ ان افکار و اعمال کا نتیجہ ہے جو اس کی تنظیم و ترکیب میں استعمال کئے گئے ہیں اور انہیں معنی مشاہدات کے بموجب ہم

ایک کمی فلسفی نتیجہ آک پہنچ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی حساب و موازنہ کی بنیاد پر کوئی نظام ترکیبی پایا جائے وہاں ہم کو ضرور غور کرنا چاہئے کہ اس کے پیچھے کوئی عقل و فکر و ارادہ یقیناً کار فرما ہے۔ جو مخصوص باریکی ہم صنعتی وحدتوں میں دیکھتے ہیں۔ موجودات طبیعت اور ان کی ترکیب تالیف میں اس سے کہیں زیادہ دقیق تر اور سگفت انگیز تر دیکھنے ہیں۔ بلکہ جو تدریج سر بلند و تدریج طبیعت میں دیکھتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی اس نام نہ نہ زہانت اور بشری افکار میں نہیں پایا جاتا۔

لہذا جب ہم — بغیر کسی شک و تردید کے — اپنے صنعتی نظام کو افکار و ارادے کو نتیجہ مانتے ہیں تو کیا نہ سہ و محاسبات دقیقہ کے جھروکوں سے طبیعت میں مکمل و ارادہ اور لامتناہی علم نہیں دیکھ سکتے؟

علم طب کا کارنامہ

آج کے دور میں علم طب اپنے ترزا کے اس دور میں داخل ہو چکا ہے جہاں ایک انسان کے پہلوئے اس کا گروہ نکال کر دوسرے انسان کے پہلو میں جس کا گروہ خراب ہو گیا ہو اور قریب مرگ ہو — نگار اجاتا ہے۔ طب کی ترقی کسی ایک طبیب کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ ہزاروں سال کے الطباء کے تجربات کی میراث ہے۔

پس حقیقت یہ کامیاب آپریشن سبھوں کے تجربات کا نقطہ آخر ہے پہلے کے حکماء نے اس کے متعدد فوائد کئے اور اب نتیجہ ظاہر ہوا یعنی حکماء کے چند ہزار سالہ افکار و خیالات کو اکٹھا کرنے کے بعد گردوروں کا کامیاب آپریشن ہو سکا ہے۔

کیا یہ کم ہیلم دانش کے بغیر انجام پاسکتا تھا؟ بدیہی طور پر جواب منفي طور پر ملے گا۔ مفکرین اور انسانی طاقتور دماغ نے جب چند ہزار سال تلاش و جستجو کیا تب گردوں کا عقل و انتقال ممکن ہوا۔ یہاں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ایک کار کا ٹائرس کھول کر اس کی جگہ دوسرا ٹائرس لگا دیں تو ٹائرسوں کا بدلنا زیادہ اہم کام ہے یا ٹائرسوں کا بنانا دونوں کاموں میں کس کام کے لئے زیادہ علم و دانش کا ضرورت ہے؟ ظاہر ہے ٹائرس بنانا زیادہ مہارت چاہئے ہے۔

اسی طرح دینائے طب میں گردوں کا بدل دینا چاہئے کتنا ہی اہم معاملہ ہو لیکن گردوں کا خلق کرنا اس سے کمین زیادہ اہم ہے جیسے ٹائرس بدلنے سے زیادہ ٹائرس بنانا مشکل ہے۔

آپ بتائیے وہ کون سا عقلمند ہے جو یہ فیصلہ کرے گا کہ ایک گروسے کا بدلنا ہزار سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے لیکن خود گروسے کا بنانا کوئی اہم کام نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک فطری بات ہے جس کے پاسرہچوں والی عقل بھی ہوگی وہ بھی گروہ خلق کر سکتا ہے کیا کوئی صاحب عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے؟

کی طبیعت کی خلقت کے لئے ایک عقل مدبر کا وجود فرض کر لینا ایسے مادہ کو خالق فرض کر لینے سے بہتر و قریب تر نہیں ہے کہ جو مادہ عقل و شعور ہی نہ رکھتا ہو اور نہ اس میں ابداع و اختراع کی صلاحیت ہو؟ یقیناً خالق کی حکمت پر ایمان و عقیدہ عقل و منطق کے کہیں زیادہ قریب ہے نسبت اس کے مادہ غیر مدبر کہ غیر داعیہ جو تدریس کے قابل نہیں ہے اس کو خالق مانا جائے کیونکہ تمام وہ خصائص و اوصاف عقیدہ جو اس دنیا کے ذائقہ کے لئے ثابت ہیں ان کو مادہ کے لئے کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے مثلاً خالق عالم تدبیر دار اور داناستے اور مادہ میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں!

آئنسٹائن (EINSTEIN) اپنی کتاب "جودنیا میں دیکھ رہا ہوں" میں تحریر کرتے ہیں: ایک عالم مصلح عالم وجود کے لئے قانون غیرت کا عقیدہ رکھتا ہے لیکن اس دانشمند کا مذہب کیا ہے؟ اس کا مذہب ایک تجریم صاف اور ہے جو کائنات کے عجیب و دقیق نظام کی وجہ سے ہے۔ یہ نظام کس کے بعض اسرار کا پردہ کھینچتی اٹھ جاتا ہے اس کی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسمیٰ اور منظم بشری افکار اس دقیق نظام کے مقابل میں مثل مچھوٹے تصاویر کے ہیں۔

لے دنیا کے کرمی رنم

طبیعت کی طرفت کاریاں

ذرا ایک طیر یا کے پھر کو اپنے پیش نظر رکھئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام آلات تجربہ آپ کے پاس ہوں! نہیں نہیں صرف عادی و معمولی نگاہ ڈال کر دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ اس تھیں سی چیزیں کتنا پیچیدہ اور دقیق نظام کار فرما ہے! اس حجب و غیب موجود کے اندر ہر تمام ضروری آلات و وسائل موجود ہیں مثلاً نظام ہضم، گردش خوں، سلسلہ اعصاب و سنگہ نفس، یہ سب ساری چیزیں اس میں موجود ہیں۔ اس کے اندر ایک باقاعدہ راستہ تجربہ گاہ موجود ہے جو بڑی وقت و سرعت کے ساتھ اپنے ضروری مواد کو اکٹھا و مہیا کر رہی ہے۔ آپ کی بڑی بڑی تجربہ گاہیں کس قدر میں؟ اور ان کے بنانے میں انسانی، مکاری، اقتصاد، عاقلیتیں کتنی صرف ہوئی ہیں؟

اپنی تجربہ گاہ کا اس پھر کے تجربہ گاہ سے مقابلہ کیے تو پہلے چلے گا کہ آپ کی تجربہ گاہ میں وہ وقت و سر و ظرفت ہرگز نہیں ہے جو پھر کے تجربہ گاہ میں ہے۔ کتنے غور و فکر اور تجربوں کے بعد ایک پھر کے کاٹنے کا علاج تلاش کیا گیا ہے یہ سب لوگ جانتے ہیں۔

اگر آپ کوئی کام انجام دینا چاہیں تو اس کے لئے ہر طرح کی فکر و دقت نظر ضروری ہوتی ہے تو پھر جب آپ اس عالم مصنوع میں اس وقت و مہارت کے ساتھ اس نظام حکیم کو ملاحظہ فرماتے ہیں تو کیا یا بٹھا عقلی حکمت اختیار بالغہ کی سند نہیں ہے؟

اگر ہم اس کائنات کو جس میں ہر ایک مینی، ہندسہ، اور منظم حرکت ہے — ایک مادہ جا ہلکا مخلوق مابین تو یکہ ہی علمی معرفت کی دیں ہے؟ بلکہ ہم قہین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیزیں ایک مکمل نظم و ضبط کا پتہ دیتی ہیں نہ کہ ان سے بے مقصدیت ہر جہ و مرجع و بے نظمی کا ثبوت ملتا ہے۔

اگر طبیعت میں کبھی شغف نقاط دکھائی دیں تو یہ کتاب خلق الہی میں نقص کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی

وجہ ہمارے افکار و ادراک کی مقصدِ اصلی تک نارسائی ہے اور عالمِ اسرار و رموز کے سمجھنے سے ہماری عقلوں کی کوتاہی ہے۔

اگر ہم ایک عظیم دستگاہ میں ایک چھوٹے سے پیچ کے مقصد کو نہ سمجھ سکیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم انجینئر کو اداں و عباں کہنے لگیں بلکہ دراصل یہ جائی کوتاہی ہے کہ ہم اس پیچ کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیا تصادف و اتفاق فریضہٴ علم کو پورا کر سکتے ہیں؟ اور علم بھی ایسا کہ جہاں ذرہ برابر جہالت و نیک کا شائبہ بھی نہ ہو! اگر قیوں مادہ پرست و کائنات جس میں ایجاد و اختراع کی ہر موجود میں بھرمار ہے اس کا خالق ایسا مادہ ہے جس میں علم و ارادہ کا کوئی دخل ہی نہیں ہے تو پھر انسان اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت تھیں علم میں کیوں لگا آئے؟ اسکو تو چاہئے کہ طبیعت و فطرت کے ساتھ رہ کر مزید جہالت میں اضافہ کرے۔ جو مقصد اس قدر غریب اور بے استقامت افعال و انفعالات کی ہدایت و رہبری کرے اس کے ارادہ و ہدف کا انکار ناممکن ہے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ گمان کر لیا جائے کہ مسلسل ان افعال و انفعالات کا تحقق الہی ارادہ کے بغیر ہے۔

سالہا سال کے تھکا دینے والے علمائے گیمیا کے پروگرام اور لاکھوں تجربات کے بعد یہ حضرات اس قابل ہوئے کہ بہت تھوڑے سے آبی و آزماتشی مواد کو بہت ہی سادہ و ابتدائی طریقے سے اس طرح ترکیب دے سکیں کہ جس میں حیات کامل کا تھوڑا سا بھی اثر نہیں ہے۔

آئی سی سی علمی کمیابی کی بڑی اہمیت دی گئی اور مجالسِ علمی میں اس کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ موجود بہت ہی نامنوس اور بالکل ہی ابتدائی تجرباتی دور میں اتفاق سے ہو گیا ہے اس میں کسی دقت و زبرد نہ توجہ کو دخل نہیں ہے۔ لیکن یہی مادہ پرست علمائے تمام موجوداتِ اندھے مادہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں یہ کتنی عجیبت ہے واقعہ یہ ہے ایسا طریقہ فکر منطقی و افکار و عقل انسانی پر مبنی علم ہے اور حقیقت سے دشمنی ہے۔

ذرا چھاپنا نہیں دیکھئے کہ کتاب کے ایک صفحہ پر حروفِ چینی کرنے میں کتنی زحمت اور دقت سے کام لیتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی جب دوبارہ تجدید نظر کرتے ہیں تو بعض غلطیاں مل جاتی ہیں جو معمولی سی غفلت کی وجہ

ہوگی تھیں اب اگر حروف یعنی کرنا یا مختلف حروف کو یکسر ترتیب وار لگانے کے بجائے کسی چیز میں سارے حروف اکٹھا کر کے صفحہ پر ایک مرتبہ الٹ دے تو کیا حروف و کلمات و معانی کے لحاظ سے پورا صفحہ بغیر کسی غلطی کے مرتب و منظم ہو کر ہمارے سامنے آسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔

اس سے بھی زیادہ کمزور بات اسی شخص کی سے جو یہ کہے: ایک فوننی سے پگھلا ہوا ٹانہ تیار سو کو گرا اور اس سے خود بخود حروف بن گئے اور پھر ایک اندھی چلی جس سے ایک معدنی صفحہ پر یہ حروف ترتیب وار خود بخود جم گئے اور اس طرح ایک ہزار صفحہ کی کتاب جو دقیق علمی مباحث اور شیریں و جذبات عبارت پر مشتمل تھی بغیر کسی نقص و کمی کے وجود میں آگئی۔ کیا کوئی بھی صاحب شعور اس نظریہ کو قبول کر سکتا ہے؟

۱۰ مادہ پرست علماء فطرت کے ان حروف سے بنی ہوئی مختلف و متنوع تعادیر کے بار میں کیسے کہتے ہیں؟ اور آسمانی کرات اور طبعی موجودات اور تمام متحرک سیاروں کے بار میں یہ مادہ پرست کیسے کہتے ہیں؟

۱۱ رتھر فورڈ (RUTHERFORD) ایک مشہور عالم کہتا ہے: کائنات آکسیجن، آزت اور ہیدروجن کے ذرات کا دفعہ پر دہنی وحدت کے لئے جمع ہو جانا ناقابل تصور ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ تم ش کے پتوں کو فضا میں اڑاؤ اور پھر کہیں کہ یہ مینہ ہو خود بخود ترتیب کے ساتھ جمع ہو گئے یہ قطعاً محال ہے۔ اور اگر یہ عمل بشریت کے حوالہ سے دیکھا جائے تو ترتیب کے لئے بھی دہرایا جاتا ہے یعنی میں غلط مدعا ناممکن ہوتا۔

۱۲ کیمروف تکیوں — ایٹم اور ان کے شکیں و بندہ اجزاء — کی امیریت چہاں نہانہ کے حروف کے نام سے ہے؟ کیا یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ یہ منظم و پر معنی حروف اور یہ دقیق بندہ اور کتاب نصرت کی یہ تصویریں مادہ باندگی پیدا کر رہی ہیں؟ اور اس کائنات میں ایک عظیم

۱۳ انسانی جہان میں یہ ہے تو بھیجیئے میں دھن ہوئی ہو کر آکسیجن اور خارج ہونے والی ہوا کو آرت کہتے ہیں۔
۱۴ دانستنیہای جهان مہم۔

حالت اور معجزانہ نظام کے خالق کا وجود نہیں ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! بلکہ یہ تمام موجودات ایک قدرت کا حد کی مخلوق ہیں جس کو ہم خدا کہتے ہیں!

مادہ کے باطن میں جو قوت و دیوت کی گئی ہے اگر یہ اس نقل کل کا اثر نہیں ہے جو اس کائنات کا مکمل ہے تو ہر کون سی چیز ہے جو وہ کہنا منقبض اور منبسط رکھے ہوئے ہے؟

اگر وہ طاقت ایک بے عقل عامل اور قادر ارادہ آگاہ نہ ہے تو یہ مردہ بے نفلی میں کیوں نہیں داخل ہو جاتا؟ اور ان موارد کی تشکیل و ترکیب کو تصادم و نابودی کی طرف کیوں نہیں لے جاتا۔

یقیناً ایمان بالہدای تمام وجودات کے لئے معنی عطا کرتا ہے اور تمام عالم کے لئے مفہوم و معنوی بخشتا ہے۔ صاحبان عقل اور فکر عین رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک عظیم قدرت معلق ہے جو ان موجودات پر حاکم ہے اور اس نظام کو افراد و تفریط سے بچا رہا ہے۔

موجود مطلق کا تصور

پہلے زمانہ میں ہر شخص بذات خود اپنے مرکوب کی ہدایت کرتا تھا اور اپنے کنٹرول میں رکھتا تھا اور انسان ادوار مختلفہ میں اس بات کا عادی ہو چکا تھا کہ اپنی نزاعت، زمین، ادارہ کی خود دیکھ بھال کیے — لیکن آج زمانہ بدل گیا ہے آج کا انسان چاند تک پہنچ گیا ہے۔ آٹومٹک الکٹرانک مشینیں، بغیر پائلٹ کے کڑنے والے ہوائی جہاز اس کے دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ ہر منٹ جانتا ہے کہ ایسے آلات بنائے جاسکتے ہیں جو حادثات کا خود بخود مقابلہ کر سکیں اور اس کا بنانے والا اور چلانے والا چاہے سامنے نہ بھی ہو۔

جب یہ صورت حال ہے تو پھر ہم کو یہ غمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم خالق کائنات کا صرف اس لئے انکار کر دیں کہ وہ ہم کو دکھائی نہیں دیتا۔ یہ تو ہمارے افکار و افہام کی کمی ہے اس سے وجود خدا تو متاثر نہیں ہوتا؟

اگرچہ ایک بہت ہی ناقص تشبیہ ہے مگر افہام مقصد کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ مصنوعی چاند بنانے والا یا راکٹ بنانے والا زمینی اسٹیشنوں سے ان کو فضا میں چلاتا ہے اور خود زمین سے کنٹرول کرتا ہے۔ دیکھنے والے راکٹ و چاند کو دیکھتے ہیں، کنٹرول کر نیوالہ دکھائی نہیں دیتا و بتا تشبیہ، اسی طرح خدا انعام کائنات کو چلاتا ہے۔ مگر ہم دیکھ نہیں سکتے؛ ہم جن نواہر آیات میں شہادہ کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ چیزیں خالق عالم اور صنائع انسان کی عظمت کے آثار ہیں تو کیا اس مشاہدہ کے باوجود ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس کائنات کے مدبر کا انکار کر دیں کہ جو صاحب قدرت اور ارادہ مطلق ہے اور جو اس کائنات کے تمام حرکات کا منظم کر نیوالا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ ایسے موجود کا پہچانا جس کا سرحد جس اور اقیسم شعور میں کوئی

نمود و مثال نہ ہو اور بشری تعبیرات اس کے وصف دقیق کو بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ ہمارے لئے ناممکن ہے کیونکہ ہمارے امکانات محدود ہیں اور چراغ عقل اس راستہ کو روشن کرنے سے بھوت ہے اسکی روشنی مادہ کے محدودیات کے دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے۔

ہمارے ارتباطات صرف ظاہر حیات تک محدود ہیں جو صورتِ خارجہ ذہنوں میں ترسیم ہوتی ہے وہ اس کائنات کی کوئی نہ کوئی عین ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم کسی طرح بھی اس کی معرفت حاصل ہی نہیں کر سکتے۔ جو معرفت ہمارے لئے لازم ہے اس میں اور چارے درمیان کوئی مانع موجود نہیں ہے۔

کچھ شک پسند افراد جو اس فکرِ سیم سے "جو فطرتِ سلیم سے پیدا ہوتی ہے" اعراض کرتے ہیں اور جو آثارِ طبیعت کے خواہر ہو چکے ہیں وہ ہر وقت خداوندِ عالم کی طرف سے اظہارِ معجزہ کا انشعاب کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ معجزہ کے ذریعہ خدا پر ایمان لائیں اور اس کے وجود کے قائل ہو جائیں۔ مگر یہ لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ خدا کی طرف سے جسے بھی آثارِ ظاہر ہوتے ہیں وہ تھوڑی ہی مدت کے بعد عادی ہو جاتے ہیں اور فطرتِ بن جاتے ہیں جسکی طرف کوئی توجہ بھی نہیں دی جاتی۔ تمام ظاہر — اگرچہ وہ نظامِ طبیعت کے اجزاء ہیں — ابتدا میں خوارق و معجزات معلوم ہوتے ہیں لیکن جتنا جتنا دور گزرتا جاتا ہے وہ عادی اور طبعی ہوتے جاتے ہیں۔

لیکن وہ وجود جو غیر محسوس اور غیر مرئی ہو اور جو صفاتِ جلال و جمالِ قداس و عظمت سے ملو ہو وہ ہمیشہ نفوس کو تحتِ تاثیر قرار دیتا ہے اور اپنی طرف ہر اہتمام و توجہ کو جذب کر لیتا ہے اور انسان کو ایسا بنا دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسکی طرف توجہ رہے اور ہر چیز کی امید اس سے وابستہ کیجے البتہ لہجہ و داور کی روح کا تسلسلہ غیر منطقی بنیاد پر انسان کو محدودیت کی زنجیروں میں گرفتار کر دیتا ہے۔ ورنہ اس نظامِ کائنات میں ہر موجودان لوگوں کو قانع کر سکتا ہے جو اپنی حقوں کو لہجہ و توجہ اور مکابہ سے خالی رکھیں۔

ELMER W. MAURER ڈاکٹر (رائز) ڈیویس مور، جو بہت ہی مشہور اور محکم کیا کے ہر

تھے، کہتے ہیں، میں ایک عالم کہیا ہونے کے ناطے اس بات کا عقیدہ رکھتا ہوں کہ خدا کائنات کی ہر شے نگرانی اور حفاظت کرتا رہتا ہے اور قوانین فطرت کے دائمی ہونیکا سبب ہی الہی نگرانی ہے۔ میں جس وقت اپنی تجربہ گاہ میں قدم رکھتا ہوں۔ بغیر کسی شک و تردید کے اس بات کا عقیدہ رکھتا ہوں کہ جو قوانین کل تک ثابت تھے وہ آج بھی ثابت ہیں۔ اور کل و پوسوں بلکہ قیامت تک ثابت رہیں گے ورنہ تجربہ گاہ کے اندر میری زندگی حیرت و شک و غلط فہمی کی زندگی ہو جائے۔ اور ہم کسی بھی نتیجہ تک نہ پہنچ سکیں۔ مثلاً اگر میں اپنے تجربہ گاہ میں ایک برتن کے اندر پانی بھر کر آگ پر رکھ دوں تو جب اس میں جوش آجائے تو مجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی حرارت تدریجاً درجہ سنٹی گریڈ پر پہنچ گئی ہے اور مجھے کسی حرارت ناپنے والے آلہ کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جب فضا کا دباؤ ۷۶ سنٹی میٹر ہو تو آب خالص تدریجاً درجہ سنٹی گریڈ میں پہنچ کر جوش کھانے لگتا ہے اور اگر دباؤ ۷۶ سنٹی میٹر جوہ سے کم ہو تو پانی کے جوش میں آنے اور بخار بن جانے کے لئے کم حرارت کی ضرورت ہوگی اور جوش کھا جانے کے لئے درجہ حرارت محدود درجہ سے کم ہوگا اور اگر فضا کا دباؤ ۷۶ سنٹی میٹر سے زیادہ ہوگا تو درجہ حرارت بھی سو سے زیادہ ہوگا۔

اور میں جب بھی جانتا ہوں اس تجربہ کی تکرار کرتا ہوں اور عمل کرتے کہتا ہوں جب بھی دباؤ اور حرارت کے رابطہ کو اپنے روزانہ کے کاموں میں اپنی ذہانت اور ہوش سے استعمال کریں گے تو ان کی حیرت میں اضافہ ہی ہوگا۔

۔۔۔ یہی صورت تمام قوانین صیغت کی ہے اور صحیح منطق فیصلہ کرتی ہے کہ یہاں پر کوئی ایب مدبر ضرور موجود ہے جس نے ان قوانین کو ایب دیکھا ہے اور وہی خدا ہے۔ اس صیغت کی صفت اور اس کے ثابت و مستمر نفع کا صحیح جواب صرف خدا کے وجود کا عقیدہ ہے۔

لہ جوہ ایک مضمون مایع ہے جو میزان انحراف میں استعمال ہوتا ہے ہولکے دباؤ کے لحاظ سے اوپر نیچے ہوتا دہلے اس کو پارہ بھی کہتے ہیں۔ لہ اثبات وجود خدا ص ۲۴۹

خدا علت سے بے نیاز ہے

خدا علت سے بے نیاز ہے اس مسئلہ میں بیروانِ محکمہ دینی مخصوص حساسیت کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: جب ہم نے یہ مان لیا کہ کائنات میں واجب الوجود صرف اللہ ہے اور دیگر تمام موجودات اپنے وجود میں اس کی مدد چاہتے ہیں تو خود خدا علت سے کیوں بے نیاز ہے یعنی اس کے وجود کی علت کیا ہے؟

برٹراند رسل (BERTRAND RUSSEL) نے لندن میں ایک غیر مذہبی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا: میں اپنی عمر کی انھارھیں منزل میں استوارت میں (STAVRT MILL) کی خود نوشت سوانح حیات پڑھ رہا تھا تو اس میں میل کے ایک جملہ نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور وہ جملہ یہ تھا کہ میرے باپ نے میرے سوال مجھے کس نے پیدا کیا ہے؟ کا جواب نہیں دیا کیونکہ میں نے فوراً دوسرا سوال کر دیا تھا کہ پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟ یہ کہتے ہوئے رسل نے کہا: اس سادہ سے جملہ میں آج بھی میں فکر کرتا ہوں اور میرا خیال ہے اس جملہ نے میانِ اولین علت و دلیل میں مضطرب کام لیا ہے کیونکہ جس طرح ہر چیز کے لئے علت و دلیل ضروری ہے پس وجود خدا کے لئے بھی علت ہونی چاہئے اور اگر کوئی چیز علت و دلیل کے بغیر وجود میں آ سکتی ہے تو وہ چیز خدا بھی ہو سکتی ہے اور دنیا بھی اور اس طرح یہ بحث فائدہ الاغبار ہو سکتی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ بہت سے خدا شناس مغربی فلسفی اس اشکال کو حل نہیں کر سکے۔
ہربرٹ اسپنسر (HERBERT SPENCER) انگریزی فلسفی اس مسئلہ میں کہتا ہے: مشکل یہ ہے

نہ چر سی بیستم ۱۹

کہ عقل بشر ایک حرف تو ہر چیز کی علت تلاش کرتی ہے اور دوسری طرف دور و قسلس کو محال مانتی ہے اور علت بے علت کو بھی نہیں مانتی اور نہ سمجھتی ہے جیسا کہ پادری جب بچہ کو تعلیم دیتا ہے اور کہتا ہے : دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے اور بچہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ہے ؟

اور دوسری جگہ لکھتا ہے : دعوویوں کی کوشش یہ ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہوں کہ دنیا بابت قائم بذاتہ ہے اور ازلی ہے۔ لیکن ہم کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کر سکتے جو بے آغاز اور بے علت ہو۔ اور خدا پرست اس سلسلہ میں ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہتا ہے : اللہ نے ہی دنیا کو پیدا کیا ہے اور جب بچہ سوال کرتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ہے ؟ تو یہ لا جواب ہو جاتا ہے۔

ہم سبھی اعتراض مادہ پرستوں پر کرتے ہیں کہ اگر ہم سلسلہ عمل کا تتبع کریں تو علت اولیٰ تک پہنچیں گے ہم یہ نہیں کہتے کہ علت اولیٰ خدا ہے بلکہ مادہ ہے اب تم بتاؤ مادہ اولیٰ کو کس نے پیدا کیا ؟ تم لوگ فونی عینت کو بتوں کرتے ہو اس لئے مجھے بتاؤ کہ ہر چیز تو مادہ اولیٰ سے ہے مگر یہ مادہ اولیٰ کہاں سے آیا ؟

تم کہتے ہو مجدد حوادث کی بازگشت مادہ اور طاقت اولیٰ کی طرف ہے ؛ ہمارے سوال کرتے ہیں : اس مادہ اور طاقت اولیٰ کے وجود کی علت کیا ہے ؟ اور سلسلہ عمل و معانی الیٰ ما لا یتہائم کو کہاں ہتے ہوئے ای کے پاس اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کہیں : مادہ موجود انہی ایک ہے اس کو علت کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس کا اول ہے نہ آخر یہ مادہ قدیم ہے اس کی انتہا نہیں ہے اور اس کا وجود ذاتی ہے۔

پس مادی حضرات اصل ازیست کے قائل ہوں گے اور ان کا عقیدہ ہوگا کہ تمام چیزیں مادہ ازلیہ سے ہیں اور ہستی اس کی جمیعت سے ہوئی ہے، اس کو کسی موجد خالق کی ضرورت نہیں ہے۔

لے بریکٹ دہ لوبا ص ۱۷۷

لے دہ رنکھنہ ویل ڈورانت ۱۹۷۵ ص ۲

رسل (RUSSEL) نے اپنی تقریر — جس کا ذکر ابھی کچھ پہلے ہوا ہے — میں کہا ہے: ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے یہ چہ بچے کہ دنیا کی ابتداء تھی یا اس کا اول تھا۔ ہر چیز کی ابتدا کا ہونا ضروری ہے اس موضوع پر غور و فکر کرنا درحقیقت ہمارے تصورات کی قدرت میں نقص دہی ہے۔

جس طرح رسل مادہ کو ازلی مانتے ہیں اسی طرح خدا پرست اللہ کو ازلی مانتے ہیں پس وجود ازیت کا توں خداوندی والہی کے درمیان نقطہ مشترک ہے اور دونوں گروہ یکساں حور سے علت اولیٰ کو قبول کرتے ہیں پس فرق اتنا ہے کہ خدا پرست علت اولیٰ کو حکیم مدبر قادر مرید مانتے ہیں (یعنی فعل اور مادی حضرات علت اولیٰ کو بے فعل وبے اوراک مبدع ارادہ مانتے ہیں لہذا اگر خدا کو نہ بھی مانا جائے تب بھی اشک بقی رہتا ہے۔

مادہ محل حریت و تغیر ہے۔ اسکی حرکت اندرونی ذاتی اور دنیامیکی ہے اور ازلی چیز حرکت ذاتی کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتی۔ مادہ اور ثبوت ذاتی دو الگ الگ چیزیں ہیں ایک جگہ پران کا بیج ہونا محال ہے جو چیز ذاتی حور سے ثابت الوجود ہے اسکی حیوت و ذات کا محل قبول حرکت ہونا ناممکن ہے۔

مارکسی (MARXIST) خود معترف ہیں کہ مادہ خود اپنی ہی کرتا ہے (آئینی تن) پھر اسکو یہ لوگ کیونکر ازلی مانتے ہیں؟ ازیت کا مطلب ثبوت ذاتی اور (امتناع انفرادی سے ماننا) مادہ بذات خود نسبی استعدادات اور قوی کا مالک ہے اور مردہ و زندہ ہوتا ہے۔ ازیت کسی بھی طرح مادہ کے مناسب نہیں ہے نہ اس کے وجود میں اور نہ لوازم ہیت میں۔ لیکن مذاپرست

لہ جزا سیسیستم

لہ مادہ حضرات کی تفسیر کو نہ پر تمام جملہ اے ہستی کی تفسیر تو آئینی تن و سنختر کی بنیاد پر کرتے ہیں اور کہتے ہیں معنوں یعنی علت سے وجود میں آتا ہے اور معنوں اپنی علت کی نفی میں ہوتا ہے۔ اور اس کی مثال مٹی کے اٹھنے اور اس کے بچے سے مٹی پر

جب اصل ثابت معلق کے وجود کے قائل ہیں تو ان کا یہ دعویٰ اس وجود کے لئے ہے جو ثابت طریق کو قبول کرتا ہے اور خصائص مادہ سے بالکلیہ بعید ہے۔ ان کا دعویٰ مادہ کے لئے نہیں ہے جو مادی طور سے بقا کو قبول نہیں کرتا اور نہ ازلیت و دوام ہی قبول کرتا ہے۔ اور جو نسبت و حرکت سے جدا نہیں ہوتا اور فعلیت تام و اطلاق سے مغایرت رکھتا ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

ہر موجود محتاج علت ہے۔

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ کسی موجود کا وجود علت کے بغیر ممکن نہیں ہے اس کا مطلب وہ موجود ناقص ہے جس کی مصلحت و بقا ضرور ہوں علت ہے۔ یہ قاعدہ ہر موجود کے لئے نہیں ہے یعنی اگر کوئی موجود نقص و محدودیت سے پاک ہو اور بذات خود واجد واقعیت ہو تو اس کے لئے یہ قاعدہ نہیں ہے۔

علت اولیٰ صرف اس لئے علت اولیٰ ہے کہ اس کا وجود کامل و غیر محدود ہے اور کسی عامل سے متاثر نہیں ہے بلکہ وہ ایک غیر متروک و موجود ہے اور ہر قسم کے علاقہ و رابطے مستغنی ہے تغیر و تحوّل کا اس میں کوئی اثر نہ ہوگا۔

خدا کے علت اولیٰ اور علت سے بے نیاز ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ محتاج الیٰ احد ہونے میں تو تمام موجودات کا مادی ہے لیکن اس قانون سے بھروسہ استناد و تخیل اس کو الگ کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ معدوم ہی نہیں ہے تاکہ کسی علت کا محتاج ہو اور نہ وہ حادث ہے جو کسی محدث کا محتاج ہو بلکہ تمام صور و خواہر و حوادث اسی موجود ازلی سے موجود ہوئے ہیں۔ قانون عینت صرف ان موجودات کے لئے ہے جو مسبوق بالعدم ہوں۔

اسی طرح علت اولیٰ کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اسی نے اپنے کو پیدا کیا ہے اور وہ خود ہی اپنی ذات کی علت ہے۔ ہمیشہ مسنون کے مستأجل الیٰ العلة ہر نیک سبب اس کے نوع وجود و کیفیت کے تابع ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی موجود اپنے وجود کے لئے علت کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ علت کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ اس کا وجود دوسرے سے متعلق و مرتبط ہوتا ہے ورنہ موجود غیر مشروط دوسرے غیر مرتبط قانون عینت کے دائرہ باہر ہوا کرتا ہے۔

اس توفیق کے بعد اب اگر کوئی موجود اپنے کمال اور فائے ذاتی کی بنا پر علت سے بے نیاز ہو تو علت نے اسکو اس مرتبہ میں ہرگز قرار نہیں دیا جس میں وہ ہے اور نہ ہی کوئی علت اس میں دخلت کر سکتی ہے۔ علت ذاتی کا وجود عین ذات ہے۔ بخلاف دوسرے وجودات کے ان کا وجود بطور اضافہ و عارضیت ہے۔ خروج من العدم الی الوجود ہی علت کا محتاج بنانا ہے۔

اور یہ کیونکر تصور کیا جاسکتا ہے کہ وجود خدا کا عقیدہ ناقض میں پھنس جانا ہے اور اگر ایسا تو کیا کسی معنوں کے بے علت ہونے کا عقیدہ (جیسے وہ) تناقض میں پھنس جانا نہیں ہے؟ ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں کی ہر شے معرفتی تغیر و تحول و فنا میں ہے اور فنا و مقہوریت اس عالم کے تمام اجزاء کا مقدر بن چکی ہے۔ فقر و استیصالی اغیر ہمارے نفوس کے گہرائیوں میں جڑ بکڑ چکا ہے۔ زمین و آسمان کے تمام موجودات میں بھی فقر و نیاز کا دور دورہ ہے اور یہ احتیاج ہمارے سر پائے ہستی پر محیط ہے کیونکہ ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے اور ہمارا وجود ہماری ذات سے نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم نہ تھے پھر ہم کو لباس وجود پہنایا گیا تو ہو گئے۔ اور بدون شک ایسے موجودات کی پیدائش ذات ہستی بخش سے ربط پیدا کئے بغیر غیر ممکن ہے۔

البتہ اذلی وابدی واجب الوجود جس کا وجود ذاتی ہے جس کا نہ اول ہے نہ آخر اس علت کی ضرورت نہیں ہے۔

فلسفین علت کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی شے کو عدم سے وجود میں لائے اور ایسی ہستی پنہائے اور مادی علتوں میں اس کی قدرت نہیں ہوتی اور مادہ کا کام صرف اتنا ہے کہ پہلی صورت کے ختم ہونے کے بعد نئی صورت کے قبولیت پر آمادہ ہو۔ یہ درست ہے کہ موجود مادی اپنی ذاتی تحول و تغیر کی بنا پر ہر لحظہ ہویت جدیدہ پاتا ہے جو سابقہ سے مختلف ہوتا ہے مگر یہ ذاتی حرکت اور مسلسل حدوث و زوال ہمیشہ دست حرکت آخری کا محتاج بنا رکھتا ہے۔ ایسا دست حرکت آخری جو کاروان شتا بندہ کائنات کو جڑوں سے اگاتا ہے اور قافلہ وجود کو آگے بڑھاتا ہے۔

سلسلہ علل کا متبع

اگر مادی حضرات حقیقت کا انکار کریں اور ایک دوسرے مغالطہ کا سہارا لیکر کہنے لگیں کہ ہم سلسلہ علل کو کسی جگہ پر روکتے ہی نہیں اور لامتناہی مدت تک اس کا سلسلہ باقی رکھتے ہیں تو اس مغالطہ کا جواب اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ جہاں آفرینش کا اس طرح تحلیل و تجزیہ کرنا وہی علت و معلول کے تسلسل کو قبول کرنا ہے کیونکہ ہر ایک کا ذاتاً معلول ہونے کا مطلب فاقہ الوجود ہونا ہے اور علت فوق کے بغیر ان میں سے کوئی بھی دارائے وجود نہیں ہے۔ لہذا اس سلسلہ کے اجزاء فرداً فرداً محتاج و فقیر ہوں گے تو وہ (بغیر علت) عدم سے وجود کی طرف کیونکر آئیں گے اور خود ہی اشیاء کا وجود جو مظاہر حدوث و عجز ہیں کہاں سے ہوا؟ اور غیر متناہی اعداد کے اجتماع سے اتنے بڑے موجودات کا مجموعہ کیونکر حاصل ہوا؟ کیا بے شمار عوامل مرگ کے اجتماع سے زندگی پیدا ہوا کرتی ہے؟

حالانکہ لامتناہی سلسلہ چاہے جتنا آگے بڑھ جائے یہ معلول ہونے ہی کے حکم میں رہے گا تو پھر قہری طور پر ہمیشہ محتاج و فقیر و حادث رہے گا۔ اور یہ سلسلہ اس لیے کہ کوئی بھی سلسلہ جب تک ذاتی طور پر مستقل و غنی نہ ہو یا غنی بالذات المطلق — یعنی وجود الہی — تک منتہی نہ ہو وہ کبھی موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ (صرف وجود الہی ہی ایک ایسی علت ہے جو بغیر معلول کے ہے بشرطیکہ یہ تبصیر صحیح ہو) اور نظام موجودات کی کبھی بھی صحیح تفسیر ممکن نہیں ہے جب تک ایک ایسے موجود کو نہ مانا جائے جو غیر مشروط ہو اور وہی علت العلل ہو اور تمام موجودات کے وجود کی بنیاد۔

فرمائیے محاذ جنگ پر فوجیوں کی ہر گزوی حملہ کرنے سے انکار کر دے اس طرح کہ

جب جنرل کسی ٹکڑی کو حملہ کر نیا حکم دے تو وہ کہے جب تک فلاں ٹکڑی حملہ نہ کرے گی ہم حملہ نہیں کریں گے اور جب جنرل اس ٹکڑی سے کہے تو وہ اس پر ٹال دے کہ جب تک یہ حملہ نہ کرے گی ہم بھی نہ کریں گے یہی حال سب کا ہو تو کیا حملہ ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ ہر ایک نے دوسرے کی شرط لگا رکھی ہے اور ظاہر یہی بات ہے کہ مشروط حملہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک شرط پوری نہ ہو جائے اور شرط پوری نہ ہونے کی بنا پر حملہ بھی نہیں ہو سکتا۔

بالکل اسی طرح اگر سلسلہ علت و معلول کو غیر متناہی مان لیا جائے تو چونکہ ہر ایک کا وجود دوسرے کے وجود پر موقوف ہے اور وہ دوسرا بھی اپنی جگہ تیسرے پر مشروط و موقوف ہے ورنہ تو درحقیقت ہر ایک اپنی جگہ سے جدا بلذکر رہا ہے کہ جب تک وہ دوسرا موجود نہ ہو گا میں بھی لباس ہتی نہ پہنوں گا۔ پس یہ سب کب مشروط ہیں اور شرط کا تحقق ہو نہیں سکتا لہذا ان میں سے کوئی بھی وجود نہیں ہو سکتا۔

لیکن جب ہم کائنات کو موجودات سے بھری دیکھتے ہیں تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کائنات میں ایک ایسی علت ضرور ہے جو دوسرے کی معلول نہیں ہے بلکہ شرط ہے جو مشروط نہیں ہے۔ اور وہ علت اولیٰ تمام امور موجودات سے غنی بالذات ہے۔ عجیب و غریب حوادث پر قادر ہے۔ خلاق و فاطر ہے جب چاہے پیدا کیا اور وہی ذات تمام اجزائے حیات کو وجود بخشی ہے اور اپنے مقصد کے لئے عظیم نظام خلقت کو باقی رکھے ہے۔

ہادی مذہب کے پیروکار یہ چاہتے ہیں کہ عالم کو قدیم مان کر اس کھلے سے دست بردار ہو جائیں کہ کائنات ایک فلاحی کی محتاج ہے۔ اور اس طرح وہ کائنات کو مفہوم مستقل بنادیں۔ حالانکہ کائنات کو قدیم مان کر بھی وہ اپنے حسب منشاء نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات اپنے ابتداء وجود میں خالق کی محتاج ہے اور جب پیدا ہو گئی تو کسی خالق کی ضرورت نہیں ہے۔ مخلوق ہونے کے بعد کائنات اور اللہ دو الگ الگ مفہوم مستقل ہوں گے ایک کو دوسرے سے کوئی ربط نہیں ہوگا۔ اسی لئے ان کی ساری کوشش یہ ہے کہ کائنات کے احتیاج اول کو ختم

کر دیا جائے اور اس طرح وہ اپنے زعم ناقص میں خلقت و خالق کے مسئلہ کا حل ڈھونڈ نکالیں گے۔ اور یہ ثابت کریں گے کہ عالم قدیم ہے وہ خدا کا محتاج نہیں ہے۔

مگر ایسا نہیں ہے بلکہ پیدائش کے بعد کے کائنات اور کائنات کا ہر ذرہ ہر وقت حادث ہے اور جب سارے اجزاء ہر لمحہ حدوث سے متصف ہیں تو مجموعہ بھی حادث ہوگا کیونکہ مجموعہ اپنے اجزاء کے صفات سے الگ کوئی صفت نہیں رکھتا۔ لہذا کائنات کے لئے ابتدائے خلقت میں جو اقبیاح تھیں وہ موجود و مستمر ہے آج تک بھی اور ہر زمانہ میں بھی۔ اور عالم کو قدیم مان کر اس کو خدا سے الگ کر کے مستقل ماننا ممکن ہے۔

عالم حادث ہے۔

جس طرح انسان امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی قوتوں میں کمی محسوس کرتا ہے اور ایکے تاس کے عمر کا چراغ بجھ جاتا ہے اسی طرح سے عالم بھی رفتہ رفتہ فنا کے گھاٹ اترا جائیگا۔

چونکہ کائنات خالی ہے لہذا مادہ کو جو ہر اذی فرض کرنا غیر ممکن ہے بلکہ کائنات کو بھی مخلوق اور حادث ماننا ضروری ہے۔ کیونکہ کائنات میں موجودہ طاقتیں وحدت نوعیت کی طرف گامزن ہیں۔ ذرات طاقتوں میں بدل رہے ہیں اور فعال طاقتیں ساکن و غیر فعال طاقتوں کی طرف بدل رہی ہیں اور جب طاقتیں ایسی طاقتوں کی طرف بدل جائیں گی جو واحد فی النوع کے مساوی ہیں تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ سکونی اور سکون مطلق میں ڈوب جائیں۔ اسی لئے مادہ کو بعنوان ذات یا جو ہر اذی قبول نہیں کیا جاسکتا بلکہ مجموعاً کائنات کو مخلوق ماننا ہوگا۔

اصول تھرموڈائنامکس (PRINCIPLES OF THERMODYNAMICS) کی دوسری اصل جس کو فرسٹ لانگنگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم کو یہ بتاتی ہے کہ چاہے ہم کائنات کی تاریخ پیدائش کو معین نہ کر سکیں مگر اس کائنات کی یقینی طور پر ایک ابتدا ہے کیونکہ کائنات کی حرارت رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے جس طرح لوہے کا ٹکڑا جو آگ میں رکھنے کی وجہ سے سرخ ہو گیا ہو باہر نکالنے پر رفتہ رفتہ اس کی حرارت کم ہوتی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی حرارت فضا کی حرارت کے برابر ہو جاتی ہے۔

اگر کائنات کا کوئی نقطہ آغاز نہ ہوتا تو تمام وہ موجودہ ذرات جو ازل سے چلے آ رہے ہیں، بہت مدت پہلے ایٹم کی صورت میں تبدیل ہو چکے ہوتے اور کائنات کی حرارت نہ معلوم کب ختم ہو چکے ہوتے۔ کیونکہ مادہ برابر غیر مرئی ایٹم کی طرف بدلتا رہتا ہے جو مسلسل تحولات میں

کی منزل طے کر کے ایٹم بن جاتا ہے اور پھر اس کے بعد یہ مادہ اور اجزاء متناسب کی صورت میں کبھی نہیں پٹتے۔ اصل دوم کے مطابق قابل استفادہ طاقت کے ختم ہونے کے بعد دوبارہ کیمیا کی فعل و انفعالات کا تحقق نہیں ہوا کرتا۔ اور جب یہ معلوم ہے کہ کیمیا کی فعل و انفعالات دائمی ہے اور اس کرہ ارض پر زندگی مستمر ہے اور سورج کی وہ شعاعیں جو روزانہ تین لاکھ ٹن گرمی و آگ حرارت چمک کے حساب سے خارج کرتی ہیں وہ بھی مستمر ہیں ان میں کوئی کمی نہیں ہے تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کائنات حادث ہے۔

سیارات و ستاروں کی موت سورج و کواکب کا نابود ہو جانا حدوث کی دلیل ہے اسی طرح موت و حیات موجودہ نظام کے حدوث کی دلیل ہے اور اس پر بھی دلیل ہے کہ عالم فنا اور انتہا کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں علوم طبیعیہ مادہ کو قدامت سے خارج کر کے نہ صرف حدوث عالم کو ثابت کرتے ہیں بلکہ اسکی بھی گواہی دیتے ہیں کہ کائنات ایک معین وقت میں پیدا ہوئی ہے۔ پس یہ کائنات آغاز و ولادت میں ایک ماورائے طبیعت طاقت و قدرت کی محتاج تھی کیونکہ آغاز میں ساری چیزیں برابر تھیں ان میں کوئی تفاوت نہیں تھا جو کائنات کو حیات بخشنے میں کوئی خارجی طاقت ضرور تھی ورنہ ایک محیط جس میں کوئی فعال طاقت نہیں تھی جس پر سکوت بلکہ سکوت مطلق چھایا ہوا تھا وہ کیونکر جنبش و حرکت میں آیا؟ ماننا پڑے گا کہ کوئی خارجی طاقت تھی جس نے اسکو حرکت بخشی!

پروفیسر نوائے تحریر کرتے ہیں: آج کا مادہ پرست انسان دعویٰ کرتا ہے کہ ایک بے نیلک انفجار اور طوفان کی وجہ سے کائنات کی آفرینش ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس سے پہلے انفجار کا ایندھن اور فضائے مطلق موجود بھی جس میں یہ عجیب مادہ روٹھا ہوا ہے! دوسرے لفظوں میں پھر یہ ماننا ضروری ہو جائیگا کہ مادہ اولیٰ اور کائنات کے تمام موجودات مثلاً نور و کوڑوں ستارے، کہکشاں یہ سب پہلے سے موجود تھے اور یہ ایک حقیقت ہے جو علمی

فکری، روحی، ریاضی کے حساب سے ناقابل انکار ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ فضا میں منتشر اجزا اس انفجار کے نتیجے میں کیونکر ایک جسم معین میں داخل ہو گئے؟ اور یہ جسم غلیظ آیا کہاں سے؟ اور بعض بعض کے اوپر کیونکر ڈھیر ہو گئے؟

اسی لئے، جو لوگ کائنات کی اچھی طرح معرفت رکھنے کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں: ہماری کائنات میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے اور ہر چیز تغیر و تحول کی حالت میں ہے۔

نیز روح کی طرف توجہ کئے بغیر مادہ کی تعریف غیر ممکن ہے۔ روئے زمین پر زندگی کی چھوٹی سی حرکت بھی ایک فائدہ اور عالی حکمت والے کی مقدر کردہ ہے جس کو بطور اتفاق کہا ہی نہیں جاسکتا۔

گمان دقیق تقدیرات کی مقبول و مقبول تفسیر بقول 'انسٹائن' (EINSTEIN) بغیر وجود خدا مانے ہوئے ممکن نہیں ہے۔

میکینکس (MECHANICS) کہتا ہے: جو جسم ساکن ہے وہ ہمیشہ ساکن ہی رہے گا اگر اس میں حرکت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسی خارجی طاقت کے ذریعہ ہوگی جو اس جسم سے الگ ہو۔ ہمارے عالم مادہ میں یہ اصلی اور معتبر قانون ہے۔ ادنیٰ بھی وجہ سے کہ ہم کسی بھی طرح صدق و اتفاق کے اہتمام کو قبول نہیں کرتے۔ اسی میکینک کی قاعدہ کی بنیاد پر ایک ایسی قوت کا، نا ضروری، جو خود تو مادہ نہ ہو۔ لیکن مادہ کو خلق کرے اور اس کو قوت و حرکت بخشنے تاکہ مختلف شکل و صورت کا وجود ہو۔ فرانکلین (FRANKLIN)۔ علم فزیاء کے بہت بڑے مشہور عالم۔ نے خدا کے وجود پر ایک خوبصورت استدلال کیا ہے وہ فرماتے ہیں: بہت سے لوگوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ جہاں مادی کسی پیدا کر نیوالے کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن جو بات ناقابل تردید ہے وہ یہ کہ کائنات بہر حال موجود ہے۔

نہ دھڑردا نشندہ جس توئے خدای بزرگ صفا

اب اس کائنات کے وجود میں آنے کی چار صورتیں ممکن ہیں :-

- ۱۔ کائنات کو صرف ایک خواب و خیال مانا جائے۔
- ۲۔ کائنات بفرکسی خالق کے خود بخود موجود ہو گئی۔
- ۳۔ کائنات قدیم ہے، ازلی ہے اسکی کوئی ابتدا نہیں ہے۔
- ۴۔ کائنات مخلوق ہے حادث ہے ایجاد کردہ ہے۔

پہلی صورت کا مطلب یہ ہے کہ دراصل کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے جس کو صل کرنے کی کوشش کی جائے۔ سوائے مسد مینا فزیکل فیئر۔ مسد حیات بعد الموت — اور خود آگاہی آدمی مگر وہ خود بھی اس صورت میں خواب و خیال سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس پہلی صورت کی بنا پر ہمارے لئے یہ فرض کرنا ممکن ہے کہ بہت سی خالی ریلیں وحشی مافروں سے بھری ہوئی مفہوم ذہنی سے بنے ہوئے غیر واقعی پلوں سے۔ جو غیر واقعی نہروں پر بنے ہیں — گزر رہی ہیں۔

دوسری صورت بھی پہلی صورت کی طرح بے معنی اور محال ہے اور کسی بھی اعتبار سے قابل توجہ نہیں ہے۔

اب رہی تیسری صورت تو وہ تصور آفرینش کے ساتھ ایک جزد مشترک رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مادہ بے جان جو طاقت میں عا ہوا ہو^۵ یا شخص خالق دونوں ازل سے موجود ہیں اور ان دونوں تصویروں میں کسی میں دوسرے سے زیادہ آسکال نہیں ہے دونوں برابر ہیں۔ مگوقانون تھرموڈائنامکس (THERMODYNAMICS) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات مسلسل ایک ایسی حالت کی طرف رواں ہے کہ جس میں تمام اجسام درجہ حرارت میں مشابہ ہیں اور پھر اس کے بعد طاقت کسی مصرف کے قابل نہیں رہتی ایسی صورت میں اس کہ پر زندگی محال ہو جائیگی۔

اگر کائنات کی کوئی ابتدا نہیں ہے اور یہ ازلی ہے تو اس پر اس سے پہلے موت و رکود کا حادث ہونا چاہئے تھا۔ چھٹنے وال مورج، روشن ستارے، زندگی سے بھرپور زمین اس بات کے بہترین گواہ ہیں کہ کائنات کے لئے زمانی آغاز ہے جو عدم کے بعد ہوا ہے۔ اور اس کا آغاز

۹۰

زمانہ کے ایک خاص لمحہ میں ہوا ہے۔ لہذا عالم بہر حال مخلوق ہوگا اور اس کے لئے ایک علت کبھی
یا خالق ابدی عالم و قادر ماننا ہوگا جس نے اس عالم کو پیدا کیا ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

شہادت و حواشی

انسان کی بے بسی اور محدودیت

اگر انسان تھوڑی سی گہرائی میں جا کر سوچے اور واقعات پر زیادہ وسیع النظری سے غور کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ جغرافیائے ہستی کی وسعت کے مقابل میں ہماری توانائی نہ ہونے کے برابر ہے، مسلسل اور انتھک کوششوں کے بعد نظام کائنات کے بارے میں انسانی معلومات صفر کے برابر ہیں۔ کیونکہ معلوم نہ اگرچہ کافی ترقی کر لی ہے۔ لیکن ہمارے مچھولات اتنے زیادہ ہیں کہ ہمارے معلومات کی ان سے کوئی نسبت ہی نہیں دی جاسکتی۔ شاید ہزاروں بلکہ لاکھوں انواع بشر اس دنیا میں آکر چلے گئے اور مستقبل میں نہ معلوم کتنے آئیں گے لیکن ہم کو ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ آج کے علماء جن چیزوں کو علم و معارف سمجھ رہے ہیں اور تمام واقعات کے جاننے کا آلئینہ خیال کر رہے ہیں وہ چندان قوانین کا مجموعہ ہے جو کائنات کے کسی گوشہ سے متعلق ہے۔ اور ان تمام تلاش و جستجو و تجربہ کا حاصل صرف ایک چھوٹے سے روشنی نقطہ کا جان لینا ہے اسکی مثال یوں سمجھئے ایک ایسے محراب کے وسط میں جس کی انتہا معلوم نہ ہو شہید تاریک رات میں ایک چھوٹی سی شمع کی بہت ہلکی روشنی ہو اس سے جتنی دور کا علم ہو سکتا ہے اسی طرح اس کائنات میں انسانی معلومات کی حیثیت ہے۔

اگر ہم کھربوں سال پیچھے چلے جائیں تو ابہام کے غبار اس فضا کو چھپالیں گے کائنات کی عظمت کے سامنے اس سے بشر کی کمزوری کا اندازہ لگائیں۔ اور شاید یہ مدت عمر کائنات کے مقابل میں ایک لمحہ سے زیادہ نہ ہو۔ اس حال میں ہم انسانیت کے محیط عدم میں داخل ہوں تو اس عدم کے تاریک دریا میں انسان کی کوئی خیر و خیر بھی نہیں ملے گی۔

مختصر یہ ہے کہ ہم نہ اپنے آغاز میکے بارے میں صحیح خبر رکھتے ہیں اور نہ آئندہ کی حالت

واقف ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے لئے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم تصدیق کر سکیں کہ زندگی صرف اسی کرۂ خاکی ہی میں منحصر ہے کیونکہ آج کے علماء منطقہ حیات کو بہت زیادہ وسیع خیال کرتے ہیں۔ اور کروڑوں بے شمار کرات جن کو ہم عظیم ترین دور بینوں ہی سے دیکھ سکتے ہیں، "چیونٹی" کے برابر دکھائی دیتے ہیں۔

کامیل فلما ریون (CAMILLE FLAMMARION) مشہور عالم اپنی کتاب "الْحَيَاةُ الْعَظِيمَةُ" میں عالم لامتناہی کی طرف ایک خیالی و فرضی سفر کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم اسی تیز رفتاری کے ساتھ وسیلہ نقلیہ کی رفتار میں کمی کے بغیر ایک ہزار سال، گیارہ ہزار سال، ایک لاکھ سال، تین لاکھ سو مئیر فی سکنڈ کے حساب سے دس لاکھ سال سفر کرتے رہیں تو کیا اس عالم محسوس کے کنارے تک پہنچ جائیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں! وہاں تو ایک عظیم تاریک فضا ہے جس کا عبور کرنا ضروری ہے نیز جدید ستارے ہیں جو دوسرے آسمان کی انتہا میں چمک رہے ہیں۔ اگر ہم ان کی طرف طے کریں تو کیا پہنچ جائیں گے؟.....

اس کے بعد چند صدیوں سال سفر کریں تو پھر وہی تازہ اکتفات، شکوہ و غنیمت جدید عالم تازہ، جدید عالم، نئی زمین، نئی چمنیں، نئے موجودات کا سامنا ہوگا۔ اس کے بعد کیا؟.... پھر وہی صورت حال افق بند نہیں ہوگا اور کوئی آسمان ہمارے روکنے والا بھی نہ ہوگا۔ ہمیشہ فضا، ہمیشہ خدا! ہم نے کونسا راستہ طے کیا ہے؟ ارے ابھی تو ہم اسی نقطہ پر ہیں۔ فقط ابتدا میں! پس ہر جگہ مرکز موجودات ہے اور دائرہ موجودات کا کوئی محیط متوسط نہیں ہے۔

ہاں یہ عالم لامتناہی ہے جو ہمارے سامنے کھڑا ہے لیکن ابھی تو اس کا مطالعہ بھی شروع نہیں کیا ہے۔ ابھی تو ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ خوف سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اس بے مقصد مسافرت سے تھک کر گر پڑیں گے۔ کہاں گر جائیں گے؟ ممکن ہے مدت ابدیت میں گر پڑیں، بے پایاں گرداب میں گر پڑیں بغیر اس کے کہ اس کی گہرائی تک پہنچیں جس طرح پہاڑ کی چوٹیوں پر نہیں پہنچ پاتے۔ مثالاً جنوب ہو جائیگا۔ آسمان کون سا ہے؟ نہ مشرق ہے نہ مغرب نہ اوپر نہ نیچے نہ

نہ بایں جس طرف بھی عالم کو دیکھتے ہیں ہر طرف سے غیر متناہی ہے۔ اس غیر متناہی مجموعہ کے اندر ہماری دنیا ایسی ہے جیسے جزیروں کے بہت ٹپے مجموعہ میں کوئی جزیرہ اور یہ جزیرہ بھی ایسے سمندر میں ہو جس کی انتہا نہ ہو۔ اور پوری بشریت کی عمر علم سیاحی و دنیاوی ادوار کے ساتھ بلکہ تمام عظمت کے ساتھ ہماری زمین کی عمر ایک لکھ خواب سے زیادہ نہیں ہے۔

اگر انسان کے تمام تحقیقی آثار جس کو لاکھوں اور دانشمندوں نے لاکھوں کتابوں کے اندر تحریر کیا ہے دوبارہ تحریر کیا جائے تو ایک پیکلے روشنائی اس کے لئے کافی ہوگی۔ لیکن اگر تمام کائنات کی موجودات خواہ وہ زمینی ہوں یا آسمانی ماضی میں رہے ہوں یا مستقبل میں موجود ہوں سب کو تحریر کیا جائے تو ممکن ہے روشنائی کے لئے دنیا کے سمندر کافی نہ ہوں۔

پروفیسر روائے کہتے ہیں: اگر تمام کائنات کا تصور کامل کرنا چاہو تو تم یہ سمجھ لو کہ اس کائنات کے اندر اتنی کھپٹائیں ہیں کہ اگر زمین کے تمام ساحلوں کی ریگ اکٹھا کر لو تب بھی کھپٹائوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

سہ قرآنی ہے اگر زمین کے تمام درخت اہم اہم ادا ایک دریا کی سات دریائیں مل کر کے روشنائی بن جائیں تو کھٹات خدا تمام نہ ہوں گے (کھف/۱۱۶)

سچے و دہیزر دانشمند جب جوئے خدا لئے بزرگ صلا

علمی دھوکہ بازی

مادی حضرات دعویٰ کرتے ہیں اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں جو مادی مدرسہ قائم کئے گئے ہیں۔ انھیں کے فیصل میں اتنی علمی ترقی ہو پائی ہے۔ اور ڈیالکٹک تئالسی حتی منطق ذریعہ سے وہ یسہ ہے جو علم کے پر بار درخت سے حاصل کیا گیا ہے۔

یہ لوگ فلسفہ مادی کے علاوہ ہر فلسفہ کو دہی اور غیر علمی بتاتے ہیں اور اپنے مدرسہ مادی کو علمی مدرسہ خیال کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حیات بعد الموت کے مسئلہ سے اعراض ہی حقیقت ہے۔ اسی طرح حسی و تجربی منطق اور مادی فلسفہ کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔

لیکن یہ دعویٰ مبنی بر تعصب ہے اور اپنے نظریات پر قائم ہے جو بے بنیاد و بے دلیل ہیں اور اس قسم کی اصطلاحیں انھیں لوگوں کے افکار کا منبج ہیں جن کا مرکز تفکر مادہ اور صرف مادہ ہے وہ کسی چیز کو مادہ کے بغیر دیکھتے ہی نہیں۔

یہ بات بحث سے بالا ہے کہ وجود خدا کا عقیدہ معارف بشری اور ثقافت کے عظیم منبع میں سے ایک منبع (چشم) ہے۔ اور خدا کی معرفت پر عنوان یک جہاں بینی راستیں نے مختلف اودار میں اجتماعی اصول میں ایک تصور عمیق اور انسانی افکار میں ایک بنیادی تغیر ایجاد کیا ہے اور آج بھی۔ جو علم و تکنالوجی کا دور ہے۔ جبکہ بشر نے فضا کی راہوں کو کھول دیا ہے۔ علماء کا ایک بہت بڑا طبقہ جو اپنے نظام فکر و عقیدہ میں مذہبی معرفت رکھتے ہیں وہ منطق و استدلال کی راہ سے وجود خدا اور مبدہ ہستی تک پہنچنے لگے ہیں۔

اگر مادہ پرستوں کی تفسیر صحیح اور واقعی ہوتی اور تاریخ فکر مادی کی معرفت فقر و ضعف سے ناشی نہ ہوتی تو علم اور مادیت کے درمیان ایک رابطہ خاص ہوتا اور محیط علمی میں تنہا مادی

عقاید اپنا وجود منوالیتے۔

کیا ہر دور میں تمام علماء و فلاسفہ الہادی نظریے کے تھے؟ اور کیا سبک مبادیہ پرست تھے؟ بلکہ اگر مفکرین کے احوال و آثار کا تحقیقی نظریے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ نہ صرف یہ کہ مذہبی لشکر و اعلیٰ مفکرین و محققین سے خالی نہیں تھا بلکہ بہت سے مفکرین و بزرگ علماء اور بہت سے علوم و دانش کے موسس مکتب توحید کے پرچم دار تھے!

مادی اور الہادی عقیدہ کا تعلق کبھی بھی دودھ کا مکال و پیشرفت معلوم سے نہیں رہا۔ بلکہ عہد اول اور طول تاریخ میں یہ مادہ پرست ہمیشہ ابن توحید کے صنوف کے سامنے اپنے کفر و احماد کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔

آج مارکی عوام کے نزدیک علم سے زیادہ گمراہی کا ذریعہ بن گیا ہے اور تمام جماعتوں سے زیادہ یہی جماعت گمراہ ہے۔ ان کے لئے بہتر طریقہ تو یہ تھا کہ نود دانش کی مدد سے صحیح راستہ تلاش کرتے اور تعصب و بصیرت اور جلد بازی کو چھوڑ کر منطق طریقہ سے تحقیق کر کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے تاکہ حقیقت تک رسائی حاصل کر سکیں۔ یہ لوگ ابن توحید اور عقائدی تقلید میں مبتلا ہیں اور مفروضہ طور پر تمام عقل و فکر کی بلند و بالا ارزشوں کا انکار کرتے ہیں اور لطیف کی بات یہ ہے کہ پھر اپنے اس انکار پر فخر و مباہات بھی کرتے ہیں۔

یہ لوگ کہتے ہیں: علم آنے کے بعد وجود خدا کا مسئلہ منسوخ ہو گیا۔ یہ بات منطق سے بہت دور ہے یہ تو بس ایک قسم کی لغو بازی ہے، کیونکہ ہزاروں علمی تجربے کے بعد بھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی موجود و حافل غیر مادی وجود نہیں رکھتا۔ بلکہ مادی عقیدہ تو میٹافزیکی عقیدہ ہے جس کی نفی جیسے کائنات صرف فطنی طریقوں ہی سے کیا جاسکتا ہے اس لئے اگر مادی عقیدہ قبول بھی کر لیا جائے تو اس سے میٹافزیکی عقیدہ کی نفی نہیں ہو جاتی۔ اسی لئے مدرائے دنیا کا تھیل نہنیں اس طرح کی بات کرنا محض ظہر پر ہے معنی بات ہے مادہ اس کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے، بلکہ یہ فطنی عقیدہ صرف حقائق کی تحریف کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس مادی مدرائے کو علمی کہنا علم و حقیقت کے ساتھ خیانت کرنا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ انسان کل تک طبعی علل و عوامل کو نہیں جانتا تھا۔ اور اس کے اندر گود ہونے والے حوادث کے اسرار و رموز سے بھی ناواقف تھا۔ مگر اس کا ایمان جہالت سے ناشی نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو بہت سے معانی عالم کے انکشاف کے بعد معرفتِ خدا کی بنیاد ہی ڈھرجاتی اس کے برخلاف ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسرارِ وجود جتنے زیادہ منکشف ہو رہے ہیں۔ عقیدہ بر خدا اور زیادہ واضح و روشن ہوتا جا رہا ہے۔

علم اگرچہ صرف فضائے محدود کو روشنی کرتا ہے۔ اور معرفت و علمِ جہانِ شناہی جزئی ہے کلی نہیں ہے کیونکہ علم کائنات کی صورت کاملہ کا ارادہ کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن اس کے باوجود شناختِ علمی دقیق اور شخص ہے اور توانائی بخش ہے اس لئے علوم میں جتنی وسعت ہوتی جا رہی ہے خدا کی معرفت انہی ہی علمی اور منطقی ہوتی جائے گی۔ کیونکہ انسان کی آگاہی ازراہ شناختِ اسباب و علل و معلول ہوگی اور جب ایسا ہوگا تو انسان کا اصلی عامل اور علت اولیٰ جو ان تمام عوامل و علل کی اصل ہے، اس سے چشم پوشی نہیں کر سکے گا۔

بقول پروفیسر رویہ : انسانی علم پہلی مرتبہ اعلان کرتا ہے۔ اور یہ اعلان کسی ضعف و عاجزی کی بنا پر نہیں بلکہ تحقیق و تجربہ کی بناء پر ہے۔ کہ عرصہ وجود میں علم انسانی کا وظیفہ ذات باری اور اسکی تجلیات کی معرفت کے سوئی کچھ اور نہیں ہے۔ اور واجب ہے کہ ان تمام کوششوں کو خدا کے بزرگ کائنات کی ایمانِ علمی اور صحیح منطقی معرفت پر صرف کیا جائے۔ اور یہ بات بھی زیر بحث نہیں ہے کہ علم ایمان سے یا ایمان علم سے مصالحت کرے گا؟ کیونکہ تمام دینی کتابیں، سارے انبیاء اور تمام دینی مفکرین نے عقل کو بہترین و برتر موجدِ انسانی بتایا ہے اور ان حضرات نے عقل سے مکمل استفادہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

اکثریت کی جہالت نے سوادِ اور چھوٹے تعصبات کی غمیرت اور بے فائدہ اسارات کے غلبہ و قرون اس دعوت کو پیچھے ڈالے رکھا۔ اور اب جبکہ انسان معرفت و دانش میں داخل ہو چکا ہے۔ اور اس تمام سائل و مسائل کا کوپانی زندگی میں روز بروز وسعت دے رہا ہے تو از بس ضروری ہے کہ عقول و افکار کی تربیت پر

خاص توجہ دی جائے اور اس علم کی طرف توجہ کی جائے جو صحیح طریقہ سے مورد استفادہ ہو۔
مثلاً اس جہاں یا اس جہاں اور کجکشاں یا اس کجکشاں کا نہیں ہے اور نہ کھربوں نور کی سال کا مسئلہ
ہے اور نہ عظمت کا کائنات کا مسئلہ ہے بلکہ دراصل مسئلہ اس دانش کا ہے کہ جو صحیح طریقہ سے
مورد استفادہ واقع ہوئے۔

کل تک انسان تنہا اپنے چکر متناسب و موزون کے بارے میں سوچا کرتا تھا اور
اس کا مشاہدہ کرتا تھا۔ لیکن وہ پیچیدہ اسرار جو اس کی آفرینش میں ودیعت کئے گئے تھے اس
ناآشنائی تھا۔ مگر آج اپنے اس چھوٹے جسم کی وسیع وحیرت انگیز معلومات رکھتا ہے
اور یہ جانتا ہے کہ اس کے چھوٹے سے بدن میں دس ملین ملیناڈ دھلیا یا استخوان کئے گئے ہیں
اور صورت حال یہ ہے کہ ایسے ممنوع کے بنانے والے کی عظمت کا اندازہ موجودہ تمام علمی
ذرائع و وسائل کے باوجود نہیں لگا جاسکتا۔

اب سوچئے کیا یہ بات منطقی ہے کہ ہم چاہیں کہ خدا پر صرف انہیں لوگوں کا عقیدہ ہے
جو انسان کی کیفیت آفرینش سے آگاہ نہیں ہیں؟ اور کیا وہ عقلمند جو عقل و عوامل طبیعت
باجبر ہے اور سیر شکل و رشد انسان سے مطلع ہے۔ اور جو جانتا ہے کہ تمام مراحل وجود
میں قانون و دقیق حساب کی حکومت ہے وہ اس بات کا معتقد ہو جائیگا کہ حیرت انگیز
قوانین کا بنانے والا ایک بے ادراک و بے شعور مادہ ہے؟ کیا یہ تمام انکشافات اصداف
اس دانشمند کو اس منزل پر پہنچائیں گے کہ وہ تمام موجودات کے خالق اور خود اپنے مبد
کرنے والے کو بے شعور مادہ کی طرف نسبت دے؟ مادی ثقافت جو کائنات کو آنکھ
بند کر کے دیکھتی ہے وہ ہمارے لئے بہت سے ایسے سوالات چھوڑ دیتی ہے جن کا جواب

لے دو ہزار دانشمند درجستہ ہوئے خدا سے بزرگ ۲۱

نہ ایک ہزار میون کا ایک ملیار دہوتا ہے۔

ہی نہیں ہے !

دانشمندان الہی نے از نظر ریاضیاتی یہ بات ثابت کی ہے کہ وجود کا دائرہ مادہ سے کہیں زیادہ وسیع تر و گسترده تر ہے اور غیر مادی موجودات کی دنیا مادیات کی دنیا سے بہت بڑی و غنی اور پردامن ہے۔ یہ لوگ اگرچہ نظام طبیعت کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وجود کی ایک ایسی صورت کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں جو مادہ سے مجرد و مجرے اور اس کی ذات کی شناخت علوم تجربی کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ ظواہر و حوادث طبیعت اس کی حقیقت ذات کی حکایت کرتی ہیں۔ کیا یہ توحید ہی فکر اس بات کی دلیل ہے کہ مدرسہ توحید جذبہ علمی سے خالی ہے ؟ علم کے پاس از قبیل کیا دنیا دو حصوں میں منقسم ہے مادی و معنوی ؟ دنیا کے لئے کوئی حد و مقصد ہے کہ نہیں ؟ سوالات کے جوابات نہیں ہیں ! کیونکہ اصطلاحی طور پر سوالات علمی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ معرفت علمی ہم کو بعض موجودات کی خبر دیتی ہے۔ لیکن ہم کو زندگی کے باوجود میں صحیح آگاہی نہیں دے سکتی اور نہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ ہم کو وہ راہ و روش بطور الہام بتلا دے جس کو ہم اپنی زندگی میں اختیار کریں۔

برٹرانڈ رسل (BRTRAND RUSSEL) کہتا ہے : اگر آج کا علمی تمدن مفید تمدن ہوتا تو علم کی زیادتی اور پیشرفت سے عقل انسانی میں اضافہ ہوتا۔ عقل سے میری مراد مقصد حیات کا ادراک ہے۔ مگر جدید تمدن یہ فائدہ نہیں پہنچا رہا ہے لہذا انسان کی ترقی کیلئے علوم کی زیادتی و ترقی چاہیے جتنی ضروری ہو مگر یہ علوم انسان کی صحیح ترقی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ لہذا علمی معرفت میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ انسانی آئیڈیالوجی کا مدرک بن سکے کیونکہ علمی معرفت کی علمی آئیڈیالوجی سے زیادہ علمی قیمت ہے۔ اور یہ ان کو طبیعت پر مسلط کر سکتی ہے۔ جبکہ وہ چیز جو اس کو ایمان و عقیدہ کے مدرک پر متمکن کر سکتی ہے وہ واقعی و نظری قیمت ہے نہ صرف علمی !

لے جہاں مینی علمی

تمام علوم کا دار مدار تحقیق و تجربہ و ملاحظہ پر ہے اور تجربہ پر مشتمل قوانین متزلزل و غیر ثابت ہیں اور ایمان کے لئے ایک ایسا مدرک چاہئے جو دائمی و ہمیشگی سے ہمکنار ہو۔ متزلزل و تغیر سے بہت دور ہو اور اس میں یہ بھی صلاحیت ہونی چاہئے کہ جہاں شناسی کے مخصوص مسائل جو ہم کائنات کے شکل و باہیت سے مربوط ہوں ان کا معقد و جاودانہ جواب دے سکے۔ اور وجود کے تفسیر میں انسانی ضرورت کو پورا کر سکے۔

انسان کا اس اعتدال نگہ و روحی کا محتاج ہے اگر اس کا کوئی ہدف معین نہیں ہے تو وہ ضائع و ہلاک ہو جائے گا۔ اگر دین و مذہب کی طرف سے اس کو کوئی معین ہدف نہ مل سکے تو خود ساختہ حریف کو اپنا لے گا اور یہ نظام طبیعت کے خلاف ہوگا اور وجود فکر کا سبب بنے گا۔ دور حاضر کے انسانی علمی کمزوریات نے انسان کو دنیا کے عمومی قوانین و نظام کا معقد بنا دیا اور اس عقیدہ میں یہ افراط ہو گیا ہے کہ انسان غرضی کی امالت و حاکمیت کا قائل ہو گیا۔ اور ان کو انہی مان بیٹھا اور عملی طور سے تاریخ یا طبیعت کی الوہیت و قاہریت کا معقد بن گیا۔ اور انسان کو صفت شخصیت و اختیار کا انکار کر کے ڈیالیکٹکسی جبر کے سامنے انسان کو دست بستہ اور مجبور بننے کا قائل ہو گیا۔

اور اب علوم کے تدریجی تقدم کے ساتھ معرفت اور عالم کے بارے میں علمی نظریہ وحدت توحید کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ اور وہ حوادث و ظواهر جو پہلے غیر مرتبط معلوم ہوتے تھے اب ایک ربط سے مرتبط معلوم ہونے لگے ہیں۔ اور ایک منشاء کی طرف ان کی بازگشت تسلیم کی جانے لگی ہے۔ مختصر یہ کہ ظواهر مختلف و متناسخہ میں ایک علاقہ بستگی کا عقیدہ پیدا ہو گیا ہے اور جب یہ دیکھا جائے گا کہ فاعلیت تو ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہے تو پھر تمام ظواهر کو اسی ایک مرجع کی طرف اور اسی ایک مبدی کی طرف پٹا یا جائیگا۔ اور پھر تمام ظواهر مجتمع ہو کر اسی محور و مرکز پر منتهی ہوں گے۔ اور اسی سے سب کا وجود سیراب ہوگا۔

بے دینی کے اسباب

تاریخ ادیان کی کتابوں میں سارا زور اس بات پر صرف کیا گیا ہے کہ آخر وہ کون کسباب تھے جنکی بنا پر لوگ دین کی طرف مائل ہوئے لیکن یہ نہایت ہی غلط اور ناقص طریقہ ہے جس سے کبھی انسان واقعیت کی طرف نہیں پہنچ سکتا اور نہ حقیقت کو دریافت کر سکتا ہے۔ کیونکہ فطرت توحید کو دیکھتے ہوئے۔ یعنی نوع انسان کی وہ خصلت وجودی جو دیگر انسانی صفات مثلاً فکر، ارادہ، استعدادات متقابلہ کے درمیان ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ان اسباب کو تلاش کرنا چاہئے تھا کہ جن کی وجہ سے انسان اپنی فطرت کے خلاف بے دینی کی طرف چلا گیا ہے۔

دینی عقائد ایک فطری چیز ہے اور مادہ پرستی خلاف فطرت ہے۔ اگر انسان اپنی فطری خصوصیات کی بنا پر خدائے برحق تک نہیں پہنچ پاتا تو اپنے لئے ایک خدا تراش لیتا ہے۔ چاہے وہ بے شعور مادہ ہو یا جبر تراش ہو۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہی باطل خدا، خدائے برحق کی جگہ لے لیتا ہے اور پھر اسی کے فرمان، تفاوت، ہدایت، ارشاد طریقی میں وہ اسکی پابندی کرنے لگتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ انسان خدائے برحق کو یوح ڈالتا ہے اور قدیم یا جدید بت پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور پھر بڑی قساوت و بے دردی سے خدا کو خدائے تاریخ کے قدموں پر طعن کر دیتا ہے۔ اور جو ہر بات دیکر مٹی خرید لیتا ہے۔

اور بے نیادہ افسوس تو اس بات پر ہے کہ پسماندہ طبقہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کے ماننے تمام خدائی صفات کے ساتھ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ اور خدا کو وہ

ناشر کے لئے سے اعراض کر لیتا ہے اور اس ننگ آلود عبودیت کو جان کی بازی لگا کر خرید لیتا ہے۔ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مادیت کا ظہور یورپ میں بعنوان ایک مکتب اور حقیقتِ مطلقہ سے علاوہ انسانی کو جدا کرنے کے لئے ہوا تھا اور اس لئے ہوا تھا کہ انسان کو مادہ کی زنجیریں گرفتار کر دیا جائے اور مذہب کی جگہ اس مادہ کو دے دی جائے اور یہ سارا کام کچھ تار بکچی و اجتماعی اسباب کی بنا پر کیا گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے مغرب میں اس کی بنیاد پڑی تھی۔ من جملہ ان اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس وقت نئی صنعتی ترقی شروع ہوئی اور ان علماء نے ایسے عقائد و آراءے جدیدہ کا اظہار کیا جو مسیحی علماء کے نظریات کے خلاف تھے تو مسیحی علماء نے اس کے ابتدائی دور میں بڑی شدت سے ان لوگوں کی مخالفت شروع کر دی جس کا رد عمل یہ ہونا ہی تھا کہ موجدین نے دین و دیانت کا عملی الاعلان انکار کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ طاقور ہوتے گئے اور مسیحی علماء کی ان کے مقابلہ میں ایکٹ مپی۔

کلیسا۔ مخصوص دینی عقائد کے علاوہ یہ تعلیم یونانی و غیر یونانی فلاسفہ کے اصول و نظریات کو انسان و کائنات کے سلسلہ میں، وراثتی طور پر مانتا تھا اپنے دینی اصول و عقائد کے ساتھ ساتھ۔ لیکن جب کھیس نے کچھ ایسے نظریے دیکھے جو کتاب مقدس اور ان کے دیگر مسدود مقبول اصول کے خلاف تھے تو انھوں نے۔ یعنی کھیس نے۔ اپنے مخالف نظریہ دے کے کو کافر و مرتد قرار دے دیا اور اس کے لئے سخت ترین غیر انسانی سزائیں مقرر کر دیں۔ علمی و مذہبی محافل میں جب علم جدید و مذہب کا تقاضا ظاہر ہونے لگا تو طرفین میں مخالفت و مخالفت کا جذبہ بھی شدید ہونے لگا۔ روشن فکر و دانشمند جتنے دیکھا کہ سچ کا کھیس عقل و فکر کو پاب زنجیر کرنا چاہتا ہے اور حریت و آزادی فکر کو چھیننا چاہتا ہے اور پھر نتیجہ اس جامد نظامِ فکری نے عصرِ جدید کے انسان کے لئے خلاف عقل ایک نہ پہنچی فضا پیدا کر دی اور صاحبانِ فکر و نظر کو گوشہ گنہ می میں مجاہد کیا۔ اور اس مسلسل فشار نے پورے یورپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور پھر جب کھیس کا اقتدار ختم ہو گیا اور ظلم و بربریت کے بادل چھٹ گئے

تو عصر جدید کے علماء جو گوشہ گنہی میں قید و بند کی سختیاں گزار رہے تھے انہوں نے ماضی کی تلخیوں کا بڑی شدت سے جواب دیا۔ اور جتنے بھی روشن خیال لوگ تھے انھوں نے قدیم مذہب کا جواب اپنی گردن سے اتار پھینکا اور مذہب برگشتہ ہو گئے اور پھر عصیت و رنج جا بجا ہی کی ایک عظیم مذہب کے خلاف قائم ہو گئی اور شدید معنوی بحران کا آغاز ہو گیا اور اس کا نتیجہ علم و ایمان کی جدائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی غیر منطقی انتقام کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اصلی آسانی ماسکی اور وجود خدا کی حقیقت کا انکار کر بیٹھے۔

یہ درست ہے کہ دین کی بعض تعلیمات غیر منطقی تھیں بلکہ بے بنیاد تھیں اور اصل دین سے ان کا کوئی ربط بھی نہیں تھا مگر کلیسا سے انتقام لینا ایک الگ بات ہے اور جلد بازی اور قطع کاری کی وجہ سے بطور علم دین ہی کا انکار کر دینا ایک الگ چیز ہے۔ اور یہ بدیہی بات ہے کہ انتقام لینے وقت علمی محاسبہ کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہوتا اور اس وقت کی فضائیں جو چیز حکومت کرتی ہے وہ صرف احساسات کا طوفان ہوتا ہے۔

اس وجہ سے ان کا فقر معنوی بہ نسبت مینیکل و علمی استغنا کے زیادہ ہو گیا اور ان کی معنی سر زمین پر جتنا بڑھتا گیا اخلاق و معنویات میں یٹھے ہوتا چلا گیا اور پھر ضروری قدرت معنوی کو ان علوم و معارف سے مصل نہ کر سکا۔

ارزش و معنویت کے مقابل میں علوم بذات خود زیادہ اہمیت کے حامل نہیں ہیں کیونکہ ہم ضعیف علوم کی طرف مراجعہ کر کے مسکود افراد کا وظیفہ و فریضہ معین نہیں کر سکتے۔ علوم میں چاہے جتنی ترقی ہو جائے اپنے سامنے ایک قدم سے زیادہ نہیں دیکھ سکتے۔

شہناختہائے بشر نہ تو اس کائنات کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتی ہے اور نہ مستقبل میں انسان کے سر نوشت کی پیش گوئی کر سکتی ہے۔

یہ تو صرف نظریہ توحید ہے جو صرف انسان کے مادی حیات ہی پر اقتدار نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی کے لئے مبداء اور بند غایت بھی معین کرتا ہے۔ اگر انسان اپنے کو توحید کے راستہ

پر چلتا رہے تو وہ ایسے کلید تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے جہاں بنی کے چوکے میں اپنے تمام بنیادی اور استعلیٰ سوالات کے جوابات پالیتا ہے۔ اور پھر انسانی زندگی اپنے رنگ اصلی قدر و قیمت کو کامل تجلیات کے ساتھ پالیتی ہے اور یہ عقیدہ توحید کے طفیل میں ہوتا ہے۔

خدا کے انکار اور لادینیت کے اسباب میں سے ایک سبب یہی ہے۔ ایک دوسرے گروہ نے کلیسا کی طرف سے خدا کے بارے میں جو نادرست و نارسا اور ناقدر شاہی تعالیٰ مفہم پیش کئے تھے ان کی وجہ سے اس گروہ نے مذہب استغنیٰ دیکر مادیت کے دامن میں پناہ لی۔ کیونکہ خدا کا جو نظریہ کلیسا پیش کرتا تھا ہوشمند افراد کے لئے وہ کسی بھی طرح قابل قبول نہیں تھا۔ اور نہ قانع کر نیوالا تھا۔ اس لئے کہ کلیسا خدا کو مادی اور انسانی قالب میں ڈھال کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا تھا۔ جبکہ انسان ہمیشہ ارزش ہائے مطلق کے جستجو میں رہا اور محدود کے چوکے کو توڑ کر اس سے کہیں بلند و بالا جانا چاہتا ہے تو خدا کو محدودیت کے چوکے میں کیونکر قبول کر سکتا ہے؟

یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اگر مسلم حقیقت کو بھی ناقص اور قصہ کہانی کی طرح ذہنوں میں ڈال دیا جائے تو جب انسان فکر و علم کے عالی مستوی پر پہنچے گا تو اس حقیقت کے تصور سے برے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

روحانی فکر حضرات نے جب مسیحی الہیات میں خدا کی ایسی تصویر دیکھی اور یہ دیکھا کہ مسیحی مذہب ایمان کو عقل پر مقدم سمجھتا ہے۔ اور دین کے پیروکاروں کو سوچنے سے پہلے ایمان لانا ضروری ہے تو انھوں نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا کہ یہ دینی تنگ و محدود نظریات اور مسیحی الہیات کے تنگ چوکے میں علم و حکمت کا انحصار میزان عقل و دانش میں کے خداف ہے اور ان کے سامنے کلیسا اور تحریف شدہ کتابوں کے علاوہ معارف الہی کو سمجھنے اور اس قسم کے مسائل میں تحقیق کرنے کی کوئی معجم اور واقعی پناہ گاہ بھی نہ تھی۔ اور نہ وہ کسی ایسے بلند و بزرگ نظام تک رسائی حاصل کر سکے تھے جو ان کی مادی خواہشات کے ساتھ معنوی ضرورت

کو بھی حل کر سکے ہوتا اور پورا کر سکا ہوتا اور ان کے تمام حیات مادی و معنوی، عاطفی و فکری عناصر کے لئے مناسب قالب پیش کر سکا ہوتا۔ تو ان کی بنیاد مادی گری نے ان کے افکار و خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مادرائے طبیعت کی غیر مادی ارزش ہائے معالیٰ کا انکار کر بیٹھے۔ اور اس بات کی طرف متوجہ نہ ہوئے کہ دینی جب بھی مسیر جمہالت میں پڑ جاتا ہے تو ہمیشہ اشتباہ اور غلط راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن جو مذہب سچا ہوتا ہے۔ خرافات، تحریفیات، موهومات کے شائبہ سے خالی ہوتا ہے وہ ان کو قند کھانوں اور خرافات سے نجات دلا دیتا ہے۔ اور صحیح عقیدہ پر ثابت قدم بنا دیتا ہے اور معارف الہی کی صحیح و درست تصویر پیش کرتا ہے جو ان حقیقت کو صحیح جواب دے سکے۔ اور معقون دلائل سے مکرون اور نعظیوں کی اصلاح کر سکے۔

لیکن اس روشنی فکر جتنے سے جب دین کو ایک خرافات اور باطل باتوں پر مشتمل دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ دین کی بنیاد غیر منطقی اصولوں پر رکھی گئی ہے تو ان کو یقین ہو گیا یہ تمام دینی پروگرام بحث و بیکار ہیں۔ اور اپنے مذہب میں جو چیزیں دیکھی تھیں ان کی بنیاد پر تمام ادیان و مذاہب کی مخالفت پر آمراءے حالانکہ اس بنا پر مصلد باہمی اور غلاف واقع بنیاد پر تمام ادیان و مذاہب کی تردید عقل و منطق سے بعید اور بالکل غلط ہے۔

والٹر اسکار (WALTER OSCAR-L) جو فیریا لوجی اور یوکیٹسٹری کا بہت بڑا عالم ہے وہ اس حقیقت کو اس طرح آشکار کرتا ہے کہ علمی مطالعات میں بعض دانشمندوں کی تو یہ جو وجود خدا کی طرف غفلت نہیں ہوتی اس کے متعدد اسباب ہیں۔ میں ان میں سے دو علتوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ غالباً اوضاع سیاسی استبداد یا احوال اجتماعی یا حکومتی تشکیلات وجود پر ہنگامہ کے افکار کا سبب بنا کتے ہیں۔

۲۔ انسانی فکر ہمیشہ بعض اوضاع کے تحت تاثیر ہوتی ہے اور اس کے باوجود کہ بعض اوقات وہ علم جو خالص احیاء سے مشغول ہو اس علم کے ذریعہ کہ جس کی حمایت کرتے ہیں جسم کے بعد دوسری حمایت دی جاسکتی ہے۔

کسی بھی قسم کے جہانی یا روحانی عذاب کا خوف نہیں رکھنا پھر بھی اس کی فکر صحیح راستہ اختیار و اختیار کرنے میں کاملاً آزاد نہیں ہوتی۔ ————— مسیحی خاندانوں میں زیادہ تر بچے ابتدائے عمر میں ایک ایسے خدا پر ایمان لاتے ہیں جو ان کے مشاہد ہوتا ہے۔ گویا کہ بشر بصورت خدا پیدا کیا گیا ہے۔ اور یا خدا جب علمی حیطہ میں داخل ہونے میں اور علمی مسائل کے یاد کرنے اور شوق کرنے میں مشغول ہیں تو یہ ساری شے کا ضعیف خدا منطقی دلائل اور علمی غماز پر پورا نہیں اترتا اور جب کسی بھی صورت سے دونوں۔ تعویذ خدا اور منطقی دلائل والا خدا۔ میں اتحاد نہیں پیدا ہو پاتا تو مفہوم خدا کو ترک کر دیتے ہیں اور اس کو دائرہ فکر سے خارج کر دیتے ہیں۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ منطقی دلائل اور علمی تعریفات سابق عقائد کو بدل نہیں پاتے اور پھر دوسری طرف یہ لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایمان باللہ کے سلسلہ میں ہم نے غلطی کی ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے اسباب ہوتے ہیں جو انسان کو اس دینی مفہوم کے ٹوٹ جانے پر متوجش کر دیتے ہیں اور نتیجہ میں وہ شخصی معرفت خدا کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ یہ وجہ تھی کہ دانشمند حضرات نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ مسائل ہستی و آخرت میں جہاں کہیں بھی خدا یا مذہب کا نام ہے اس کو ختم کر دیا جائے۔ اور استیقام یا غیر استیقام ایسے قوانین و فارمولے ایجاد کئے جائیں جو ان تمام مقامات کے لئے۔ جہاں پر خدا یا مذہب کا نام ہو۔ علمی محال تلاش کر کے خدا و مذہب کا نام باقی نہ رہے دیں۔ اور بزعم خود انسانوں کی امیدوں کو دیں کہ سلسلہ میں ختم کر دیں اور نظام طبیعت یا گردش جہاں میں خدا کی کسی بھی قسم کی تاثیر کو نیست و نابود کر دیں۔

اور جب یہ لوگ کسی ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں تاویں کا دروازہ بند ہے تو وہاں پر کچھ مختلف مفروضات کے ذریعہ مسدود کر کے کی سعی رائیگہ کی اور یا یہ کہہ کر ٹال گئے کہ مستحقین میں ہونے والی تحقیقات سے یہ گتھی سلجھ جائے گی۔ اور اس طرح۔ اپنے

بہ اثبات و جود خدا صحت

خیال عام میں۔ اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ اس قسم کی خرافات اور غیر علمی مسائل میں کوئی کوشش کریں اس لئے اگرچہ یہ لوگ شرک کی گمراہی سے تو بچ گئے۔ مگر کفر و ایمان کے دلدل میں پھنس گئے۔ اگرچہ خدا کی معرفت اور عقیدہ مبدیہ فطری و طبعی چیز ہے لیکن مادی زندگی ضرورتاً کی طرح انسانی اس کی تلاش و جستجو میں زیادہ نہیں رہتا۔ بلکہ یہ مسئلہ مادی زندگی سے بالکلہ متماثل ہے۔ اس میں وقت نظر اور گہرائی فکر کی ضرورت ہے۔ اور فضا یا کے اصل تک لغو اور مسائل وجود میں تحقیق درکار ہے۔ اور ہر انسان کو مستقلاً چاہئے کہ فوراً دہرے اس کو حاصل کرے۔ مختصر یہ کہ ہدایت اور فکریت میں ان نظر ہدایت کوئی مشابہت نہیں ہے۔

اور دوسرے نقطہ نظر سے نا دیدہ موجود جس کی توصیف بھی ناممکن ہو اس کا انکار کر دینا اس کے وجود کے اعتراضات سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اور اسی لئے جن لوگوں کے اذہان اس نکتہ کو عمل کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں اور خصوصاً جبکہ حقیقت نامرئی کی شناخت مختلف پہلوؤں و عوامل کی بنا پر خدشہ دار ہو گئی ہو تو وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے راہ فکر کو اپنے لئے ہموار کریں ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جو آسان ہو اور اس میں کوئی دوسری بھی نہ ہو اور وہ راہ کفر و ایمان کی ہے وہ لوگ اسی کو انتخاب کر لیتے ہیں۔ اور محض ظاہر اس راہ کو اختیار کر لینے میں ان کو کوئی نقصان بھی نہیں دکھائی دیتا۔ اور جب مسئلہ وجود خدا کے دور ہو جاتے ہیں تو غنا و خوشنمی و عصیت پر اتر آتے ہیں۔ اگر آپ تعبیرات کو یہ کامعائد کریں جو دین سے بیزار لوگوں سے بھری ہے تو اس حقیقت کو پالیں گے۔

اور اسی کے ساتھ اس بات سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہے کہ جاہل و بے مطلق نادان عابدوں اور زاہدوں کی تبلیغات نے بھی بہت سے لوگوں کو دین سے بیزار کر دیا اور وہ انوکھا مادہ پرست ہو گئے۔

وہ غرائز جو انسان کی طبعی حیات کے ساتھ شروع اور اسکی موجودیت سے ہم نشین ہوتے ہیں وہ نہ تنہا یہ کہ عبت و بے ہودہ نہیں ہیں بلکہ وہ ایک معین کنندہ طاقت و سروریت

ساز اور عامل رشد و حرکت ہیں جو انسان کو اس مقصد کی طرف — جو اس کی آفرینش میں منظور تھا — لے جاتے ہیں اور اہم چیز یہ ہے کہ جس طرح انسان کو اپنی خواہشات کا بندہ اس طرح نہ ہونا چاہئے جس طرح قیدی اپنے وجود و حرکات و اختیارات میں دار و غیہل کا تابع ہوتا ہے اسی طرح اپنی واقیعت درونی سے بھی جنگ نہ کرنی چاہئے اور نہ فطرت کی ہر دھڑ دھوپ ہر تلاش و حرکت کو روکنا چاہئے۔ بلکہ نہاد انسانی کا فائدہ بخش ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آدمی کے وجود میں فعالیت ہر وقتی ہو۔ مگر اپنے ترکیب و اعمال میں معتدل و متوازن ہو ورنہ غرائز کی سرکوبی بھی مشکلات پیدا کر دیتی ہے اور انسان کی شخصیت کو دیران بنادیتی ہے۔

قرون وسطیٰ میں کلیسا کے پیش نظر صرف اور صرف آخرت تھی۔ یعنی مادی دنیا بچ و بوزخ تھی۔ آپ خدا غور کیجئے مذہب و خدا کے عنوان کے پیش نظر اگر ہم فطری خواہشات کو غیر اہم کہہ اس کو نابود فرض کر لیں اور رہبانیت و مجرد کو مقدس مان لیں۔ اور شادی بیاہ اور شکیں ناواہ — جس کے زیر سایہ بچائے نسل کا اسکان ہوتا ہے — کو گندی اور نجس چیز فرض کر لیں، فقر و ناداری کو مایہ سادات سمجھنے لگیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اب دوسرے لوگ ایسے مذہب کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ اور اس سے کتنی امیدیں وابستہ کر دیں گے؟

مذہب کا مقصد اصلاح و رہبری، خواہشات پر تسلط، اعمال انسانی کو کبھی اور نہ یادہ روکی سے محفوظ کرنا اور اس کے دائرہ خواہشات کو محدود کرنا ہے تاکہ بالکل نیست و نابود کر دینا ہے۔

ان اگر اپنے غرائز کو کنٹرول میں رکھے اور خواہشات کے جال میں گرفتار ہونے کے بجائے برابر اس سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا رہے تو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے یا مقصد سر کو بنا سکتا ہے، ورنہ انسانی فطرت میں خواہشات کی کشمکش کی شدت اس درجہ ہے کہ جب تک انسان کو ہر طرح کی تربیت نہ دی جائے سادگی و سہولت کے ساتھ وہ اپنے اندر فی خواہشات کو مسخر نہیں کر سکتا۔

انسان ایک طرف تو جذبہ دین سے متاثر ہوتا ہے اور دین باطنی طور پر اس کو خیر و صلاح کی طرف آمادہ کرتا ہے مگر دوسری طرف سے انسان خواہشات نفسی سے بھی شدید طور سے متاثر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ یاد رکھئے جس معاشرہ میں خدا اور دین کے نام پر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائیگا کہ تہاری سعادت و خوشبختی کا دار مدار مواہب دنیویۃ سے کنارہ کشی ہی میں مضمر ہے۔ وہاں قہری طور پر انسان ایک فشار و تنگی محسوس کرے گا اور وہ طبعی طور سے مادیت کی طرف رخ موڑ لیگا اور دینی مفاسم سے بالکلہ برگشتہ ہو جائیگا۔

اور درحقیقت دین کی شطوط یہ ہے بھی نہیں! بلکہ حقیقی دین انسان کو نفس کی غلامی اور مادہ کی بندگی سے آزاد کرتا ہے۔ اور ذات خدا پر ایمان اور دینی و دنیاوی تعلیم کی بنیاد پر انسان کو اسی دعوئی ارزش کی طرف متوجہ کر کے عالم ملکوت کی رویت کا دائرہ وسیع کرتا ہے اور اسی کے ساتھ مادی لذائذ سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تمام وہ چیزیں جو مذہب کی طرف سے ممنوع قرار دی گئی ہیں درحقیقت ان میں آزادی کا ہونا ہی مایہ سعادت و خوشبختی ہے اور دین تو بڑی سختی کے ساتھ خوشیوں سے روکتا ہے اور کسی بھی طرح لذات دنیا کو حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ انسان یا تو دنیا کی خوشیوں کو حاصل کر لے، پھر صرف آخرت کی خوشیوں کو حاصل کرے۔ حالانکہ یہ طرز فکر بھی مذہب سے گمراہ کرنے کا ایک آلہ ہے اور قیام خلاف واقع ہے۔

درحقیقت انسانی اقدامات میں دین کی مداخلت کا وجہ یہ ہے کہ بغیر کسی قید و شرط کے حصول لذات کی آزادی، خواہشات نفسانی کے سامنے خود سپردگی، فطرت و طبیعت کے احکام کے مطابق حرکت و سلوک یہ چیزیں لاشعوری طور پر حیات انسانی کی ہلاکت اور عبودیت کا سبب بنتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے مقام واقعی سے گر جاتا ہے، اور پاکیزہ فطرت کے برخلاف حق کے راستہ سے دور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ محرکات انسانی

منعوط کا سبب اور ابدی بدبختی کا سبب نہ ہوتے تو ہرگز حرام نہ کئے جاتے۔ محرمات کی محنت کا اندازہ اس لئے کیا جاسکتا ہے اور دنیا کے ساتھ آخرت کی سعادت کا راز معلوم کیا جاسکتا ہے۔ یہی صورت و احوال کی ہے کیونکہ عبادتوں کا وجوب اور ان کا بے ریا ہونا یہ انسان کے فائدہ کے لئے ہے اس لئے نہیں ہے کہ انسان کی دنیاوی خوشبختی کو ختم کر دے۔

طلب انسان کے آب و ہوا میں عبادت ایک طوفان کا کام دیتی ہے۔ عبادت درون فطر اور معیارِ اندیش کو متغیر کر دیتی ہے۔ بلکہ عبادت ایسا سنگِ زاویر ہے جس پر دین کی بنیاد استوار ہوتی ہے اور ایسا تفریق و تریقی پر بارِ قسم کا عمل ہے جو دل کی گہرائیوں تک نفوذ کر جاتا ہے اور ایسی دھار و ارتعاش ہے جو تمام فساد کے تاروں اور اندرونی پستی کو کاٹ دیتی ہے اور انسانی شخصیت کو دنیا کے نہایت دگتر وہ پاک تک پرواز کی صلاحیت عطا کرتی ہے اور ان کے لئے رشد و ہدایت کی کو ممکن بناتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ معنویات اور مسائل حیات میں کوئی عبادت کوئی تناقض نہیں پیدا کرتی بلکہ ایک سعادت مندانہ زندگی عطا کرتی ہے۔

اور شاید مسیحی تعلیمات کے نقص و غیر منطقی ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسل جیسے طاہر لوگ یہ کہنے لگے کہ دین اور خدا پر عقیدہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان ہلاک ہو گیا چنانچہ وہ کہتا ہے: کلیسا کی تعلیم انسان کو دو بدبختی اور دو محرومی سے ایک کے درمیان ڈال دیتی ہے یا تو دنیا کی بدبختی اور اس کی نعمتوں سے محرومی یا آخرت کی بدبختی اور اس کی نعمتوں اور حور و قصور سے محرومی۔ کلیسا کی نظر میں ضروری ہے کہ انسان ان دونوں بدبختیوں میں سے ایک کو اختیار کرے یا تو دنیا کی بدبختی اختیار کرے اور خود کو محروم و گوشہ نشین بنائے۔ اور اس کے بدلے میں آخرت — دوسری دنیا — کی لذتوں سے بہرہ مند ہو۔ یا اگر دل چاہے تو دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھائے تو پھر یہ طے کرے کہ آخرت میں محروم ہی محروم رہنا ہے۔

اس قسم کے افکار کا نشر ہونا مذہب کی عمیق فکر سے بے خبری کی دلیل ہے اور اس سے مذہب و ایمان کی سرزشت کا اندازہ مستقبل میں کیا ہوگا بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

دین کے بارے میں اس قسم کے تصورات کا اثر انسانی اعمال و افکار پر کتنا گہرا ہوگا اس کو طبی نظر سے سوچ کر گزرا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح فلسفہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعوری یا لاشعوری طور پر انسانی توجہات صرف مادیات پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اور اس بالکل بے نتیجہ کے نتیجہ میں معنویات و اخلاق کی دیواریں کمزور سے کمزور تر ہو گئیں۔

اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ انسان دو سختیوں میں ایک کو بہر حال قبول کرے۔ بلکہ انسان کئے یہ ممکن ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت حاصل کرے۔ اور بھلا وہ خدا جس کی رحمت وسیع ہے وہ اپنے بندوں کے لئے سعادت دنیا و آخرت کو کیوں نہ چاہے گا؟ یقیناً خدا اپنے بندوں کے لئے دونوں جہاں کی سعادتوں کو چاہے گا۔

افکار مادی کی دعوت کی دوسری وجہ شخصیت رانی اور خواہشات میں ڈوب جانا ہے جس طرح ہر ذہنی فکر عمل کی بنیاد بنتی ہے اور نظری عقائد انسان کی زندگی میں اس کے خطایس کو معین کرتے ہیں اسی طرح عمل و اخلاق بھی کیفیات ذہن کو متاثر کرتے ہیں بلکہ فکر کی بنیاد بدل دیتے ہیں۔ ثبوت پرست انسان تدریجی طور پر خدا پرستی کے بلند و بالا افکار کو اپنے ہاتھ سے دے دیتا ہے اور جس دن وہ اپنے لئے خدا کے علاوہ کوئی اور محور عملی اختیار کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہے وہ آزاد ہے اور اپنی خلقت کے ہدف و غایت کو قبول نہیں کرتا بلکہ وہ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ اپنا اپنی تمام کوشش لذت و ثبوت کے حصول میں صرف کرنے لگتا ہے۔ اور پھر اس لذت آمیز مقبوض کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی روح کے جذور جو ماضی پر نکالے ٹکھے خشک ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح خدا پرستی کا عقیدہ بھی ایک نتیجہ کی طرح ہے جو ایسی زمین کو چاہتا ہے جو اسکی نشوونما میں مدد دے۔ اور یہ نتیجہ پاک و پاکیزہ محیط میں پھوٹتا ہے۔ ایسا محیط

جس میں انسان کے لئے یہ ممکن ہو کر مخصوص چوکھٹے میں رہ کر اپنے اصلی خطوط کو معین کرتے ہوئے سہولت و سرعت کے ساتھ اپنے بلند و برتر کمال کو حاصل کر سکے۔ اگر خدا پرستی کا عقیدہ ایسے ماحول میں ہے جو اس کے لئے ماسد ہے تو کبھی بھی تہیو بخش نہ ہوگا۔

زندگی کی ہیا ہو اور غوغاء، مشینی و صنعتی پیداوار کی کثرت، ثروت و قدرت کی زیادتی، کمال و جمال کا ہر جگہ وجود، مشہورتوں کے وسائل کی فراوانی نے انسان کو اتنا غافل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول گیا ہے اور وہ اپنی پوری طاقت اس بات پر صرف کرتا ہے کہ اپنے کو دین و دنیا اور اس کے مسائل سے کسی بھی طرح بچائے سکے اور کسی بھی قیمت پر کنٹرول کرنے والی طاقت کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھ کوئی مادی نفع نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے ہوس و خواہش کے طوفان کے سامنے وہ ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔

اسی لئے جس جگہ کے لوگ گناہوں میں ڈوبے ہوں اور قید و بند سے آزاد ہوں اور عمل و کردار میں کسی ضابطہ کے پابند نہ ہوں وہاں پر صرف مذہب کا نام ہی نام باقی رہ سکتا ہے اور کام جو، اور مادہ پرست حضرات کبھی بھی خدا جو، اور خدا پرست نہیں ہو سکتے۔ اور فطری بات ہے کہ مادی اور الہی دو فکروں میں جب ایک فکر فضا پر چھا جائے گی یعنی انسانی ذہن میں بیٹھ جائے گی تو دوسری فکر کی وہاں جگہ ہی باقی نہ رہے گی۔ لہذا مادی خواہشات روح عبودیت خدا کو انسان سے دور کر دیں گی اور یا عبودیت خدا مادیت کو بھگا دے گی اور جب خواہشات نفس مغلوب ہو جائیں گی اور سعی مسلسل الہی مقاصد کی طرف انسان کو سٹکاگی تو انسان اپنے مادی اقدامات کو ترک کر دے گا اور فطرت کے قید و بند سے آزاد ہو کر انسانی حریت کا ایک کامل نمونہ بن جائے گا۔

اور ان کا ہدف جتنا بلند اور دور ہوتا ہے اس کی طرف چڑھنا اور اس کے لئے کوشش کرنا بہت زیادہ اور طولانی ہوتا ہے پس اگر ہم خدا کو اپنا ہدف بنالیں تو وہ ہدف و مقصد بھی بہت بلند ہے اور اس تک پہنچنے کا راستہ بھی بے انتہا روشن و مستقیم ہے۔ اور

بہت سے مسائل و مشکلات کا جواب دنیا بھی آسان ہو جائیگا۔ اور نفی طاغوتِ نفس کے زیر سایہ آزادی بھی جنم لے گی۔

اگر ہم خدا کو بعنوان مقصد و ہدف قبول کریں تو تکامل و آزادی کے درمیان تغاہم بھی ہو جائیگا اور تکامل کی خاطر بشر جو رنج برداشت کرتا ہے اور جو تلاش و جستجو کرتا ہے وہ حیات ابدی کے عقیدہ اور انگیزہ الہی کے ساتھ اپنے مفہوم کو حاصل کرے گا۔ خدا کی بندگی سے جو تکامل حاصل ہوتا ہے وہ نہ تو حریت سے محروم رہتا ہے اور نہ انسان کی غلامی و بندگی کا سبب بنتا ہے۔

ہم اسی وقت آزادی کا دعویٰ کر سکتے ہیں جب ہمارے ساتھ کائنات کے سیر تکاملی میں عزم محکم و شخصیت صلاحیت کے ساتھ شریک ہوں۔ فطرت کے دستور یا تاریخ کے جبر کی بنا پر نہ ہوں۔ کیونکہ فطرت کی خواہش کے مطابق ساتھ دنیا معلومت و منفعت کے برخلاف ہو کر فطرت کی اسیری کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور جو تکامل جبر و اکراہ کے ساتھ فطرت کی پیروی کر کے حاصل ہو وہ ایک اندھی تقلید کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

مکتب مادی جو تکامل و سعادت فطرت کے قید و بند سے خارج ہو جانے کو سمجھتا ہے۔ ہم اس مکتب میں حریت و تکامل کے درمیان ناقص محسوس کرتے ہیں۔ جس تکامل کو انسان بطور ذلیل و غلیظانہ بڑی کوشش و تلاش سے اس کی پیروی کرے لیکن اس کے آئندہ نتائج و ثمرات سے کوئی فائدہ نہ اٹھا وہ کیا مفہوم اور کیا معنی رکھتا ہے؟

کیا سعی و کوشش — اگرچہ انسانی عوامل کی بنیاد پر ہو — اس شخص کے لئے جو مبدع وجود کا قائل نہ ہو لغو اور بیکار نہیں ہے؟ چاہے وہ معاشرہ کے لئے کتنی ہی غیر بخش اور مفید ہو۔ کیا وہ ایک لغو اور غیر منطقی عمل محبوب نہ ہو گا؟

اگر میری قرآن کی محال انسانیت اور تکامل نو بع بشر کے لئے ہو۔ لیکن اس قرآنی سے شخصی طور پر مجھے کوئی فائدہ نہ پہونچے تو یہ مقصد خلافِ حریت بھی ہے اور خلافِ منطق و عقل بھی! مادی مدریسہ کے زعماء جو یہ خیال کرتے ہیں کہ تکامل و قید و بند کے درمیان ایک متضاد

۱۱۳

تفادہ ہے۔ ان کی نظردقیقت اسی مادی تکامل کی طرف ہے جو الہی نہیں ہے اور واقعہ نفس
الامرین جس کا کوئی مقصد و ہدف نہیں ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

خدا کے صفات اور خصائص

قرآن خدا کی کس طرح توصیف کرتا ہے؟ جس وقت ہم کسی علمی شخصیت اور دانشمند مولف کی حدود و معلومات کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کے علمی آثار کا مطالعہ کرتے ہیں اور اسی کو مورد تحقیق قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم کسی فنی کار کی قدرت و استعداد کا اندازہ لگانا چاہیں تو اس کی فنی متوجہات اور مصنوعات کی تحقیق کرنی پڑے گی۔

اسی طرح اگر ہم خدا کے صفات و خصائص کا ادراک کرنا چاہیں تو اس کے موجودات و مخلوقاتِ دقیق میں تدبر کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر اپنی حسیہ قدرت خالق کی حکمت و حیات و قدرت و علم کا اندازہ لگا پائیں گے۔

اگر بحث یہ ہو کہ خدا کی ہر ملی ذرے اور مکمل طور سے معرفت حاصل کرنی چاہئے تو پھر ہم کو یہ قبول کر لینا چاہئے کہ ان فی قوت معرفت اتنی جامع شناسندہ پروردگار پر قادر نہیں ہے اور نہ ہی اسکی خصوصیات کے حدود و سرحد کو پہچانا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہر قیاس و دلیل غلط ہے کیونکہ پوری کائنات میں بشر کے لئے علمی و فکری لحاظ سے جو چیز مشہور ہے وہ سب کی سب خدا کی مصنوع اور اس کے امر و ارادہ کی محصول ہے اور خود اسکی ذات نہ جزو طبیعت ہے اور نہ اس کے مخلوق کے سنخ سے ہے تاکہ اس قسم کے وجود کی ماہیت کا ادراک از روئے قیاس ممکن ہو سکے۔

خدا ایک ایسا وجود ہے کہ جس کی معرفت ذات کے لئے نہ تو کوئی مقیاس ہے اور نہ اسکی قدرت یا علم کی مقدار کا اندازہ لگانے کے لئے کوئی عدد ہے اور نہ ہی احصا کا کوئی طریقہ ہے پھر کیا ایسی صورت میں اس کی حقیقت ذات یا صفات کا ادراک کرنے کے لئے انسان عاجز و

تغیر نہیں ہے۔ !

لیکن کون دوسیع و عتیق معرفت کی عاجزی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم کسی بھی طرح اسکی معرفت حاصل ہی نہیں کر سکتے یعنی معمولی معرفت بھی نہیں حاصل کر سکتے۔ کیونکہ نظام وجود چنچ چنچ کر اس کے صفات کو تیار رہا ہے۔ اور ہمارے بس میں یہ بات ہے کہ مظاہر فطرت و جمال طبیعت میں غور کر کے اس کی قدرت و ابداء کو پہچان لیں۔ ارادہ و شعور، علم و آگاہی، نظام وجود میں ہم آہنگی، زندگی کے گونا گون مظاہر ہمارے لئے اس امکان کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہاہیم مذکورہ اور تمام وہ چیزیں جو مقصد و ہدف کی حکایت کرتی ہیں یہ کسی ایسے خالق کے ارادہ کی تابع ہیں جو ان تمام نقصانوں سے مصطفیٰ ہے اور جسکے قبضہ قدرت میں یہ بھی ہے کہ اس عالم کے موجودات کو برعکس کر دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز خدا کی شناخت کر سکتی ہے اور اس کے وجود کو لمس کر سکتی ہے۔ وہ وہی عجیب و غریب قوت فکر ہے جو اسی منبع نابینا کے فرمان کی ایک بجلی ہے جو مادہ پر چمکی ہے اور وہی فرمان ایزدی ہے جس نے فکر کو اورادک معنی اور نفوذ الی الحقیقہ کی طاقت بخشی ہے۔ اور اسی مہریت عظیمہ سے معرفت حق متعین ہوتی ہے۔

● اسلام میں خدا کی معرفت جدید اور واضح بنیادوں پر رکھی گئی ہے۔ اور قرآن — جو مصدرِ ماسی ہے — شناختِ جہاں بینی اسلام کے لئے — اس مسئلہ کا حل بطور سوال و جواب نفی و اثبات کے درمیان کرتا ہے۔ قرآن پہلے تو واضح دلیلوں سے پروردگارِ مطلق کی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ توحید تک پہنچنے کے لئے شرک اور ماسوی اللہ کی بندگی کے حجابات کا اٹھا ضرور ہے۔ اور یہ پہلا قدم ہے جو توحید تک پہنچنے کے راستہ کو ہمارا کرتا ہے۔

قرآن اعلان کرتا ہے :

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُلُوبًا مِثْلَ قُلُوبِنَا أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً؟ قُلْ هَاتُوا بُحْبُورَتَكُمْ هَذَا ذِكْرٌ

مَعْنَى وَذَكَرْ مَنْ جَاءَ بَعْدَكَ مِنَ الْكُفَّارِ لَعَنَهُمُ اللَّهُ لَا يَفْعَلُونَ الْحَقَّ فَهُمْ مُعَذِّبُونَ (انبیاء: ۱۷)
 کیا ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر کچھ اور معبود بنا رکھے ہیں؟ (دے رسول) تم کہو کہ بھلا
 اپنی دلیل تو پیش کرو جو سب دزمانیں ہیں۔ ان کی کتاب (قرآن) اور جو لوگ مجھ سے
 پہلے تھے ان کی کتابیں (توریت وغیرہ) یہ (موجود) ہیں (ان میں خدا کا شریک بنا رہا)
 بلکہ ان میں سے اکثر توقع (بات) کو جانتے ہی نہیں (تو جب خدا کا ذکر آتا ہے) بگو
 منہ پھیر لیتے ہیں۔

نیز اعلان کرتا ہے :-
 قُلْ أَطِيعُوا دِينَ اللَّهِ مِمَّا لَا يَكِلُكُمْ لَكُمْ مَضْرَ أَذْ لَا تَقْعَا؟ وَاللَّهُ
 هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (مائدہ: ۷۵)

جس شخص کا مذاقہ تو حید سے ختم ہو جاتا ہے وہ عالم و جود میں اپنے رابط اور موقعیت کو بھول جاتا
 ہے اور خود اپنے سے بیکار ہو جاتا ہے اور اپنے کو کچھ کر دیتا ہے۔ اپنے سے بیکارگی کی آخری صورت
 یہ ہوتی ہے کہ انسان فطرت انسانی سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے۔ اور مختلف اندرونی و بیرونی عوامل
 کی تاثیر کی وجہ سے انسان اپنی ذات و فطرت سے اجنبی ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان اپنی ذات
 سے اجنبی ہو جاتا ہے تو اپنے خالق سے منقطع ہو جاتا ہے اور دوسری زندگی میں داخل ہو جاتا
 ہے اور عقل و منطق کے بدلہ اس بندگی کو قبول کر لیتا ہے اور یہی چیز مطلقاً ہر طبیعت کو خدا بنانے
 کی طرف بازگشت ہے۔ اب خواہ ہم قبول کو سجدہ کریں یا اصالت مادہ کے قائل ہو جائیں دونوں
 باتیں ارتداد اور رجعت قبقری ہیں اور یہ چیز انسان سے عامل رشد کو چھین لیتی ہے۔

ایسی صورت میں تو حید ہی وہ تہا قوت ہے کہ جس کے ذریعہ انسان اپنی موقعیت کو واپس
 پالتا ہے اور طبیعت انسانی اور ماییت ہستی سے ہم آہنگی کے ذریعہ اپنے وجود کو کمال بخشتا ہے
 تاہم یہ نہیں دیکھے تمام نبوتیں اور آسمانی الہی رسالتیں الوہیت و ربوبیت و توحید کا پیغام
 لیکر اپنے مشن کا آغاز کیا کرتی تھیں۔ انسانی لغات کے اندر توحید سے زیادہ پر معنی لفظ دیکھی ہی نہیں

اور ہم نے آدمی کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے اس کو ایک جگہ دعوت کے رحم میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم ہی نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا۔ پھر ہم ہی نے منجمد خون کو گوشت کا ٹوٹھڑا بنایا پھر ہم ہی نے ٹوٹھڑے کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہم ہی نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم ہی نے اس کو (روح ڈال کر) ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔ تو (سبحان اللہ) خدا بابرکت ہے جو سب بنانے والوں سے بہتر ہے۔

جس وقت جنی نقاشی و صورت بندی کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ تمام اعضا آنکھ، کان، مغز اور دیگر اعضا اپنے مخصوص وظیفہ کو اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ قرآن انہوں کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ کیا یہ عجیب و غریب کمالات خدا کے بغیر معقول اور قابل قبول ہیں؟ یا یہ ظواہر قطعی طور سے اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا وجود دقیق ہندسہ، صحیح قیادت، عالم ارادہ معین پروردگار پر مبنی ہے؟ خلاصہ یہ کہ کیا سب کو کھانے، پینے، بڑھنے، مدبر کے بغیر اپنے وظیفہ سے آشنا ہو جاتے ہیں؟ اور اپنے مقصد کو اس دقیق و منظم حیرت انگیز طریقہ سے جہاں ہستی میں شکل کرتے ہیں؟ قرآن خود اس کا جواب دیتا ہے:

هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (حشر: ۳)

وہی خدا (تمام چیزوں کا) خالق، موجد، صورتوں کا بنانے والا ہے۔

بس وہی اجزائے علیہ کا خالق ہے اور وہی ہر عضو کے اجزاء کو پیدا کر نوا لا ہے اور وہی صورت مختلفہ کا مصور ہے۔

ڈاکٹر کمال د. ۱۹۵۷ء کہتا ہے:

”اعضاء کی ترکیب بچوں کو سنائے جانے والے قصوں اور کہانیوں میں جنات سے زیادہ

عالم ملول کے معنی اس زندہ و محاسن و متحرک موجد کے ہیں جو زندہ موجودات کے بدن کا اصلی مفرقہ ہیں، بسو لھا جیسے ہے۔

مشابہ ہیں۔ اور یہ سلولھائے بدن کا کارنامہ ہے جو گویا اس بات سے واقف تھے کہ اعضا کو اس شکل و صورت میں ہونا ہے اور یہ اپنے محیط داخلی کی مدد سے طرح ساختمان اور مصالح کا گراں کو آمادہ کرتے ہیں۔

ہر اس محسوس چیز کو جسے انسان اپنے ارد گرد دیکھتا ہے۔ ان کے بارے میں قرآن پر عنوانِ مسائل اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کے بارے میں وقتِ نظر سے سوچنا چاہئے اور نتیجہ حاصل کرنا چاہئے ارشاد ہے :-

وَاللَّهُمَّ إِلَهَ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ إِنَّ
فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفَلَاقِ
الْبَقِي تَجَرُّبِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ
مِنْ مَاءٍ فَأَخْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا فَبَتِّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ
وَتَضْرِبُ الْبَرْيَاحُ وَالسَّحَابُ الْمَجْرِيْنِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ
لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (بقرة/ ۱۶۳، ۱۶۴)

اور تبارِ معبود تو وہی کیسا خدا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں جو بڑے امہرِ انِ رحم
کرمیوالا ہے۔ بیشک آسمان و زمین کی پیدائش اور رات دن کے بدل میں اور
کشتیوں (جہازوں) میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں (مال تجارت وغیرہ) دریا
میں لے کر چلتے ہیں اور پانی میں جو خدا نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو
مردہ دیکار، ہونے کے بعد جلا دیا و شاداب کر دیا، اور اس میں ہر قسم کے جانور
بھیلا دیئے اور ہواؤں کے چلاسنے میں اور ابر میں جو آسمان و زمین کے درمیان
(خدا کے حکم سے) گھبراتا ہے۔ (ان سب باتوں میں) عقل والوں کے لئے (دلیلی بڑی)
نشانی ہیں۔

لے انسان موجد دانستہ نافر

قُلْ اَنْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؟ (یونس ۱۸)
وہ رسول! تم کہہ دو کہ خدا دیکھو تو سہی کہ آسمانوں اور زمین میں (خدا کی نشانیاں) کیا
کچھ نہیں۔

قرآن تادیخ بشر، اس کے تحولات، گزشتہ قوموں کے حالات کو صرف اس لئے بیان کرتا ہے
کہ یہ معرفت کے مخصوص مصادیق ہیں اور انکشافِ حقیقت کے لئے مختلف اہم سابقہ کے فتوحات،
ناکامیاں، عزت، ذلت، خوشنختی، بدنختی کا بھی ذکر کرتا ہے تاکہ قوانین کی معرفت اور
دقیق و منظم حسابائے تاریخی کی شناسائی سے انسان خود بھی فائدہ اٹھا سکے اور انسانی معاشرے
بھی سودمند ہو جائے اور ارشاد ہوتا ہے :-

فَدَخَلْتُ مِنْ قَبْلِهِمْ مَكَّنٍّ فَسَيِّرُوا فِي الْاَرْضِ فَاَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (آل عمران ۱۳)

تم سے پہلے بہترے واقعات گزر چکے ہیں پس خدا رو کے زمین پر چل پھر دیکھو تو
کہ اپنے اپنے وقت کے پیغمبروں کو، جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔
نیز ارشاد ہے :-

لَقَدْ اَنْزَلْنَا الْاَيْكُم كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ، وَكَمْ قَصَمْنَا
مِنْ نَّبِيٍّ يَّهْتَفِبْهٖ كَاَنَّهُ ظَالِمٌ ؕ وَاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (انبیاء ۲۰)
ہم نے تو تم لوگوں کے پاس وہ کتاب (قرآن) نازل کی ہے جس میں (تمہارا بھی) ذکر فر
ہے تو کیا تم لوگ (آنا بھی) نہیں سمجھتے اور ہم نے کئی بستیوں کو جن کے رہنے والے
کسرش تھے، برباد کر دیا اور ان کے بعد دوسرے لوگوں کو پیدا کیا۔

قرآنی مجید نفس انسانی کو بھی سودمند فکر اور کشفِ حقیقت کے لئے ایک دوسرا منبعِ قرارت
ہے اور اس کی اہمیت کا اس طرح اعلان کرتا ہے :-

سَتَرِيْهِمْ اَيَاتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتٰى يَتَّبِعُوْنَ لَهْمُ اَنَّهُ الْغَقُّ (مجادلہ ۱۷)

ہم عنقریب ہی اپنی قدرت کئی ناظران عالم میں اور خود ان میں بھی دکھا دیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی یقیناً حق ہے۔
 وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ ۚ قَدْ فِي الْأَرْضِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (الدّٰرُ الْاٰلَاہِیّۃ)
 اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور خود تم میں بھی ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔

یعنی یہی تناسب و زیباجسم اپنے فعاہت و فعل و الافعال اور دقیق و ظریف کنیک کے ساتھ کہ جس میں غرائز و قوتوں کے انواع، انسانی و حیوانی متنوع احساسات و عواطف و ادراکات خصوصاً حیرت انگیز قوت فکر کو ودیعت کیا گیا ہے۔ اور ابھی تک بشر نے غیر مرئی اور معنوی قوتوں کی راہ کے شناسخت میں، اور اس کی جسم بادی کے ساتھ کیفیت ارتباط کے سلسلہ میں چند قدم سے زیادہ ترقی نہیں کی۔ اور ابھی تو اس میں معرفت کے فیاض منابع موجود ہیں۔
 قرآن اعلان کرتا ہے کہ اگر تم اپنے نفس میں غور و فکر، تحقیق و تفتیش کرو تو تم کو منبع لا بزال و غیر محدود و بے نیاز اور توانائی بے پایاں تک پہنچا دے گا یہ جان لو کہ وہ حقیقت غیر منہا ہی ہے کہ جس نے ایسے بڑا ر مجموعہ کو مکمل وحدت کے ساتھ ایک جگہ مرکب کیا ہے اور مرکز ہستی میں لے آیا ہے۔

اس لئے ایسی زندہ نشانیوں اور حجج قاطعہ کے بعد جو خود تم میں ودیعت کی گئی ہیں اور تمہارے اختیار میں ہیں عدم معرفت خدا کے سلسلہ میں تمہارا کوئی بہانہ اور کوئی عذر قابل قبول نہ ہو گا۔
 قرآن الہی صفات کے بارے میں بھی نفی و اثبات کی روش سے استفادہ کرتا ہے۔ یعنی خدا کے کچھ صفات ایسے ہیں جن کا وہ دارا ہے — صفات ثبوتیہ — جیسے علم، قدرت، ارادہ اور وجود خدا نہ تو موقوف بالغیر ہے اور نہ موقوف بالعدم اور اس کی ذات کا کوئی آغاز نہیں ہے۔ کائنات گردش میں ہے۔ مگر سوائے اس خدا کے سر و ارادہ و قدرت کے کسی سے طاقت و قوت نہیں نہیں حاصل کرتی۔

قرآن کا ارشاد ہے :-

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَنُ
الرَّحِيمُ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤَيَّنُ
الْمُهَيَّمُ الْعَزِيزُ الْعَبَّاسُ الْمَتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ (شعر ۱۰۷)

وہ ہی خدا جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے بڑا
مہربان نہایت رحم والا ہے وہ وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں (یعنی)
بادشاہ، پاک ذات (ہر عیب سے) بری امن دینے والا نگہبان، غالب، زبردست،
بڑائی والا، یہ لوگ میں کو (اس کا) شریک ٹھہراتے ہیں اس سے پاک ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعَالَمِينَ عَمَّا يُصِفُونَ (الصافات ۱۸۰)
یہ لوگ جو باتیں خدا کے بارے میں لیا کرتے ہیں ان سے تمہارا پروردگار عزت
کا مالک پاک صاف ہے۔

اور پانچہرفہ اسکے صفات منفی ہیں جن سے خدا مبرا ہے۔ صفات سلبیہ۔ مثلاً خدا نہ جم
ہے نہ مکان رکھتا ہے، نہ شریک رکھتا ہے، مادی سرحدوں کا امیر نہیں ہے نہ والد ہے نہ مولود،
اس کی ذات میں حرکت و تغیر کا وجود نہیں ہے کیونکہ وہ کمال محض و فعلیت ہے۔ آفرینش مخلوق
کا کام کسی کے سپرد نہیں کیا ہے۔ قرآن میں ہے :-

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ، اللَّهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (احد ص ۱۰۳-۱۰۴)
(مترجم) تم کہتے ہو کہ خدا ایک ہے، خدا بے رحم ہے، نہ اس نے کسی کو جنا نہ اس کو کسی نے جنا اور
اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

یقیناً محدود و قفل بشریات پروردگار عالم کے باوجود اس کے کوئی فیصلہ کرنے سے عاجز و نامر
ہے اور ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اس وجود کے کبریات کے ادماک سے عاجز ہیں جس کا
ہمارے افکار و احساس میں نہ کوئی مثل ہے نہ نظیر۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عین ترین مکاتیب فکر،
اور معرفت بشری کے عظیم ترین اسلوب تمجید ہو کے رہ گئے ہیں اور لائق تہنیت و سبیلہ کے مستحق ہیں۔

ایک ذات یگانہ تمام معنی انگہ اور ترکیبے منفرہ تمام کمالات کی جامع ہے۔ کیونکہ وجود مطلق لامحدود سے بڑھ کر کوئی کمال نہیں ہے۔ اور اگر اس وجود لامحدود سے خارج کوئی کمال ہوتا تو اس ذات کی محدودیت لازم آتی —

جس طرح تمام موجودات کا ایک ذات واجب الوجود تک منتہی ہونا ضروری ہے باین معنی کہ اس ذات کا وجود از خود ہو کر کسی غیر سے حاصل نہ ہوا ہو بلکہ وہ ذات عین وجود ہو اور تمام وجود اپنے وجود میں اسی ذات اور اسی وجود مطلق سے متعلق ہوں — اسی طرح اس کائنات کے اندر جتنے بھی صفات کمال پائے جاتے ہیں مثلاً حیات، قدرت، علم وغیرہ ان کا بھی ایک حیات و قدرت و علم مستقل مطلق کی طرف رجوع ضروری ہے اور ان تمام صفات کا اسی وجود لامحدود کے فضائل سے ہونا ضروری ہے۔

آئیڈیل خدا کے شرائط

یقیناً خداوند متعال۔ جیسا کہ قرآن نے بھی کہا ہے۔ معبود کا من مطلق کے تمام صفات کا جامع ہے۔ وہ حسن و جمال و کمال کا خالق ہے تمام قوتوں اور قدرتوں کا ایجاد کرنا والا ہے۔ اس کی قدرت ایسا گہرا اوقیانوس ہے جس میں غواص فعل معمولی موجدوں کا باز کچھ بن جاتا ہے۔ اسی نے زمین و آسمان کو گرنے سے روک رکھا ہے۔ اگر ایک سکند کے نے بھی اپنی غایتوں سے چشم پوشی کرے یا اس کائنات سے صرف نظر کرے تو عالم ہستی بستی سے بدل جائے اور گرد و غبار بن کر لاپتہ ہو جائے، کائنات کا ہر ذرہ اپنے وجود و ثبات و پائیداری میں اسی پر بھروسہ کرتا ہے۔

وہ تمام نعمتوں، سعادتوں کا بخشنے والا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ہماری پیشانی ہے وہ جب کسی چیز کو خلق کرنا چاہے تو کہیں کہہ دے بس وہ چیز ہو جاتی ہے۔

اسی ذات سے حق و حقیقت ہے، آزادی، عدالت اور دیگر فضائل و کمالات اسی کے پر تو صفات کا کرشمہ ہیں۔ اس کی طرف پرواز اور اس کی بارگاہ ذوالجلال میں تقرب کا مطلب تمام ظالم کو ان کے اعلیٰ درجہ میں حاصل کرنا ہے جس نے اس سے لو لگائی اس کو ہربان، نہیں اور پر محبت و دین پایا، جس نے اس پر بھروسہ کیا اس نے اپنی امید کی بنیاد ایک محکم و مضبوط پایہ پر رکھی۔ اس کے غیر سے دل لگانا باطل اور اس کی بنیاد برباد ہے۔

وہ کائنات ہستی کی جزئی ترین حرکت و جنبش سے باخبر ہے۔ وہ ہماری خوشنحی کے خطایہ کو معین کر سکتا ہے۔ وہ انسان کی زندگی اور اس وسیع کائنات میں اس کے روابط کے لئے شریعت ایجاد کر سکتا ہے کیونکہ ان کے واقعی مصالح سے وہی واقف ہے اور یہ حق صرف پروردگار عالم ہی کو ہے کیونکہ یہ اس کی ربوبیت کا طبعی و منطقی نتیجہ ہے اور صرف الہی برنامه کے مطابق

عمل کرنا ہمارے نفوس کی بندی کا فیصل ہے۔ اور یہ کیونکہ ممکن ہے کہ انسان حقیقت و عدالت سے انہی محبت کرے کہ اس کے لئے جانی قربان کرتے پر تیار ہو مگر منبع عدل و حق سے اعراض کرے؟

اگر کوئی وجود پرستش کے لائق ہوتا تو سوائے خالق کائنات کے علاوہ — جو محض کائنات ہے — کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی چیز اور نہ کوئی شخص ایسا ہے جو انسان کو اپنا بندہ اور شاگرد بنائے کیونکہ دیگر تمام اندیشیں نہ تو مطلق ہیں نہ اخیل اور نہ ہی اپنے پرانہ کام رکھتی ہیں بلکہ ان کی ارزش نہی ہے اور مراتب مافوق کے وسیلہ کا حکم رکھتی ہیں۔

خالق کے لئے عبودیت و بندگی مخصوص ہے اس کی اصلی دلیل یہ ہے کہ اس نے ہم کو نعمتوں سے نوازا ہے اور ہمارے جسموں میں ودیعت کی ہوئی طاقتوں، استعداد اور ہمارے ذخائر و ضروریات و امکانات کا عالم ہے۔ لہذا عبودیت صرف اس خدا کے لئے مخصوص ہے جس کی طرف ہر موجود اپنے وجود میں استناد کرتا ہے اور اسی پر اعتماد کرتا ہے۔ اور اسی کی مدد سے کائنات کا قافلہ اسی کی طرف رواں دواں ہے اور اس کا حکم اس کائنات کے لفظ نقطہ میں نافذ ہے۔

بنابرین انبیاء و پرستش مطلق بھی اسی ذات اقدس کے لئے مخصوص ہے جو کائنات کے ذریعے کے ذریعے کے دل میں موجود ہے۔ اور دوسرے افراد جو ہماری طرح ہیں اور عاجزی و ناتوانی ان کے پورے وجود میں ہے وہ کسی بھی طرح خضوع کے لائق نہیں ہیں۔ اور نہ وہ اس لائق ہیں کہ خدا کے قلمرو میں اپنی زندگی کے اندر فاسدانہ تصرف کریں اور خود انسان اس کے کہیں بزرگ و بزرگ کہ ان کے سامنے خضوع کرے۔

انسان کو جس وجود کی پرستش کرنی چاہئے وہ خدا ہے وعدہ لا شریک لہ ہے اور اسی کی ذات ایسی ہے کہ انسان پر واجب ہے کہ اپنی ساری کوششوں کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے صرف کر دے اور خدا کے علاوہ کسی بھی محبوب و موجود کی خوشنودی کو خدا کی خوشنودی پر ہرگز مقدم نہ کرے۔ اور اس کا مطلب انسان کی بزرگی اور اس کی قدم و منزلت کا قائل ہونا ہے۔ انسان ایک چھوٹا سا قطرہ ہے اگر یہ قطرہ دیا کے ساتھ نہ رہے تو ہمیشہ معرض طوفان میں

اور ناقب قنہ و فساد کی زد میں رہے گا اور آخر کار خشک ہو جائیگا۔ مگر جب اس منبع فیاض سے مل جائیگا تو ہجویت واقعی پائے گا اور جاودانی بن جائیگا۔ اور اس کا خدا اس کی زندگی کا صحیح معنی ہو جائیگا۔ اور تمام حوادث زندگی کے پس پشت اسی کی ذات ہوگی۔ اور اسی جگہ سے ہمارے لئے عوالم افراد کی وسعت و ضیق کا ان کے اختلاف کے اعتبار سے سمجھنا ممکن ہو جائیگا۔ ہم یا تو فضل و شرف و عدالت اور تمام محترم و مستحسن خصصتوں کو وحی و خیالی فرض کریں یا بحکم و جہان و فطرت اور ضرورت واقعی ان کو دیکھنا میں شکا کریں، دونوں صورتوں میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس وجود اور کمال مطلق کی حققت کبیر کے سامنے جو خوب و حیات و قدرت و تمام ارزشوں کا فیضان کرنا والا ہے، حضور و سرچوں پر ہم جو غور کر کے دیکھیں تو معلوم ہو جائیگا کہ عالم کے بے شمار موجودات، اور ہماری وہ ضرورتیں جنکی جڑیں ہمارے وجود کے گہرا ہوں تک پہنچی ہوئی ہیں یہ سب کی سب ایک منبع اور ایک نقطہ تک منتہی ہوتی ہیں اور وہ خدا ہے۔ کہ کائنات کی تمام واقعت و ہائیت کی اضافت و نسبت اسی کی طرف ہے اور سب کو تعلق اسی سے ہے اور جو وجود اس نقطہ سے شروع ہوتا ہے پھر اسی کی طرف پہنچتا ہے اور تنہا اس کی ذات ہے جو لائق عبادت ہے اور جب بندہ اس کو پائے اور اس کی عبادت کرنے لگے تو اس کو دوست رکھے گا اور اس کے جلال و کمال مطلق کو اس طرح دوست رکھے گا کہ اس کے سوا کو بھول جائیگا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تمام موجودات عدم سے وجود میں آئے ہیں اور یہ اپنی مدت بقا را چاہے وہ مختصر ہو یا لمبی — میں خارج کے محتاج رہے ہیں اور ان کے چہرہ پر مقہوریت اور عدم استقلال کی مہر لگی ہوئی ہے۔

جس معبود کی ہم کو تماشہ ہے کہ مل جائے تو اسکی قربت حاصل کریں اگر وہ ہماری خواہش و نکالیف سے اور حقائق عالم سے جاہل ہو یا ہماری امیدوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہو بلکہ ہماری ہی طرح قاصر و ضعیف ہو تو ہم اس کو بھلا اپنا ہدف و غایت کیونکر بنا سکتے ہیں؟ اور کمال مطلق سے اس کی توصیف کیونکر کر سکتے ہیں؟ عبادت اگر کسی حاجت کے پیشینہ نفس ہے تو صرف

خدا ہی اسکو پوری بھی کر سکتا ہے کوئی دوسرا پوری نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید کا اعلان ہے:
 اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَنْ دَعْوٰی اللّٰهِ عِبَادًا لَّمْثَالُکُمْ (اعراف / ۱۹۳)
 بے شک وہ لوگ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ (جی) تمہاری طرح (خدا)
 کے مانند ہیں۔

خاصہ یہ کہ خیر خدائے سامنے حضور یا توجہ کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور ہمارے معیڑ میں
 ہیں اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی معبود انسان کی عبادت کا مستحق ہوگا اور انسان کو سعادت
 کی بلند چوٹی تک پہنچا سکتا ہوگا تو وہ ہر نقص و عیب سے پاک ہوگا اور اپنی دائمی شعاہوں سے موجودت
 کی زندگی کا ممد و معاون ہوگا اور اپنے جمال سے ہر صاحب خیر کو اپنے سامنے جھکا سکتا ہوگا، انسان
 کی تمام روحی و معنوی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہوگا اور اس کی شناخت کا راستہ پالینا سولے فطرت
 انسانی کے متضاد حقیقی تک پہنچنے کے بغیر ممکن ہے۔

ورنہ اگر ہمارا خدا بعض جہات میں ممتاز ہو وہ بعض ضرورتوں کو پوری کرنے پر قادر ہو تو
 جس وقت ہم اپنی ضرورتوں کو پورا کریں تو ہمارے نزدیک مصفیت الوہیت سے گر جائیگا۔ کیونکہ اب
 ہم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ اور ہمارے توقف کا سبب ہوگا۔ اور نہ صرف یہ کہ ہماری فطرت پریش
 آئینہ عبادت خیر کو تشفی نہ دے سکے گا بلکہ ہم کو کسی بھی بلند و برتر کمال کے بارے میں تفکر سے مانع
 ہوگا۔ اور ہم کو ایک تنگ و محدود دائرہ میں اسیر و مقید کر دے گا۔ اور پھر مدارج علیا کی
 طرف ترقی کی ہماری خواہش بھی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر ہمارا خدا ہمارے مرتبہ کا ہوا۔ چہ جائیکہ
 ہم سے پست تر درجہ کا ہو۔ تو ہمارے صلاح کا سبب نہ بن سکے گا اور نہ ہماری ترقی کا وسیلہ
 ہو سکے گا۔ بلکہ ہم اگر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اور زیادہ قعر مذلت و انحطاط میں پہنچ جائیں گے
 اور ہماری مثال اس مقناطیسی عقرب کی ہو جائیگی جو اپنے فطری و طبعی رخ سے اعراض کر کے دوسرے
 اجنبی عنصر کے قیف مقناطیسی میں داخل ہو جائے جس کا نتیجہ حیرت و پریشانی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔
 اور اس وقت ہمارے لئے ہلاکت و بد بختی ایک ایسی ابدی نئی بن جائے گی جس سے کبھی بھی مفر ممکن
 نہیں ہوگا۔

دعاشا کرین کی بہترین علامت ہے۔

وہ معبود جو انسان کی حرکت کو جہت بخش سکتا ہے۔ اور چلنے والوں کے راستہ میں تاریکی دور کر کے روشنی عطا کر سکتا ہے وہ وہی خدا ہے جو اس بات پر قادر ہے کہ انسانی آرزوؤں کو پورا کر سکے اور جو دوامِ بقوت و تاثیر و وجود کے اعلیٰ ترین درجات پر فائز ہوتا کہ آثار معنوی کا منشأ اور فکر و عمل کا ہادی بن سکے اور انسان کے بہتر نکالی کو آسان بنا سکے۔

انسان کی کوئی بھی سعی یا حرکت جو غلط مقاصد کی طرف ہو وہ انسان کو اس کی شخصیت سے دور کر دیتا ہے اور اس کی باہیت و حقیقت کو مسخ کر دیتا ہے۔

اگر انسان خدا کی معرفت سے دور ہو چکا ہے تو اپنا صحیح ادراک نہیں کر سکتا۔ خدا فراموشی کا لازمہ خود فراموشی ہے اور حیاتِ بشر کے مقاصد کی سے غافل ہونا ہے۔ اور جس دنیا میں وہ پہنچ چکا ہے اس میں رہ کر ہر قسم کے بلند افکار سے غافل ہو جاتا ہے۔

جس طرح غیر خدا سے وابستگی انسان کو اپنے سے بیگانہ بنا دیتی ہے اور اس کو ایک متحرک مشین بنا دیتی ہے۔ اسی طرح خدا پر بھروسہ کرنا اور اس کی بارگاہ میں رجوع ہونا، غفلت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے، اور حیاتِ معنوی کے ناقص انسان کو اوقیانوسِ غفلت کی گہرائی سے باہر نکال لیتا ہے اور اس کو ہوش میں لاتا ہے اور اس کو اس کی اصلی حالت کی طرف پلٹ دیتا ہے۔ عبادتِ حق کے سایہ میں روحی صلاحیتیں اور ملکوتی طاقتیں پرورش پاتی ہیں اور انسان اپنی حقیر آرزوؤں اور بے قیمت و محدود مادی امیدوں، اور اپنے اندرونی ضعف و نقائص تک پہنچ جاتا اور ان کی حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے اور اپنے کو ویسا ہی دیکھتا ہے جیسا کہ ہے :-

اَمِنْ حَرْفٍ فَنَسَهُ عَنْكَ رَبِّهٖ ۙ جَسَدًا لِّمَنْ لَّيْسَ لَهُ فِئْتَانٌ يَّحْتَمِلُ ۚ ذٰلِكَ خُلُقٌ نَّاسٍ ۚ

خدا کا ذکر اور اس کا تقرب دل کو نورانی اور قلب کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ لذت سے بھرپور ہوتا ہے ایسی لذت جس کا قیاس دنیاوی لذتوں سے کیا ہی نہیں جاسکتا۔ مختصر یہ کہ اس حقیقت معنویہ بجز وہ کی طرف متوجہ ہونے سے افکار میں ترقی ہوتی ہے اور اندیشوں کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ حضرت علیؑ ذکر خدا کا دلوں میں عجیب اثر ہوتا ہے۔ اس کو بیان فرماتے ہیں: خداوند عالم نے ذکر کو دلوں کی جلاہ قرار دیا ہے۔ یاد خدا کے نتیجے میں دل بہرے ہونے کے بعد سننے لگتے ہیں، اندھے ہونے کے بعد دیکھنے لگتے ہیں، طغیان و کسرشی کے بعد نرم و ملائم ہو جاتے ہیں۔ (شیخ البداء - خطبہ ۲۲)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: خدا یا تو اپنے دوستوں کے لئے بہترین ایس، اور تجھ پر بھروسہ کرنے والوں کے لئے تو سب سے زیادہ مشکل کشا، ان کے باطن کو شاہدہ کر نیوالا، ان کی ضمیر کی گہرائیوں پر واقف، ان کی میزانِ بعیت و معرفت پر مطلع ہے۔ ان کے راز تجھ پر آشکار ہیں، ان کے دل تیرے فراق میں بے تاب ہیں۔ اگر تنہائی ان کے لئے سببِ وحشت و اضطراب ہو تو تیری یاد ان کے لئے مونس ہے اور اگر سختی و دشواری ان پر بار ہو تو تو ان کی پناہ گاہ ہے۔ (شیخ البداء - خطبہ ۱۲۵)

نفسیات کا مشہور عالم - ویلیئم جیمز (WILLIAM JAMES) کہتا ہے: انسان کا عبادت کی طرف رجحان اس امر کا نتیجہ ہے (اور وہ امر یہ ہے) انسان کا ذاتی شعور اگرچہ ذاتی و عملی اختیار کے گہرے قسم سے ہو پھر بھی وہ اپنے معاصی کو دنیا کے فکریات میں پائے گا اور زیادہ تر لوگ خواہ متواتر یا اتفاقاً اپنے دل میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس طرح زمین پر حقیر ترین فرد اس توجہ عالی کے ساتھ اپنے کو واقعی اور باارزش کر لیتا ہے۔

خدا نے بزرگ و بزرگی کو کھٹ پر سب سے اعلیٰ و بلند طریقہ انسان کے شکر یہ کہ یہ ہے کہ اس کی عبادت کرے اور اس کو ان مطلق سے اظہارِ محبت کرے۔ اور یہ بھی تمام موجوداتِ مسمیٰ سے ہر آہنگی کا ایک طریقہ ہے کیونکہ سب ہی اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔ - قرآن کہتا ہے:-

نہ اعلیٰ فکر دینی ۱۰۵

تَبَّحَ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ قَالُوا مِنْ مَتَى
إِذَا تَبَّحَ بِعَمْدٍ وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ تُسَبِّحُهمُ إِنَّهُ كَانَ
حَلِيمًا غَفُورًا (الاسراء/ ۴۳)

ساتوں آسمان اور جو لوگ ان میں ہیں (سب)، اس کی تسبیح کرتے ہیں اور
دوسرے جہان میں، کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے حمد (دستا، کی تسبیح نہ کرتی ہو۔
مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا پروردگار بخشنے والا
البتہ یہ تقدیس و پرستش خداوند عالم کو ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں پہونچتی کیونکہ وہ تو کمال مطلق
ہے۔ اس کے یہاں کائنات و انسان کی طرف سے نہ ذرہ بڑا برکتی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔ اور بھلا یہ کیونکر
سوچا جاسکتا ہے کہ جس خدا نے ان کی کو پیدا کیا ہے وہ اس کی پرستش و تقدیس سے استفادہ کرے گا؟
البتہ خدا ان حقیقت مطلقہ کی معرفت اور پروردگار عالم کی عبادت کر کے اپنے کمال واقعی اور
مقصد آخری تک پہونچ سکتا ہے۔

پروفیسر ریمونڈ روایہ (PROF. RAYMOND) جو فلسفہ کے استاد اور مشہور فیزیا وکھاتے وہ
کائنات میں وجود شعور کے سلسلہ میں کہتے ہیں؛ جدید علم کہتا ہے ذرات اور تمام مالیکیول جو حرکت
ہیں اس کا علم رکھتے ہیں۔ یہ اپنے اعمال اور زندگی کی مسلسل حرکت کا شعور رکھتے ہیں اور یہ اپنے
اس شعور میں علمائے فیزیا سے زیادہ عالم ہیں، کیونکہ علمائے فیزیا، ایک ایٹم کے باصے میں جو جاتے
ہیں وہ یہ ہے کہ اگر یہ ایٹم محسوس اور قابل شناسائی نہ ہوتا تو کوئی اس کے بارے میں کیا جانتا؟
جسم، حرکت، سرفت، یہاں، وہاں، شعاعیں، توازن، فضا، فاصلہ یہ سب ایٹم
کی برکت سے وجود میں آئے ہیں۔ اور اگر یہ ایٹم نہ ہوتا تو عالم وجود میں ان ظواہر عجیبہ کو کون پیدا
کرنا؟ شعور و جسم میں وہی تناسب موجود ہے جو حرکت و سکون میں ہے اور جو حرکت کے
جہات مثبت و منفی ہیں۔

لیکن یہ فضا اپنے مجموعہ کے اندر اندھی نہیں ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو یہ بات ثابت چرچی

ہے کہ مشاہدات میں منفرد ملی آنکھ ہے لیکن آنکھ محدود قدرت بشریے محدود ہے اور اس کا تعلق صرف زمین اور زمینی موجودات سے ہے لہذا اس کے فیزیکی عمل کا میدان بھی محدود ہو گیا ہے۔ اس لئے زمین و سورج، سورج و کہکشاں، کہکشاں اور بہت دور پر واقع ہونے والے بڑے بڑے کواکب درمیان آنکھ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے ایک زمینی عضو کے لئے۔ مثلاً آنکھ۔ کہاں ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کا بھی مشاہدہ کر سکے؟

لیکن اسی دلیل سے ہم اس بات کی تصدیق پر قادر نہیں ہیں کہ قدرات عظیمہ اور تبادل قوی کے میدان میں بھی بلا شعور کا غلبہ ہے۔ قدرات عظیمہ سے مراد مثلاً وہ کہکشاں ہیں کہ جن میں فقط جاذبیت و توازن و حرکات و نور و سرعت اور مرکز دائرہ سے دوری کے قوانین ہی حکمرانی کرتے ہیں ان میں بے شعوری فنا آگاہی موجود ہے ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان موجودات عظیمہ میں بھی اور کوری نہیں ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ وہ ذرات نور جو اپنی حرکت میں ایک پوسٹ میں کام انجام دیتے ہیں وہ بھی اپنے اخبار و اشارات کے پہونچانے میں بے سواد نہیں ہیں۔

نہ دوہرہ دانشور و مستحوی نہ اندے بزرگ و نادان

صفات خدا قابل قیاس نہیں ہیں

اگرچہ ہم اپنی تمام تر کوشش کے باوجود خداوند عالم اور اس کی صفات کی معرفت کے لئے کچھ ایسے مفہیم و اصطلاح کے محتاج ہیں جو ہماری دسترس سے باہر ہے اور جن اصطلاحات کو ہم اسکی توصیف واقعی کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ ہماری مدد کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ خدا کے لامتناہی اوصاف کی کیفیت کو درک کر لینا ہمارے محدود ذہنوں کے بس سے باہر ہے۔ تمام وہ مفہیم و اصطلاح جو ذہن بشر کے ساختہ و پرداختہ ہیں ان سے خدا کہیں بلند و برتر ہے۔

انسان جو کہ ایک مخلوق ہے اور ہر لحاظ سے محدود ہے اس کو اس کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ موجود غیر مادی کو مادی صفات و خصوصیات سے تو لایا بیان کیا جاسکتا ہے۔

ہماری بحث اس حقیقت کے بارے میں ہے جو عقلی موجودات و ممکنات کے ماسویٰ ہے اور جس کی قدرت مطلق اور غیر محدود علم تمام ماسویٰ اللہ پر محیط ہے اور بے تعبیر قرآن مجید وہ کسی بھی محدود و ناقص مخلوقات سے مشابہت ہی نہیں رکھتا۔ (سورہ اعراف ۹) اور غفار ہے کہ ایسا موجود عادی مسائل کے ردیف میں نہیں ہو سکتا۔ مولائے کائنات حضرت علی فرماتے ہیں جو شخص خدا کو کسی چیز سے تشبیہ دے یا اس کے مانند قرار دے یا اس کی ذات مقدس کی طرف اشارہ کرے درحقیقت اس نے خدا کا قصہ ہی نہیں کیا ہے۔ خدا فائق و آخریہ گار ہے اور جو دوسرے پرشکی ہو وہ معلول و مخلوق ہے۔ مگر خدا تو علت ہے اور بس !

خدا اسباب و وسیلہ کے بغیر خلق کرتا ہے۔ انکار سے مدد حاصل کئے بغیر اندازہ کرتا ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ وقت و زمانہ اس کے ہمراہ نہیں ہیں۔ آلات و اوزار اس کی مدد نہیں کرتے اس کی ہستی ہر زمانے سے پہلے ہے۔ اس کی ازلیت ہر آغاز و ابتدا سے مقدم ہے۔ وہ غیر محدود

یہ تو موجودات کی صفت ہے کہ اپنے مخصوص حدود کے اندر اپنی ماہیت کو محدود بنا دیتے ہیں۔ اور یہ اجسام کی خصوصیت ہے کہ ان کے نظائر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کی ذات مقدس میں مفہوم حرکت و سکون کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ جن چیزوں کو اس مخلوقات کے ضمن میں پیدا کیا ہے خود اس کے وجود میں موجود ہوں؟ اگر ذات خدا میں حرکت و سکون کا وجود ہوگا تو اس کی ذات محل تغیر ہو جائے گی اور اس کا وجود کا اندلی ہونا محال ہو جائیگا۔

وہ تمام قوتوں کا منبع ہے لہذا کوئی بھی موجود اس میں اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا آفریدہ گار ہے جو تحول کو قبول نہیں کرتا اور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اور اہل معرفت کی نظروں سے پنهان نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں بحث ایک علمی اور دقیق بحث ہے۔ حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں: جس نے اسے کیفیتوں والا بھی (اس نے) سے کچھ نہیں سمجھا۔ جس نے اس کا مثل قرار دیا تو اس کی حقیقت تک نہیں پہونچا اور جس نے اس کی تشبیہ دی اس نے اس کا ارادہ ہی نہیں کیا جس نے اس کی طرف اشارہ کیا وہ ہم میں لانا چاہا؛ اس نے اس کو بے نیار نہیں سمجھا، جو اپنی ذات سے پہچاننا چاہے وہ مصنوع اور جو دوسرے کے مہارے قائم ہو وہ محتاج ہو جائے، وہ آلات کو استعمال کئے بغیر فاس ہے وہ فکر کو جو لاں کئے بغیر اندازے مقرر کرنا بیوقوفانہ ہے وہ دوسروں سے استفادہ کئے بغیر فنی ہے، نہ زمانہ اس کا ساتھی ہے اور نہ آلات اس کے مددگار، اس کی ہستی زمانہ سے پیشتر، اس کا وجود عدم سے پہلے، اس کی اذیت ابد سے (عالم اسے) سابق ہے، چونکہ اس نے شعور کی طاقتیں ایجاد کی ہیں اس سے ثابت ہوا کہ وہ شعور کے آلات نہیں رکھتا اور چونکہ اس نے امور میں حذیت قرار دی ہے اس سے پتہ چلا کہ اس کی مددگار ہے۔ اور اس نے چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھا اس سے معلوم ہوا کہ اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے، اس نے نور کو تاریکی کی روشنی کو اندھیرے کی خشکی کو تر کی، اور گرمی کو سردی کی ضد قرار دیا۔ وہ ایک دوسرے کی

دشمن چیزوں کو باہم جوڑنے والا، متضاد چیزوں کو ملائے والا، ایک دوسرے سے دور کو قریب کر نیوالا، اور مٹی ہوئی چیزوں کو الگ الگ کر نیوالا ہے۔ وہ کسی حد میں محدود نہیں ہے۔ وہ شمار میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ مادی چیزیں ہمیشہ مادی چیزوں کو گھیرا کرتی ہیں۔ اور اپنے جیسوں کی طرف اشارہ کیا کرتی ہیں۔

پارہ دو دگر عالم کے صفات اور ہمارے صفات میں جو فرق ہے اور دونوں قیاس کے ناممکن ہونے کی وجہ سے وہ یہ ہے کہ منبع وجود میں جو صفات ہیں ان کے مقابلہ میں جو موجودات ہیں جو صفات پاسے جاتے ہیں ان کے مقابلہ میں بہت تفاوت ہے۔ مثلاً ہم بعض اعمال پر قادر ہیں لیکن ہماری قدرت ان اعمال پر اس طرح کی ہرگز نہیں ہے جیسی خدا کی قدرت ان پر ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں قدرت اور ہے اور اس کا موصوف اور ہے یا جس وقت ہم اپنے علم کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہم اور ہمارا علم دونوں ایک چیز نہیں ہیں کیونکہ زمانہ طفولیت میں ہم تھے مگر ہمارا علم نہیں تھا۔ ہم نے تو بعد میں اس کو رفتہ رفتہ کر کے حاصل کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ علم اور قدرت ہمارے وجود سے الگ چیزیں ہیں اور یہ صفات — علم و قدرت — ہمارے عین ذات نہیں ہیں اور نہ ہمارے وجود سے متعلق ہیں بلکہ یہ صفات عارض ہیں اور ہمارا وجود معروض ہے اور دونوں کا حساب الگ الگ ہے۔

لیکن خدا کے یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے کیونکہ جب ہم کہتے ہیں خدا علم ہے یا خدا قادر ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا علم و قدرت کا منبع ہے اور یہاں صفت اور موصوف والا قدر نہیں ہے اگرچہ موصوف و موصوف شخراہ میں مگر حقیقتاً صفات خدا عین ذات خدا ہیں، اس کو دہاں کوئی یا سوسنی نہیں ہے جس پر صفت جا کر عارض ہو بلکہ خدا تو وجود مطلق ہے جو عین علم و قدرت ہے عین حیات و ثبوت ہے۔ اس کا قہ عقل یا غایتی نہ کوئی حد نہ قہ۔

در اصل قصہ یہ ہے کہ ہماری تربیت فطرت و طبیعت کے گود میں ہوئی ہے۔ ہم نے اسی عالم زندگ و بومیں آنکھ کھولی ہے اور نظام فطرت سے ہمارا مسلسل انس رہا ہے اور یہاں ہم نے جو بھی چیز دیکھی ہے اس کے مخصوص العباد و اسکاں میں زمان و مکان ہے اجسام کے خواص ہیں

ان ظواہر فطرت کے مفہام سے ہمارے اذہان کے انسیت کی وجہ سے ہم اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ ہر چیز کا قیاس اسی پیمانہ سے کریں۔ بلکہ علمی و فلسفی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے عقل و فہم کے مفہام معزول سے یہیں سے ناشی ہوئے ہیں۔

اس لئے ایک ایسے وجود کا تصور جس میں مادہ کی کوئی بھی خاصیت نہ ہو یا بن معنی کہ ہم اپنے ذہنوں میں جو کچھ بھی سوچیں وہ وجود اس کا غیر ہو۔ اور ایسی ذات کے صفات کا ادراک کرنا جس کے صفات اس سے کبھی کسی بھی طرح جدا نہ ہو سکتے ہوں۔ علاوہ اس کے کہ یہ خود بہت ہی مشکل امر ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے اذہان مکمل طور سے مادی موجودات کے تصور سے بالکل خالی ہوں۔ حضرت علیؑ کو اس سلسلہ میں ایک بہت ہی پر معنی عمیق و دقیق بیان ہے جس میں آپؑ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اللہ کی تعریف قیود و اوصاف میں کرے جس طرح کہ وہ تصور کرتا ہے۔ فرماتے ہیں: خدا کی کمال توحید یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف کی غیر ہے جس نے خدا کی صفت بیان کی اور انہی ایک اس کے لئے صفت زائدہ کا قائل ہو تو (اس نے گویا خدا کا مہدم و قرن بنادیا اور جسے خدا کا قرن و مہدم بنادیا اس نے خدا کے اجزاء قرار دیئے اور جس نے اس کے لئے اجزاء قرار دیا وہ خدا سے جاہل ہو گیا۔ رہ پلما فہم نہیج ابلاغہ)

ذہنی مفہام میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ صفات کے حدود میں خدا کی تعریف کر سکیں یا جس طرح مفہوم اپنے مصداق پر منطبق ہوتا ہے اسی طرح صفات وجود خدا پر منطبق ہو جائیں یہ ناممکن سی بات ہے۔ کیونکہ تمام صفات و مفہام اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے دیگر صفات سے متغائر ہوتے ہیں۔ مثلاً حیات کا مفہوم قدرت کے مفہوم سے بالکل اجنبی ہے اور ایک کا مفہوم دوسرے پر منطبق نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا مخصوص مصداق مل جائے جس میں یہ تمام صفات متعوب ہوں۔ لیکن اصطلاحی کہہ تو اپنے مخصوص معنی ہی پر منطبق کیا جائے گا۔

جس وقت انسانی عقل یہ چاہتی ہے کہ کسی چیز کی توصیف کسی صفت سے کرے تو باوجود

اس کے کہ اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ازلی نامصدق موصوف وصفت میں ایک قسم کی وحدت نوعی برقرار رکھے۔ لیکن چونکہ صفت معنوی موصوف کے معیار ہے اس لئے خواستہ و خواستہ بہرل دونوں میں معیاریت کا حکم لگانا ہی پڑتا ہے اور چونکہ اشیاء کے شناخت کا واحد ذریعہ معیاریم ذہنی ہے ان کی توصیف کرنا ہے جو از نظر تصور مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ان اوصاف کا لازمہ محدودیت ہے بنابرین وہ معیاریم ذہنی اس حقیقہ تعالیٰ کی تعریف یا معرفت سے قاصر رہتے ہیں۔ اور وہ ذات اقدس اس سے کہیں بلند ہے کہ وصف سے اسکو پہچانا جاسکے۔ اس لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ جو شخص اسکی تحدید و وصف سے کرتا ہے سمجھ لو کہ اس نے خدا کو پہچانا ہی نہیں؛ ایک مثال دیکر کی حد تک یہ سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ صفات خدا از اند پر ذات نہیں ہیں۔ آپ سوچئے کہ آگ کا شعلہ ہر چیز کو گرم کر دیتا ہے۔ یعنی آگ کی کیفیات میں سے ایک کیفیت سو زندگی اور حرارت کا منتشر کرنا ہے۔ کیا آگ کی یہ خصوصیت شعلہ کے کسی خاص حصہ میں مخصوص ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ شعلہ جو بھی ہے اس کا پورا وجود یہی خاصیت رکھتا ہے۔

ایک شخص نے اہل علم ششتم سے پروردگار کی حقیقت کے بارے میں پوچھا تو حضرت نے فرمایا: وہ ایک ایسی چیز ہے جو تمام اشیاء کے معیار ہے۔ وہی تنہا عین حقیقت وجود ہے۔ وہ نہ جسم رکھتا ہے نہ صورت اور نہ حواس خمسہ سے محسوس کیا جاسکتا ہے اور نہ راہ کاوش و جستجو سے اس کو پایا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ حواس پنجگانہ میں سما سکتا ہے۔ اور ہم و تصورات اس کے اور اس سے عاجز ہیں، زمانہ دہر اس میں کوئی کمی نہیں کر سکتے۔ اور نہ وہ معرض تغیر و تحول میں کبھی ہو سکتا ہے۔ (امول کافی، کتاب توحید ص ۱۸)

پال کلارنس (PAUL CLARENCE. A) - جو اجتماعی فیئر یار کا بہت بڑا عالم تھا وہ کہتا ہے: کتب مقدسہ - توریت و انجیل - میں جب بھی خدا کی تعریف کی جاتی ہے تو انجیل الفاظ سے کی جاتی ہے جو انسان کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات

لغات کے نگلی دامان کی وجہ سے ہے۔ ورنہ مفہوم خدا ایک روحی و معنوی مفہوم ہے اور انسان
— جس کے افکار مادہ کی چہار دیواری میں محصور و محدود ہیں — کنہ ذات الہی تک پہنچ
ہی نہیں سکتا۔ اور نہ مفہوم خدا کی کوئی تعبیر بیان کر سکتا ہے۔
اس کے باوجود کہ ہم کسی بھی طرح خدا کی ذات و صفات کے احاطہ پر قدرت نہیں رکھتے
ہم کو کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارے امکانات ہم کو جس حد تک بھی اجازت دیں اس کی معرفت
کے راستہ میں قدم بڑھائیں۔

jabir.abbas@yahoo.com

خدا کی یکتائی

جب کبھی مذہبی بحثوں میں توحید کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو اس سے خداوند عالم کی ذات و صفات میں، کائنات پر حکومت اور افعال اور نظام عالم کے ادارہ میں اور دوسری جہتوں میں بھی یگانگی اور وحدانیت کا عقیدہ مراد ہوتا ہے۔

جس طرح توحید ذات میں تعدد کا تصور ممکن نہیں ہے اسی طرح توحید صفات میں بھی تریک اور ذات و صفات میں اختلاف بھی قطعاً منتفی ہے۔ کیونکہ اختلاف محدودیت کے لوازم میں سے ہے۔ اور خدا کی ذات اور اس کے صفات غیر محدود ہیں۔ اور ہم جو ذات خدا اور اس کے صفات میں تفکیک کے قائل ہوتے ہیں وہ محض ہمارے افکار و مضامعات کی وجہ سے ہے ورنہ ذات پروردگار میں تعدد جہات و اضافات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اگر ہم کسی چیز کو رنگ برنگ شیشوں کے پیچھے سے دیکھیں تو ہر مرتبہ وہ چیز الگ رنگ میں دکھائی دیگی۔ اسی طرح جب ہم انہی عقلوں سے ذات پروردگار عالم کی طرف دیکھتے ہیں تو کبھی اس لحاظ سے کہ اس کے سامنے تمام موجودات حاضر ہیں اس وجود لا متناہی کو عالم کہتے ہیں اور جب اس لحاظ سے نظر کرتے ہیں کہ وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے تو اس کو قادر کہہ دیتے ہیں۔

اسی بنا پر ہم چونکہ اپنے مختلف صفات کو جو ہمارے محدود وجود کی خاصیت ہے۔ جب رنگ برنگ و تپچوں سے دیکھتے ہیں تو انہیں مفاہیم کو اس ذات نامحدود سے انزع کرتے ہیں۔ حالانکہ خارج میں یہ تمام مفاہیم یک وجود رکھتے ہیں اور ایک حقیقت کی خبر دیتے ہیں اور وہ حقیقت وہی ہے جو ہر نقص و عیب منزو ہے۔ اور جو تمام کمالات کی مظہر ہے جیسے قدرت، رحمت، علم، برکت، حکمت، جلال و فیرو

جب ہم نے یہ جان لیا کہ خدا کا وجود بذاتہ ہے تو اب یہ جاننا چاہئے کہ وجود مطلق تمام جہات سے غیر محدود ہے۔ کیونکہ اگر اس کا وجود و عدم دونوں برابر ہے تو اس کے وجود کے لئے خارج سے ایک علت کی ضرورت ہوگی جو اس کو موجود کرے۔ کیونکہ وجود خود بخود تو ممکن نہیں ہو کرتا اس لئے کہ صرف ایک وجود محض ہے جس کا وجود ذاتی ہے۔ اور چونکہ ذات عین وجود ہے لہذا وہ علم، قدرت، ازلیت، ابدیت کے لحاظ سے غیر محدود ہوگا، اس لئے کہ علم و قدرت بھی ایک قسم کے وجود ہیں۔ اور جو ذات عین وجود ہو کرتی ہے اس کے لئے یہ سارے کمال بطور غیر محدود ثابت ہو کرتے ہیں۔

خدا کی یکتائی اس کے واضح صفات میں سے ہے۔ تمام آسمانی ادیان نے اپنی اصلی اور غیر تحریف شدہ تعلیمات میں بشریت کو خالص توحید — جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہو — کی طرف دعوت دی ہے۔ کیونکہ شرک اپنے تمام صور و ابعاد کے ساتھ بشر کے لئے سب سے زیادہ مضر و مہلک ہے۔ جو طول تاریخ میں جہالت و نا اگاہی اور عقل کی رہنمائی سے انحراف اور انبیاء کے مکتب توحید کی سے اعراض کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

اگر لوگ فکر صحیح اور دلائل عقلی و انبیاء کی راہ نمائی کی پیروی کر کے خدا پر ایمان لاتے تو کسی بھی موجود و مصنوع غیر خدا کو خدا کی جگہ قبول نہ کرتے۔ اور نہ کوئی دوسرا موجود خدا کی تدبیر و تقدیر و امر کے ساتھ شریک ہو سکتا۔

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اللہ واحد ہے تو اس سے حسیت مراد نہیں ہوتی کیونکہ جسم تو کئی غفروں اور اجزاء سے مرکب ہوا کرتا ہے اور ہم تو اللہ سے ترکیب، تجزیہ، توالد کی نفی کرتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں ممکن کے صفات ہیں۔ اور ہر وہ مرکب جو ترکیب سے پیدا ہوا ہو وہ نہ خدا ہو سکتا ہے نہ شبیہ خدا۔

خدا کے لئے متعدد مصداقی کا تصور اس وقت ممکن ہوتا۔ جب اس پر کثیت، کیفیت،

زمان، مکان جیسے صفات کا صدق ممکن ہوتا۔ اور خدا ان اوصاف و قیود میں سے کسی سے بھی نہیں ہے لہذا فطری طور پر اس کے لئے کسی مشابہ یا مثل کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی قید کے بغیر حقیقت آب کا تصور کریں اور کئی مرتبہ اسی تصور کو دہرائیں تو پہلے تصور پر کچھ چیز زیادہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ ابتدا ہی میں پانی کا تصور بطور مطلق کسی بھی قسم کی قید و شرط و کیفیت و کیفیت کے بغیر کیا تھا۔ دوسرے اور تیسرے تصورات میں حقیقت آب کی دو فردوں کا فرض کرنا ناممکن ہے۔

لیکن اگر حقیقت آب سے خارج قیود کا اضافہ کر دیں تو اس کے بہت سے افراد ہو جائیں گے اور موارد و منابع کی تعداد کے لحاظ سے افراد آب بھی متعدد ہو جائیں گے۔ مثلاً بارش کا پانی، چشمہ کا پانی، نہر کا پانی، سمندر کا پانی، مختلف نیاؤں اور مکانوں میں یہاں اور وہاں کی قید سے افراد بڑھتے ہی جائیں گے لیکن جب قیود کو حذف کر دیں اور صرف اس حقیقت آب کو ملحوظ رکھیں تو اس میں تعدد ناممکن ہو جائے گا اور صرف ایک ہی حقیقت رہ جائے گی۔

اسی طرح یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جو موجود کسی مکان میں ہوگا وہ خود بخود مکان کا محتاج ہوگا۔ اور مکان کے اندر رہنے والا موجود اپنے وجود میں طرف زمان و مکان کا جو اس کے مناسب حال ہو بہر حال گروی ہوگا۔ اور صرف اسی زمانہ میں اس کا وجود یا جائے گا جو مخصوص ان شروط پر مشتمل ہو۔ لیکن اگر ہم کو ایسا موجود ملے جس سے کوئی زمانہ کوئی مکان خالی نہ ہو اور بلند ترین صفات کمالات سے منصف ہو اور کامل مطلق ہو اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہ مطلق ہو اور نہ کوئی دوسری ذات اس کے علاوہ نقص و عیوب سے منزہ ہو تو ایسی صورت میں ایسی حقیقت متغایہ کے لئے دو گانگی کا تصور اس کے عین متناہی ہونے اور محو ہونے کا تصور ہے۔

بنیادی اور اصولی طور پر خدا واحد بالعدو نہیں ہے کہ اس کے لئے اسی کی تسخیر سے فرد دوم کا تصور کیا جاسکے بلکہ اس کی یکتائی اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے ساتھ دوسری فرد کا وجود فرض

کیا جائے تو وہ میں فرد اول ہو۔

چونکہ تعدد اشیاء کے لئے ایسے قیود کا ہونا ضروری ہے جو ان کو ایک دوسرے سے میز و ممتاز بنا دیں۔ اس لئے اگر ایسا موجود فرض کیا جائے جو ہر قید و شرط سے آزاد ہو تو دوسرے فرد کا فرض کرنا قطعاً غیر معقول ہوگا کیونکہ فرد ثانی کا وجود مستلزم ہوگا کہ اس کے لئے حدود و میز و مانے جائیں اور اگر یہ کہا جائے کہ دوسرے فرد میں تمام حدود منتفی ہیں تو پھر وہ دو موجود نہ ہوئے بلکہ دوسرے فرد کا تصور دہی فرد اول کے تصور کی تکرار ہوگا۔

خدا کی یکتائی کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم تنہا خدا کا تصور تمام موجودات سے قطع نظر کریں۔ اگرچہ یہ فرض بعید ہو۔ تو بغیر کسی شریک یا مثل یا ولد یا کنو کے اس کا وجود ثابت و برقرار رہے۔ اسی طرح اگر ہم خدا کا تصور تمام موجودات کے ساتھ کریں جب بھی اس کا وجود بلا شریک ثابت و برقرار رہے۔ لیکن اگر ہم تمام موجودات کا تصور وجود خدا کے بغیر کریں تو ان موجودات کی بقا ممکن نہ رہے کیونکہ موجودات کے وجود کا حدوثاً و بقااً دار مدار خدا کے وجود پر ہے۔ جب خدا ہی نہ ہوگا تو یہ موجودات کیونکر ہو سکتے ہیں؟ اس بنا پر اگر خدا کے لئے کسی قید و شرط کو مان لیں تو جب بھی یہ قید یا شرط منتفی ہوگی خدا کا وجود بھی منتفی ہو جائیگا۔ کیونکہ اذا فأت الشرط ذات المشرط و ط۔ لہذا وجود خدا مطلق ہے اور غیر شرط اس کے ساتھ تعدد کا فرض کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے عقل اس کی سنخ سے فرد دوم کو فرض ہی نہیں کر سکتی۔ اس بات کو ہم ایک مثال دیکر سمجھائیں مثلاً اگر ہم فرض کریں کہ اس عالم کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی انتہا ہے اور اگر ہم اس کے کسی طرف بھی چلنا شروع کریں تو نقطہ انتہا پر نہیں پہنچ سکیں گے تو اب اس طرح کہ عالم مان لینے کے بعد کیا ہم اس کے ساتھ دوسرا عالم فرض کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! کیونکہ جب ہم نے پہلے ایک غیر محدود عالم فرض کر لیا تو وہ خود ہی ذاتی طور سے اس بات کا مانع ہوگا کہ اس ساتھ دوسرا عالم فرض کیا جائے کیونکہ جس چیز کو ہم دوسرا عالم فرض کریں گے وہ یا تو یہی عالم ہوگا

یا اس عالم کا جزو ہوگا۔

ہذا جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ خدا وجود محض ہے تو اب اس کے ساتھ اسی جیسا دوسرا خدا نہا
یہے ہی ہے کہ ہم نامحدود عالم مان کر اس کے ساتھ ایک دوسرا جسمانی عالم مانیں۔ ظاہر ہے کہ یہ
ایک ناممکن بات ہے۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ واحد ہے کہ مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرا خدا نہیں
ہے بلکہ اس کے مطلب ہے کہ اس کے ساتھ دوسرا خدا فرض کرنا بھی ناممکن ہے۔ اور نفس وجود خدا
اس کے واحد اور فرد ہونے کا مستلزم ہے۔ اور یہ کہ وہ بذاتہ منفرد ہے۔ اس طرح وہ دیگر موجودات
سے مختلف ہو جاتا ہے جبکہ دیگر موجودات بذات خود متمیز نہیں ہوتے۔ بلکہ خدا نے جو اسباب تفریق
مختص ہیں ان کے ذریعہ وہ متمیز ہوئے ہیں۔

اگر کلمہ اللہ کا صحیح اور واقعی معنی انسان کا عقل کے ذہن میں متحقق ہو جائے اور انسان صحیح
معنی سے معرفت حاصل کر لے تو وہ خود ہی فطری طور پر طے کرے گا کہ ذات خدا کے ساتھ تعدد ناممکن
فطری طور سے ناممکن ہے۔

ہم بڑی وضاحت کے ساتھ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک نظام واحد مستحکم تمام اجزائے عالم میں
کار فرما ہے۔ انسان گیہ و نبات کے لئے ہمیشہ کار بن گیا جس کو لید کرتا رہا ہے اور درخت و نبات
انسانی نفس کے لئے آکسیجن خارج کرتے رہتے ہیں اور انسان و نباتات کے اس داد و ستد کے نتیجہ
میں ایک معین مقدار آکسیجن کی محفوظ رہتی ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہو جائے تو
کرو زمین پر انسان کا نام و نشان نہ ملے۔

زمین سورج سے بخشی حرارت حاصل کرتی ہے اس کی مقدار اتنی ہوتی ہے کہ زندہ موجودات
کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ سورج کے گرد زمین کی سرعت رفتار اور عظیم منبع طاقت و حرارت کے
مالک سورج سے زمین کا فاصلہ اس طرح سے رکھا گیا ہے کہ زمین پر انسان کی زندگی ممکن ہو سکے۔

مثلاً اگر زمین کی سرعت رفتار ہزار فی گھنٹہ سے گھٹ کر سو میل ہو جائے تو موجودہ دن رات دو گنا بڑھ جائیں گے اور گرمی کے زمانہ میں درجہ حرارت اتنا بڑھ جائے کہ تمام نباتات جل جائیں اور سردی کے زمانہ میں راتوں کی ٹھنڈک اتنی زیادہ ہو جائے کہ تمام قسم کے گیاه اور پھول بجھ ہو کر رہ جائیں۔

اور اگر سورج کی گرمی جتنی اس وقت ہے اس سے گھٹ کر آدھی رہ جائے تو سردی کے زمانہ میں تمام جاندار جم جائیں اور کسی بھی حرکت پر قادر نہ ہو سکیں اور اگر سورج کی گرمی موجودہ وقت سے دو گنے سے زیادہ ہو جائے تو لطفہ حیات مرعہ نکوین ہی میں متوقف ہو جائے۔

اسی طرح اگر چاند کی زمین سے دوری بہت زیادہ ہو جائے تو سمندروں کے پانی کا جزر و مد اتنا بڑھ جائے کہ سمندر کی موجیں پہاڑوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

یہ کائنات کچھ اس طرح خلق کی گئی ہے کہ گویا یہ ایک کاروان ہے جس کے تمام رہبر و مقتدا زنجیر کی طرح باہم جڑے ہوئے ہیں اور یہ سب ایک نظام و واحد کے چھوٹے بڑے اجزاء کی طرح ایک جہت میں سعی و فعالیت میں مشغول ہیں اور اس نظام کے ہر سر جز کی اپنی ایک تکلیف اور ایک وظیفہ ہے اور یہ پورا نظام ایک دوسرے کی مدد کر کے ایک دوسرے کے تکمیل کا سبب بھی ہے اور اس کے تمام ذرات کے درمیان ایک عینق و معنوی علاقہ موجود ہے۔

مشہور مفکر روایہ کہتے ہیں: اس کائنات کے تمام مخلوقات میں ایک زنجیر یا تانگے سے بندھا ہوا مستحکم رشتہ ہے جو ان کے درمیان بھرپور توازن کو قائم رکھے ہے۔ یہاں تک کہ بے شعور و بے وجدان مخلوقات بھی اس مخصوص رشتہ کے فیوض و برکات سے محروم نہیں ہیں۔ اور اس کائنات کی مخلوقات گویا ایک مرتب و مسلسل لامتناہی قطار میں ہیں اور یہاں پھر ایک تسبیح کے دانوں کی طرح ہیں جو نہ ٹوٹنے والے ہیں۔ اور اس مخلوقات کی حرکات حیات اسی نامرئی اور قومی علاقہ کے طفیل میں ثابت و برقرار ہے۔

ذرا ایک زندہ آدمی کو دیکھئے اس کی گردش خون، گردش لطف، ہارمونی و عصبی حرکات شہ بدن ان میں ایک بے رنگ سیال چیز ہے۔

نہاؤ آدمی میں اتنی زیادہ ہم آہنگ و وابستہ و پیوستہ ہیں اور اتنی وسعت و قدرت کے ساتھ وہ اپنا طہر پر ہیں کہ پہلی مرتبہ دیکھنے والا یہ سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ ایک ہر جہ و مرجع سے بھرپور بے ترتیب نظام کے طوفان میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جبکہ فینرلوجی سے قطع نظر کر کے ہر زندہ خلیہ کی عام شکل بصورت حلقہ ہوتی ہے، لیکن یہ پانی یا ہر جہ و مرجع عظیم و وحشت انگ طوفانوں کے درمیان ایک دوسری طویل صنف، تب و تاب کی تلاش میں ہے۔ اور ان فی فکر اس وقت سمجھوت ہو جاتی ہے اور انگشت بہ دندان رہ جاتی ہے جب یہ دیکھتی ہے کہ تمام یہ زیر و بم طوفان، تعادل، باہم نیگی، ایک عظیم وحدت بخش عامل کے زیر ہدایت کام کر رہے ہیں۔ اور اس عامل قدیر کو ہر وحدت و نظام میں جو بظاہر غیر منظم مجموعہ ہے، دیکھا جاسکتا ہے یہ۔

اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں جو کائنات ایک وحدت سے سرشار ہے اس کو ایک حقیقت اور ایک مبدئ سے وابستہ ہونا چاہئے اور اس کائنات کا وجود اسی ایک نقطہ وجودیہ اور مبدئ و احد سے ہونا چاہئے۔ اگر وجود ایک ہوتا ہے تو اس کا وجود بھی ایک ہی ہو سکتا ہے جس خدے مختلف و متکثر وجود میں ایک وحدت و نظم کو پیدا کیا ہے اس نے اپنی اسی قدرت کا مظاہرہ کر کے اپنی وحدانیت اور علم و قدرت پر ایک واضح دلیل پیش کر دی ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:-
 قُلْ اِنَّ اَيْتَمَّ شَرَّكُمْ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَمْ وَاَوْفٰى
 مَا ذُكِّرْتُمْ اَمْ لَمْ يَلْحَقُوا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَمْ يَنْشُرْكُمْ فِي السَّمٰوٰتِ اَمْ اَنْتُمْ اَبْنَاءُ اللّٰهِ
 يَتَخَفُ مِنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَبْعَدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ اِلٰى اُخْرٰى لَّا يَلْتَمِسُ اللّٰهُ
 يُمَسِّكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلا ۚ ذٰلِكُمْ اِلَّا اَنْتُمْ اَنْتُمْ اَخْب
 مِنْ بَعْدِ ۚ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا عَفُوًّا (فاطر/ ۳۹-۴۰)

لے دو ہزار دہائیوں سے جوئے خدا کے بزرگ صفت

دلے رسولؐ! تم ان سے پوچھو تو خدا کے سوالنے جن شریکوں کی تم عبادت کرتے ہو، کیا تم نے انھیں (کچھ) دیکھا بھی مجھے بھی خدا دکھاؤ تو کہ انھوں نے زمین (کی چیزوں) سے کون سی چیز پیدا کی یا آسمانوں میں کچھ ان کا آدھا سا حجاب یا ہم نے خود انھیں کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اس کی دلیل دے سکتے ہیں، یہ سب تو کچھ نہیں بلکہ یہ نظام ایک دوسرے سے (دھوکے اور) فریب ہی کا وعدہ کرتے ہیں، بیشک خدا ہی سارے آسمان و زمین کو اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر (فریب کرو کہ) یہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو پھر اس کے سوا کوئی انہیں روک نہیں سکتا۔ بیشک وہ بڑا بردبار (اور) بڑا بخشنے والا ہے۔

خود ہماری فطرت بھی اس بیگانگی کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ جب ہم سخت بھران، اور جان فرسارگ رفتاروں میں مبتلا ہوتے ہیں تو (فطری طور پر) ہماری امیدیں ایک ہی مرکز کی طرف مائل ہوتی ہیں اور ایک ہی نقطہ کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور اسی سے دلچسپی پیدا کرتی ہیں۔ امام جعفر صادقؑ کے ایک شاگرد نے حضرت سے پوچھا خدا کی یکتائی پر کیا دلیل ہے؟ فرمایا: جہاں آفرینش کا دوام و استمرار اور باہم پیوستگی اور نظامِ ہستی کا مکمل ہونا۔ جیسا کہ ارشاد خدا ہے: - لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا - (کتاب الصدوق - باب التوحید)، پس اس نظامِ عالم کا استقرار و شمول تعددِ الہیہ کے مفروضہ کے بعلاوہ کئے کا کافی ہے۔

مشترک میٹرنگ (MORIS METERING) کہتے ہیں: جس وقت تمام اجسام کے ذرات کو شگفتہ کیا جائے تو ایک ایٹم تک رسائی ہوگی اور جب ایٹم کو شگفتہ کیا جائے تو ہماری رسائی ایک ایسی چیز کی طرف ہوگی جس کو ہم مجبوری بھلی سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی وہ

لے چشمِ بزمِ انجم

چیز ہے جو تمام سکون میں ظاہر ہوتی ہے اور تمام دنیا کے مصالح کا مدار اسی پر ہے۔ اور اسی سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا کا پیدا کرنے والا ایک ہے دو ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ دنیا کی تمام چیز خواہ وہ مواد ہوں یا قوانین ایک ایسی چیز سے وجود میں آئی ہیں جس کو ابھی تک ہم نہیں جانتے تھے۔ باوجود اس کے کہ خلقت و ارادہ عالم کے سلسلہ میں قرآن خدا کی یکتائی کی تاکید کرتا ہے پھر بھی ان اسباب و اسباب کا بھی تذکرہ کرتا ہے جو اس کے فرائد برادر ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَالْحَيَاةُ الْاَرْضُ بَعْدَ مَوْتِهَاۤ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۔ (نحل ۶۵)

اور خدا ہم نے آسمان سے پانی برسا یا تو اس کے ذریعہ زمین کو مردہ (مٹی) ہونے کے بعد زندگی و شاداب کیا، کچھ نہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں (قدرت خدا کی بہت بڑی نشانی ہے۔

اور جب ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ اس کا گاہ ہستی میں خدا کے علاوہ کوئی خالق و مدبر و مرید نہیں ہے اور کائنات کے تمام منابع تا تیر اسی کے امر و ارادہ کے تابع ہیں۔ اور نفس کش ایفاء کسی بھی عامل کی طرف سے ہو یا کائنات کی ہر علت و سبب اسی ذات واحد و لا شریک کی طرف سے اس کے سپرد ہے۔ پھر خدا سے یکتا کے ساتھ دوسرا خدا کیونکر مانا جاسکتا ہے؟ اور کس طرح دوسرے کی عبادت کی جاسکتی ہے؟ قرآن اسی چیز کو بیان کرتا ہے:- وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْيَلِّ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ سَجْدًا وَلِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (فصلت ۴) اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند ہیں تو تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرنا اور نہ چاند کو اور اگر تم کو خدا ہی کی عبادت کرنی منظور ہے تو بس اسی کو سجدہ کرو جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

نہ دنیا و نہ جبرائیل نے اس کو سجدہ کیا، میں کہہ جاتا ہوں جس طرح اس سے پہلے واسطے سورہ مومن کو سورہ غافر میں کہاجاتا۔

خدا کی غیر محدود قدرت

فطرت کے ظواہر اور ان کے الوان و آسکاں — جو بیان سے باہر ہیں — کے مطالعہ سے واضح و روشن تردیل خداوند عالم کے غیر متناہی قدرت پر نہیں ملے گی۔

جب ہم مخلوقات خدا پر نظر ڈالتے ہیں تو اپنے وجود کو خدا کی اس عظیم قدرت کے سامنے دیکھتے ہیں جس کے حدود و قیود کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ان مخلوقات کا مطالعہ اور ملیں تو وہ حقائق ہوں

ان میں اور ہمارے نفوس میں قدرت نے ودیعت کئے ہیں وہ ہم کو ایسے براہین تک پہنچاتے ہیں جن سے خالق کی لامتناہی قدرت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اس نظام کی تغیر و تبدیل خدا کی قدرت مطلقہ کے علاوہ کچھ مو بھی نہیں سکتی۔

خدا کی قدرت لامتناہی ہی ہے وہ چیز ہے جو عقل کو اس عظیم نظام کے خالق کے سامنے سرنگوں ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ اور ہمارے پاس کوئی ایسا کلمہ نہیں ہے جو اس عظیم لامتناہی قدرت کے ابعاد متخلف کر سکے۔ خدا کی قدرت تو یہ ہے کہ جس کی طرف اسے خود اشارہ کیا ہے۔ انما امرہ اذا امرنا و شئنا ان يقول لہ فیکون رقیب ۱۴۲/

علوم طبعیت کے بڑے بڑے بنیادی اور تحقیقات علیہ کے بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان آج تک اس چھوٹی بڑی مختلف مخلوقات کی اس کثرت کے باوجود بطور کامل ایک جزیرہ کی بھی حقیقت کا انکشاف نہیں کر پائے۔ لیکن پھر بھی اس عالم کے موجود نظام کے بہ نسبت یہ تھوڑے اور ناقص و مختصر معلومات اس بات کے لئے بہر حال کافی ہیں کہ جن سے اس کی عظیم لامتناہی قدرت کا اور اک کیا جاسکے۔ یعنی یہ تمام گونا گون مخلوقات جن کے حجم بھی الگ الگ ہیں۔ اور قیاس و دود یاؤں کی گہرائیوں میں چھوٹے اور بڑے جانور اپنے حیرت انگیز قیاموں

کے ساتھ، اور رنگ بزرگ خوشنما بال و پروا لے اور خوش الحان پرندے جو فضا میں اپنے بال کھلے دیتے ہیں، جنگلوں کے وسط میں زندگی بسر کرتے ہیں کہ اگر چہ وہ دست ہنرمند حضرات ان پرندوں کے خوبصورتی کی تھوڑی بہت تقلید اپنے فن پاروں میں کر دیں تو ان کے ہنر کا بازار گرم ہو جائے اور یہ نجوم و کواکب، سورج کا طلوع و غروب، شفق و افق، شمس و قمر، کرات و ککشائیں اور وہ بادل جن میں بیرونوں عظیم جگہ دار نجوم ہیں یہ جینوسی صاحبان عقل کو متحیر کر دیتی ہیں کیا چیز اس کی لامتناہی قدرت پر دلالت نہیں کرتی ہیں؟

پروفیسر روبرٹ ————— عالم فضا کے ایک گوشہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ہمارے اس نظام شمسی میں ایک لاکھ ستارے موجود ہیں اور اب تک ان میں سے صرف پانچ ہزار پہچانے جاسکے ہیں، اور ہمارا یہ پورا نظام شمسی ہماری ککشائیں کا ایک بہت ہی چھوٹا سا جز ہے اور ہم صرف اس ککشائیں کے چھوٹے حصے ہی کو دیکھ سکتے ہیں اور یہ حصہ بہت ہی کیف و مشرک ترین ہے۔

اور یہ عظیم ککشائیں دوسری میلیارڈ ککشائیں کے مقابلہ میں صرف ایک ایسا مختصر بادل ہے جس میں ستارے ہوں۔ اور ان تمام ککشائیں کا مجموعہ بھی لحاظ سے (مثلاً لاکھوں) کہا جاتا ہے جو ہماری دنیا کو تشکیل دیتا ہے۔

آئنسٹائن (1935) — بے مثال دانشمند اور نظریہ صافیت کے بابا آدم نے اس کائنات کی افغانی شعاعوں کا حساب چھ سو ملیارڈ نو سو سال کیا ہے۔ اور علماء کو اپنے اس نظریہ پر قانع کر دیا تھا کہ عالم اپنے اعلیٰ حد میں بے انتہا ہے اور ہمارے آج کے دور کے

تہ ایک ہزار بیلیون کا ایک میارڈ ہوتا ہے۔ یہ میارڈ کی جمع ہے

تہ ۱۳۴۸ ۵۱۸۶۶

تہ اس سے مراد یہ ہے کہ نوہ ایک سال میں مقرر صافیت کے کتابے۔ نوہ کی رفتار ایک سیکڑ میں ۱۸۶ ہزار میل ہوتی ہے۔

علمی وسائل و امکانات اس عالم کی انتہا کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ اس لئے اب بہتر صورت یہی ہے کہ اس عالم کی اضافی شعاہوں کو چھ سو ملیا۔ دو سو سال مان لیا جائے جو لا نہایت کے مساوی ہے اور اس کے بعد اس اضافی فضا کی تحقیق شروع کریں جس کا قطر دو ہزار دو سو ملیا۔ دو سو سال کے آئنسٹائن (EINSTEIN) نے یہ حساب اور یہ علمی تحقیقات ان فضائی رصدگاہوں کے سہارے بیان کئے ہیں جو فضائی تحقیقات کے لئے قائم کی گئیں تھیں جیسے رصدگاہ پالومار جو کہ سب سے زیادہ طاقت ور رصدگاہ سمجھی جاتی تھی اور آج بھی شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ریڈیو نے اس سرحد کو توڑا ہے۔ یعنی رصدگاہ پالومار کی اہمیت کم کر دی ہے۔

فضائی کیمروں کے ذریعہ اتاری گئی اصلی رنگوں سے زمین کافی سے زیادہ تصویریں جن کو رصدگاہ (پالومار) نے کینیڈا میں اور خصوصاً ہمارے کینکشن کی تصویریں بہت دنوں تک عالم میں علمائے فضا کے لئے مکمل تحقیق رہی ہیں اور علمائے فضا نے جن نظریات کا اظہار کیا تھا وہ انہیں تصویروں کی بنا پر تھے۔

ہماری اس کینکشن کا طول ایک لاکھ نو سو سال ہے اور ہمارا یہ نظام مسمیٰ اس کے ایک کونے میں ہے اور یہ کینکشن فضا میں طیارے سال سے دو سو سو سال تک میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔

پس کیا یہ کائنات اپنی اس مجرا العقول عظمت کے ساتھ خدا کے بزرگ کی قدرتِ مطلقہ پر دلالت نہیں کرتی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس خالق کی قدرت سے چشم پوشی کر لیں؟ جس نے

شہ یثربی رصدگاہ مشہور میں قائم ہوئی اور اس کا نام (PALOMAR MOUNT OBSERVATORY) رکھا گیا
پھر مشہور میں اس کا نام (HALE OBSERVATORIES) رکھا گیا۔ اور مشہور میں اس میں دنیا کی سب سے
بڑی دوربین نصب تھی۔
شہ یثربی کی بیع

ج۔ مؤلفز دانشمند در جستجوی خدا کے بزرگ ص ۲۲-۲۹-۱۳

ان متنوع اور مختلف الٰہان کو حیات بخشی ہے اور جس نے ان کے لئے اصول حیات بنائے ہیں اور ان کو صورت و شکل عطا کی ہے اور ان کے حدود معین کئے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے کہ یہ دل فریب موجودات کی خلقت ایٹم سے ہوئی ہے۔ اور ان موجودات کی تفسیر بغیر ایک لامتناہی قدرت جو با ارادہ و با قدرت و ہدایت کر نیوالی ہے "کے ماننے ہوئے ممکن ہی نہیں ہے جس کو اللہ کہا جاتا ہے۔ اور جو قادر علی الخلق والابداع ہے اور جو مهندس و حکیم ہے۔

چھوٹا، بڑا، مشکل اور آسان مسئلہ موجودات محدود کے خواص میں سے ہے۔ لیکن خدا کے ہاں کم و زیادہ، چھوٹے و بڑے کا مسئلہ نہیں ہے، عاجزی و ناتوانی کہ جو فاعل کی محدود طاقت کا معلول ہوتی ہے اور باوجود عالم اور باکی وسائل کی معلول ہوا کرتی ہے اس کا خدا کے بارے میں تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کہتا ہے:-

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَ أَشَيْئًا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا (دھرم/۴۲)

اور خدا ایسا (گیا گزرا) نہیں ہے کہ اسے کوئی چیز عاجز کر سکے (نہ تو آسمانوں میں

اور نہ زمین میں۔ بے شک وہ بڑا خبردار اور بڑی قدرت والا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ لیکن دنیا کو اس نے ایک مخصوص و مشخص نظام کے پیش نظر خلق کیا ہے۔ اور اس نظام دقیق کے چوکھٹے میں ہر شے کے لئے ایک معین دائرہ بنا دیا ہے اور ساری چیزیں اس کے احکام کی فرمانبرداری میں۔ معمولی سی عدول حکمی نہیں کر سکتیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے:-

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مَسْجُوتٌ بِأَمْرِ رَبِّهِ. أَلَا إِنَّ الْخَلْقَ وَالْأَنْفُسَ تَبَاءَتُكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (الاعراف/۵۳)

اور اس نے آفتاب و مہتاب و ستاروں کو پیدا کیا یہ سب کے سب اسی کے حکم کے تابع رہے

ہیں۔ دیکھو حکومت اور پیدا کرنا خاص اسی کے لئے ہے وہ خدا جو سارے جہاں کا پروردگار ہے بڑا برکت والا ہے۔

نظام ہستی کا کوئی موجود تنہا نہ منظر قدرت ہو سکتا ہے اور نہ اپنے ارادہ و حکم میں مستقل ہو سکتا ہے۔ اور خدا کا جس طرح ذات میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی طرح فاعلیت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ اور جس طرح موجودات جہاں اپنی ذات میں مستقل نہیں ہیں بلکہ خدا سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح فاعلیت و تاثیر میں بھی مستقل نہیں ہیں۔ ہر فاعل و سبب اپنے وجود کی حقیقت کو خدا سے حاصل کرتا ہے اور اپنی فاعلیت و تاثیر کو بھی اسی سے حاصل کرتا ہے۔

اگر مشیت الہی کا تقاضا ہو اور وہ اس نظام ہستی کو ختم کرنا چاہے تو یہی طاقتور نظام اس کے ارادہ کے سامنے سرنگوں ہو جائیگا۔ کیونکہ جس خالق نے اسباب و مصل کو خاص اثر بخشا ہے وہ ہر وقت اس بات پر قادر ہے کہ جس وقت چاہے ان کے اثر کو ختم کر دے۔ اور جس طرح ایک حکم سے موجودات کو پیدا کیا تھا دوسرے حکم سے ان کی تاثیر کو ختم بھی کر سکتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

قَالُوا احْزِقُوهُ فَاَنْصَرَفُوا اِلَيْكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَاَسْلَافًا عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ فَاَرَادَ اٰبَاؤُا بَعْضٌ فَاَجْعَلْنٰهُمْ الْاَخْسَرِيْنَ - رانیاہ - (۶۸، ۶۹)

دعاؤں کو آگ کہہ گئے کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو ابراہیم کو آگ میں جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو (غرض ان لوگوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا تو) ہم نے فرمایا اے آگ تو ابراہیم پر بالکل ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہو جا کر ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، اور ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ چال بازی کرنی چاہی تھی تو ہم نے ان سب کو ناکام کر دیا۔ سورہ اور زمین کی قوت جاذبہ اگرچہ اس دنیا کے بہت بڑے میدان میں اپنا نفوذ رکھتی ہے

مگر خدا کے ارادہ کے سامنے سرنگوں ہے۔ جہاں خدا نے کسی چھوٹے سے پرندہ میں بھی طاقت بخشی تو وہ زمین کی قوت جاذبہ کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور وہ فضا میں اڑنے لگتا ہے اسی کو قرآن کہتا ہے:-

اَنۡسَمۡ بِسُرۡدِاِلِی الْعِلۡیٰوِ مُسۡحَرَّاتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یَصۡسِلُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَا یَاۡتَ بِقُوۡمٍ یَّوۡمِنُوۡنَ (الاحقاف ۷۶)

کیا ان لوگوں نے پرندوں کی طرف غور نہیں کیا جو آسمانوں کے نیچے ہوائیں گھسے ہوئے راستے مسکتے ہیں۔ ان کو تو بس خدا ہی (دگرسنے سے) روکتا ہے۔ بے شک اس میں بھی قدرت خدا کی؛ ایسا نہ اڑوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس نظام کے اندر جو موجود بھی فرض کیا جائے اس کے وجود و دوام حیات کی ضرورت محض خدا ہی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہیں اور اسی نظام میں جس قدرت کا بھی وجود فرض کیا جائے آخر کار خدا کی لاستنا ہی قدرت کی طرف اس کی بازگشت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے ابلاغہ - خطبہ ۱۵۹ میں فرماتے ہیں: ہم تیری کہ عظمت کو نہیں پہچان سکتے ہیں تو جانتا جانتے ہیں کہ توحی و قیوم ہے نہ سمجھ کو نیند آتی ہے نہ اونگھ، کوئی نظر و فکر تجھ تک پہنچتا نہیں سکتی نہ کوئی آنکھ تجھ کو دیکھ سکتی ہے تو نے البصائر کا ادراک کیا ہے۔ اعمال کا احصا کیا ہے اور نواہی و اقسام سے گرفت کی ہے، باوجودیکہ ہم نے تیری آفرینش کی کسی چیز کا ادراک نہیں کیا ہے مگر تیری قدرت پر متعجب ہیں تیری عظیم عظمتوں کی تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ جو چیزیں ہم سے پوشیدہ ہیں ہماری آنکھیں ان کے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔ اور ہمارے خرد و فکر کی دلیں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے اور ان چیزوں کے درمیان جو فیضی پر دوسے پڑے ہیں وہ بہت عظیم ہیں۔

ان بن جب کسی چیز کو بنانے کا ارادہ کرتا ہے مثلاً اسپتال بنانا چاہتا ہے تو وہ کچھ ایسے وسائل و آلات کو مہیا کرتا ہے جن کے درمیان کوئی ذاتی علاقہ نہیں ہوتا صرف اس میں سب کے کام آند ہونے کا رشتہ ہوتا ہے اور یہ سب اس لئے کرتا ہے کہ حصول مقصد میں کامیابی ہو۔

اور ان ضروری — خداوند ہونے والی چیزوں — کے ایجاد کے لئے مختلف چیزوں اور طاقتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور اس کا یہ عمل — جو اس نظام کی ایک جزئی چیز ہے — فاعلیت ایجاد کی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حرکت کی فاعلیت ہے جو اشیاء موجودہ کو ایک مخصوص شکل کی صورت میں کر دے گی۔ اس کے برخلاف خدائی مصنوعات کے کہ ان میں چند بیگانہ چیزوں کو اکٹھا کر کے ان کو ایک مخصوص صورت دیدینا نہیں ہے۔ بلکہ خدا تمام چیزوں کو ان کی خصوصیات و قوتوں کے ساتھ خلق کرنے والا ہے۔

یاد رکھئے یہ جو کہا جاتا ہے کہ ”خدا ہر چیز پر قادر ہے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت کا تعلق صرف ممکن امور سے ہو کرتا ہے لیکن محالات عقیدہ اس کے دائرہ قدرت سے بالکل خارج ہیں۔ بلکہ محالات میں لفظ قدرت کا استعمال ہی بے معنی ہے — یہ درست ہے کہ خدا کی قدرت غیر محدود ہے لیکن یہ نہ بھونا چاہئے کہ اس کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ محل میں قدرت الہی قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ کسی بھی چیز سے قدرت خدا کا تعلق اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ نئی محال عقلی نہ ہو اور ذاتی صلاحیت قبول قدرت کی رکھتی ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ فیض الہی دائم ہے اس کی کوئی انتہا نہیں ہے لیکن اس مورد — محال عقلی — میں اس فیض کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ سمندر میں پانی بہت ہے لیکن آپ کے پاس جتنا غلط طرف ہوگا اتنا ہی تو پانی لے سکتے ہیں؟ کوئی بھی ظرف اپنی صلاحیت سے زیادہ پانی نہیں لے سکتا۔ یعنی محدودیت ظرف کی طرف سے ہے سمندر کی طرف سے نہیں ہے۔

ایک شخص نے حضرت علیؑ سے پوچھا کیا خدا اس بات پر قادر ہے کہ پوری دنیا ایک آنڈے میں سمودے مگر نہ دنیا چوٹی ہو اور نہ آنڈا بڑا ہو؟ آپ نے فرمایا خدا کی طرف عاجزی کی نسبت دنیا صحیح نہیں ہے لیکن تم نے جو پوچھا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ (بخاری الانوار ج ۳ ص ۱۴۲) یعنی ذات مقدس الہی میں معجز نہیں ہے مگر فعل محال کے بارے میں قدرت خدا کے تعلق سے سوال کرنا یہ غیر معقول اور بے معنی سی بات ہے۔

جس مومن کا دل ایمان خدا سے اور اس کی محبت سے بھرا ہوگا وہ کبھی اپنے کو اکیلا نہ ملے گا۔
نہیں سمجھے گا کیونکہ جس بات پر اقدام کرے گا یہ یقین ہوگا کہ ہم ایک عظیم طاقت کے زیر نگرانی ہیں
جو مشکل کو دور کرنے پر قادر ہے۔

جو خدا کو پہچانتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ خدا اس کی مدد کرنا چاہتا ہے وہ مشکلوں کے سامنے ضرور
ثبات کا مظاہرہ کرے گا اور مشکلات کی حیثیت اس کے نزدیک سمندر کے جھاگ جیسی ہوگی جو
بہت جلد دور ہو جاتا ہے۔ اور جتنی جتنی مشکل کی آگ اس کے ارد گرد بھڑکتی ہے اتنا ہی وہ
زیر امداد کی طرح محنت و طاقت بیکار نہ کرے گا۔

تمام مشکل مقام پر فضل و غایت خدا کا احساس کرتا ہے اور یہی اصلی احساس اس کی غایت و
تمائش کو تشکیل دیتا ہے۔ کوئی بھی ناکامی اس کا راستہ نہیں روک سکتی اور نہ وہ کسی مشکل کے سامنے
تہیار و اتار ہے بلکہ سب سے مشکل اور غلوں میں جیت کی بنا پر اپنے مقصد کو آخری منزل تک حاصل کر لیتا ہے۔
مومن بخوبی جانتا ہے کہ اس نظام میں کوئی بھی نایب و غیر نہیں ہوتا اور کامیابی مومن کے لئے
ہے اور جو مظلوم خدا کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں رکھتا خدا ان کی مدد کرتا ہے اور اوج عزت و
غللت تک ان کو پہنچا دیتا ہے اور بہت سے ایسے صاحبان عزت جو طاعنی و باغی ہوتے
ہیں، نظام و دستگاہ ہوتے ہیں جو اپنی قدرت و طاقت کے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے جو ان
کی کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتے خدا ان کی رگڑ دیتا ہے۔

اس قسم کے کتنے ہی ظالم و عابر تارینج بشر میں گزرے ہیں جو ذلت کی موجوں میں گرفتار
ہو کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ انبیائے کرام ان فی اقدار کے کامل نمونے
تھے انھوں نے مخالف قوتوں کا کس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہ صرف اس لئے کہ لوگوں کی
ہدایت کریں اور معاشرہ کو انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سوق کریں۔ یہی وہ لوگ تھے
جنھوں نے اہل شرک و عناد کے سامنے سب سے پہلے انقلاب کی مشعل جلائی۔ اور ان کی تبلیغات
کا تاریخ بشر میں خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ اور یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے توحید کی بنیادوں کو

مفلوہ کیا۔ کیا کوئی ایسا ہے جو ان کی ان کوششوں کا انکار کر سکے جن میں نہ تمکھاؤٹ کا احساس کرتے تھے اور نہ رنج و غم کا؟ ہم کو سوچنا چاہئے کہ انسان کتنا صبر کر سکتا ہے اور اپنے ارادہ میں کتنا مفلوہ ہو سکتا ہے؟

اگر ان کی پرانہ زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو تجلیات اخلاص، صفائے باطن، درگزر، رحمت و زہمت، ہدایت و انسانی سازی سے شدید علاقہ کا درک و لمس کیا جاسکتا ہے اور ان کی بقا کا اساسی راز یہ تھا کہ انھوں نے کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا۔ اپنی پوری ہستی فحوی کے ساتھ اس کی دھ میں دبیہ کر دی۔ لہذا خدا نے بھی ان کو ابدیت و جاودانیت بخش دی۔

علم خدا

خدا نہ تو کسی مکان میں سمجھا جاتا ہے نہ اسکی ذات کے لئے کسی حد کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ زمین و آسمان میں کوئی نقطہ اس کے وجود سے خالی ہے۔ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور پورے نظام ہستی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر اس کی دانش کی تابناک شعاعیں نہ پڑتی ہوں۔ دور ترین نقطہ عالم میں بھی جو حادثہ ہوگا۔ کھربوں سال گزرتے ہوئے واقعات اور کھربوں سال بعد ہونے والے واقعات اس کے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں اسی لئے جامع ترین تفسیر نفوذ و راہ یابی کی اس کے حوزہ علم تک پہنچنے سے عاجز ہے۔

اس کے وسعت علم کے دائرہ کے اور اس کے لئے دامن تفکر کو چاہے جتنا زیادہ وسیع کر دیں اور عقل کے بال و پر سے — جو ایک سکند میں فطرت کے پورے وجود کو گھوم کر دیکھ لیتی ہے — چاہے جتنی پرواز کریں اور آوازیں فکر کے ساتھ ہر گوش مقصد میں آگے بڑھیں پھر بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

جس طرح کہ ہم ایک جگہ اور مخصوص نقطہ میں ہیں اسی طرح اگر تمام جگہ ہستے اور کوئی جگہ ہمارے وجود سے خالی نہ ہوتی تو اس صورت میں ہم سے بھی کوئی چیز پوشیدہ نہ ہوتی۔

کائنات دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ غیب و شہود۔ کچھ حقائق کا غیب ہی ہونا۔ عدم محدودیت کی وجہ سے یا مادی نہ ہونے کی بنا پر یا ہمارے حواس ظاہری سے محسوس نہ ہوسکنے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وجود ان امور محسوس میں منحصر نہیں ہے جو ہمارے تجربہ میں داخل ہوں۔

حقائق ہستی کے رموز و اسرار کے ادراک کے لئے ہم کو ایک ایسی میٹھی چاہئے جس سے ہم جھلنگ لگا سکیں اور اس جھلنگ کی فعالیت و کامیابی فعال فکر کی قوت پر موقوف ہے

اگر یہ مدارج ہمارے لئے ممکن ہو جائیں تو بہت سے واقعات کو ہم بھی جان سکیں گے۔

خداوند کریم عنوانِ غیب کے تحت ایک وسیع نیشن کو ہستی کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ انبیائے الٰہی نے بھی اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ انسان کو عالمِ خلقت سے ایمان بالغیب کی طرف لے جائیں تاکہ محدود سے غیر محدود تک اور ظاہر سے باطن وغیب تک پہنچا دیں۔ لیکن جہاں تک خدا کا سوال ہے اس کے لئے کوئی چیز غیب نہیں ہے پوری کائنات اس کے لئے منظرِ شہود میں ہے۔ ارشادِ خدا ہے :-

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ (المحشر / ۲۲)

پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔ وہی بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بشری معنوعات ہمیشہ اپنے بننے والے کے علم و ذہانت سے پیدا ہوتی ہیں اور مصنوع فنی کی غذا سے جتنا دقیق ہوگا وہ صانع کی عظمت پر اتنی قدر زیادہ دلالت کرے گا۔ اور اس صانع کے ہدف و نڈسہ پر بیشتر دال ہوگا۔

اگرچہ اس کائنات کی عظمت کا انسانی معنوعات سے کوئی تناسب نہیں ہے پھر بھی اس عالم کی عظمت اور اس کے مناسب موجودات کی صورتیں، اور اس عظیم نظام میں پائی جانے والی حکمت اور یہ خوبصورت و مجسم العقول مناظر کے سبب اس ناظم و خالق کو مدبر کے غیر محدود علم پر دلالت کرتے ہیں۔ بلکہ یہ مظاہر اس وجودِ فیاض کے علم و ارادہ و حکمت پر قوی ترین دلیلیں ہیں۔ اسی خالق کوئی نے ان عجائبات کو ایک دقیق و منظم برنامه کی بنیاد پر ایجاد کیا ہے اور ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس وجود کے ظواہر اجزا میں سے ہر ہر جز میں اس کے وسیع علم کا مشاہدہ کریں۔

جو حضرات لیبارٹریوں کے تجربات اور علما کے نظریات کا تتبع کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ ممکن ہے کہ حیوانات، نباتات، حشرات کے اندر اس محدود علم کے عجائبات کشمیر کا مطالعہ کریں

ان وہ فضا ئے آسمانی میں سیر مسترگان، اور بادلوں کے پر غوغا عالم، کبکشوں کی گردش کوئلے سے ابد تک کو جانتا ہے اور تمام اجرام بالا کے ایجنوں کی مجموعی تعداد، سطح زمین اور اعماق اوقیانوس کے لیارد ہا چھوٹے بڑے موجود، فطرت میں نافذ جاری سنن و قوانین، ہر شے کے ظاہر و باطن کو بھی جانتا ہے، دلوں کے دائرے سرستہ سے صاحبان قلوب کے زیادہ عالم ہے۔ اور یہاں ہم کو پھر قرآن کی آواز سنائی دیتی ہے:-

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (الک - ۱۳)

اسی طرح ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (آل عمران - ۵)

بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے۔ اور وہ تو بڑا باریک بین واقف کار ہے (مکد - ۱۳)

بے شک خدا پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے (نہ زمین میں اور نہ آسمان میں (آل عمران/۵) نیوٹن - (۱۶۸۶۳۰۸) - گوش و چشم کے لئے کہتا ہے۔ کان کا بنانے والا آواز سے متعلق تمام قوانین کو مکمل طور سے جانتا ہے اور آنکھ کا پیدا کیا ہوا آلان پیچیدہ قوانین سے جو نور و رویت سے متعلق ہیں بخوبی مطلع ہے۔ اور نظام سماوات کو دیکھ کر ہم اس عظیم حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں کہ اس نظام کا مدبر کوئی حکیم خاص ہے (دائرة المعارف فرید و جدید ج ۱۰) اسی لئے علمائے طبیعت جو اعماق وجود میں دقائق نظم کے بارے میں وسیع اطلاع رکھتے ہیں اور زندہ و مردہ وجود کے بارے میں اپنے داخلہ تجربات کی بنا پر ایسی اطلاعات رکھتے ہیں جو دقیق حساب پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور صرف زندہ و مردہ وجود ہی کے بارے میں اطلاع نہیں رکھتے بلکہ - خلیہ اور خون کے بارے میں بھی مطلع ہیں اور فعل و انفعالات کی مختلف کیفیت، ظاہری و باطنی تحولات، اور مختلف مواد و عناصر کے تاثیرات کو اپنی علمی تحقیقات کے دائرے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور النفس و آفاق میں غیر مود و علم اور تخیل و خیر متک کے آثار کا بہترین طریقہ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور یہ حضرات دوسروں کے نسبت علم خدا کی

دست اور کمال اوصاف کو زیادہ جانتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ ضمیر کی آواز کو نہ ٹھکرائیں تو وجود پروردگار کو روشن تر طریقہ سے لمس کرتے ہیں۔

ایک مفکر کہتا ہے: ہماری دنیا ایک عظیم تفکر کی وجہ سے ایک میکانیکی مشین سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اور میں ایک نظریہ اور علمی تعریف کی بنا پر کہتا ہوں: ہماری دنیا ایک ایسے عظیم تفکر کی مخلوق ہے۔ جو ہمارے مظاہر فکر سے کہیں زیادہ بلند ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ علمی افکار اسی ہدف کی طرف رواں دواں ہیں۔

خدا کا علم صرف ماضی یا حال سے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ مستقبل کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح حال کو خدا کا علم ان فی علم ہے۔ جو ہمیشہ وجود خارج کا محتاج ہوتا ہے۔ کوئی مشابہت نہیں رکھتا اور نہ یہ بات درست ہے کہ کہا جائے خدا کا علم مخلوقات میں تحقیق کرنے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ اس کے علم کا قیاس انسانی علم پر کرنا قطعاً نامناسب ہے اور نہ ابھی تک ترقی یافتہ دنیا کے پاس کوئی ذریعہ ہاتھ آیا ہے جس سے یہ بت لگایا جاسکے کہ علم خدا کی کیفیت یا معرفت کا طریقہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ کیونکہ ان فی علم کے لئے ایک علم کا ہونا ضروری ہے جس سے علم کا تعلق ہو سکے اور خدا کے یہاں یہ بات نہیں ہے کیونکہ علمی اصطلاح میں خدا کا علم ضروری ہے یعنی اس کے لئے کسی معلوم کا ہونا ضروری نہیں ہے جس سے علم خدا کا تعلق ہو۔ بلکہ ہر شے اس کے سامنے کھلی ہوئی کتاب ہے۔ ذات خدا اگرچہ غیر از موجودات ہے لیکن اس کے باوجود وہ موجودات سے خارج بھی نہیں ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: ماضی اور مستقبل بغیر کسی واسطہ کے اس کے سامنے حاضر ہیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے لیکن وسائل و ذرائع کے ذریعہ نہیں اگر وہ مسائل ختم ہو جائیں تو علم خدا منتفی ہو جائے۔ اس کے اور اس کے معلوم میں کوئی چیز نام علم اور نایاد موجود نہیں ہے۔ صرف اس کی ذات ہے اور بس!۔

نہ تو معدوق ص ۴۲

حضرت علیؑ اپنی اس حدیث میں علماء کی ایجاد کردہ اصطلاح کے مطابق علم حصولی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کیونکہ حوادث کے علم میں ذہنی صورتوں کا حصول خدا کے لئے نہیں ہے جو علم حصولی کی اساس ہے۔ البتہ اگر خدا کا علم حصولی ہوتا تو وہ ان صورت ذہنیہ کا تحقیق علم کے لئے محتاج ہونا حالانکہ وہ فنی مطلق ہے۔

جس خدا نے عالم اور عالین کو پیدا کیا، اور ہر حاجت کو پوری کرتا ہے اور ہر کمال و نعمت کا عطا کرنے والا ہے اور تمام کمالات و فضائل کا مجمع ہے اس کے بارے میں یہ کیوں کر سوچا جاسکتا ہے کہ وہ فنی الحاجات پہننے کے ساتھ محتاج بھی ہے؟

صور ذہنیہ ہمارے اذعان میں ہمارے حسب خواہش باقی رہتی ہیں اور جب ان کو مہمل کر دیتے ہیں تو وہ فنی ہوجاتی ہیں کیونکہ صور ذہنیہ ہماری مخلوق ہیں، علم حصولی اس کے لئے کہتے ہیں کہ وہ کسی واسطہ کے بغیر حاصل ہوجاتا ہے اور علم حصولی واسطہ کا محتاج ہوتا ہے اور درحقیقت علم حصولی انسان کے آئینہ حواس پنجگاہ میں طبیعت و فطرت کا انعکاس ہے۔

ہمارے اور خدا کے درمیان میں یہ فرق ہے کہ وہ فنی مطلق ہے صور ذہنیہ کا محتاج نہیں ہے اور ہماری ذات ہی اسکی محتاج ہے۔

حوادث گزشتہ و آئندہ کی ترسیم ہماری محدود ہستی و افق فکر میں ہے کہ شخص زمان و مکان کا اشغال کرتے ہیں اور خارج میں اس زمان و مکان کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ضرور ذہن میں ہے۔ اور چونکہ ہم ایک مادی مخلوق ہیں اور قانون اضافت کی بنا پر مادہ ہمیشہ اپنے تکمیل تدریجی و تفریط میں زمان و مکان کا محتاج ہے۔ لیکن ایسا وجود جو ازل سے ابد تک تمام ظروف زمان و مکان میں موجود نہ ہو اور مادہ و اس کے لوازم سے آزاد ہو اس کے لئے گزشتہ اور آئندہ کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔

اور چونکہ ہر حادث اپنے وجود و ظہور میں اللہ کے وجود مطلق کا محتاج ہے لہذا خدا اور اس موجود کے درمیان کوئی حجاب و عائل فرض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ تمام چیزوں کے ظاہر

و باطن پر محیط ہے اسی طرح دور، نزدیک، فاصلہ مکانی کا مفہوم ہمارے وجود کی محدودیت سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے :-

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظِلَابٍ
الْأَرْضِ وَلَا أَرْضُكَ وَلَا يَأْتِيهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (الانعام / ۵۷)

اور جو کچھ خشکی و تری میں (اس کو بھی) وہی جانتا ہے اور کوئی پتہ بھی نہیں گزرتا
مگر وہ اسے ضرور جانتا ہے اور نہ زمین کی تدریکوں میں کوئی دانہ اور نہ کوئی ہری اور
نہ خشک چیز ہے مگر یہ کہ وہ نورانی کتاب (سینہ معصومین) میں موجود ہے۔

فرما کیے ہم ایک ایسے کمرے میں کھڑے ہیں جو شاہراہ عام کی طرف ہے اور ایک چھوٹی سی
کھڑکی سے بسوں اور کاروں کے ایک انبوہ کثیر کو دوڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ظاہری بات
ہے کہ تمام بسوں اور کاروں کو ایک مرتبہ میں نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ اس چھوٹی سی کھڑکی کے سامنے
یکے بعد دیگرے لاریں گزریں گی۔ اور نظروں سے پوشیدہ ہوتی جائیں گی اب اگر ہم ان کاروں کی
حقیقت سے بے خبر ہوں تو یہی خیال ہوگا کہ یہ کاریں ایک ایک کر کے ایک طرف سے پیدا ہو رہی
ہیں اور دوسری طرف ختم ہو جا رہی ہیں۔

درحقیقت یہ چھوٹی سی محدود کھڑکی ہماری نظروں میں کاروں کی گزشتہ اور آئندہ نقور
پیش کرتی ہے لیکن جو لوگ سڑک کے کنارے کھڑے ہیں وہ تمام کاروں کو ایک ساتھ حرکت کرتے
دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح دنیا کا ماضی و مستقبل ہمارے حسابے بالکل اسی طرح ہے جو چھوٹی سی
کھڑکی کے پینچے سے کاروں کو دیکھ رہا ہے۔

علامہ کا بیان ہے : معلم تو پوٹونی میں بیان کیا گیا ہے کہ عالم کی چار جہتیں ہیں لیکن دنیا میں اسے
بہت سے خواص مہندسی ہیں جن کے صرف تین ہی البسا ہیں جو صورت عامہ کے مخالف ہیں۔

اگر کوئی ناظر ایک صفحہ سے باہر ہو تو تمام صفحہ اس کے سامنے ہوگا اور پیش دہن اس کے لئے
ایک بے معنی چیز ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی ناظر "بعد زمانی"۔ بعد چہارم جہاں کے اچسپ ہوگا تو فضا

سہ بعد بجا جاں کو دیکھ سکتا ہے اور جہات اربعہ اس کے لئے بے معنی سی بات ہے۔ اگرچہ انہیں کے ناظر کا تصور شکل ہے۔

لیکن اگر کوئی ناظر سرعت نور کے ساتھ حرکت کرے تو فاصلہ صفر رہے گا۔ گویا تمام نقاط فضائی جو معبر ناظر میں پڑتے ہیں وہ سب یکجا اس کے لئے جلوہ گر ہوتے ہیں اور ناظر تمام حوادث کو یکجا دیکھ سکتا ہے اور اس قسم کے ناظر کے لئے زمانہ ٹھہرا ہوا ہوگا۔ یعنی حوادث اگرچہ متفرق ہیں مگر نظر ناظر میں ایک آن میں ہوں گے۔ وہ طول زمان کے ساتھ نظر ناظر میں ستر نہیں ہوں گے اور اس ناظر کے لئے ماضی، حال، مستقبل بے معنی چیز ہے۔ اس کی نظر میں سب ایک ہی آن میں ہے۔ اور جب ہم جانتے ہیں کہ خدا زمان و مکان سے مافوق ہے تو تمام موجودات اور تمام حوادث خواہ ماضیت ہوں یا مستقبل سب اسی کے سامنے حاضر ہوں گے۔

اور اس بنا پر ہم ہر وقت اس خالق کے سامنے ہیں جو ہر صغیر و کبیر کو جانتا ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے :- إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا قَعَّمُوا لِقَائِهِ (احزاب / ۹)

لہذا ہمارے اوپر واجب ہے کہ ہم اپنی مسکونیت کا احساس کریں اور ہر اس نفس و غرض سے اجتناب کریں جو ہمارے انحطاط اور عن اللہ کا سبب بنے اور خدا سے علیم علی الاطلاق کے حضور میں سرنگوں رہیں جس نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر زندگی کے مختلف مراحل کو طے کرایا یہاں تک کہ ہم اس مرحلہ میں داخل ہو گئے جہاں ہمارے پاس طاقت و استعداد ادنیٰ ہے۔ اور ہم کو ان اواخر کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے جو ہمارے لئے طریق سعادت کھولتے ہیں اور ان فی البند مقصد تک پہنچاتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اوصاف الہی سے مزین ہو جائیں اور تقاضا کے لئے راہ راہ اکٹھا کر لیں۔ تاکہ رجوع الی اللہ یعنی رجوع الی مبداء الوجود کا تحقق ہو سکے اور ہم ان مقامات تک تقویٰ کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ لہذا خدا کی معرفت اور اس کی توحید مسکونیت علی ان کے گرد نہ پرانیت الہی کے عنوان سے رکھتی ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

مباحثِ عدل

نظریات و بارۂ عدل

تمام الہی صفات کے اندر عدل کی ایک الگ خصوصیت ہے۔ مسلمانوں کے نظریات عدل الہی کے سلسلہ میں مختلف ہیں۔ اپنے اپنے نظریات و اجتہادات کو مختلف اشکال سے پیش کیا ہے۔

۱۔ اشعری حضرات — مذہب اہل سنت کی وہ جماعت جو ابو الحسن اشعری کے پیروکار ہیں۔ عدل الہی پر ہماری طرح کا ایمان نہیں رکھتے۔ اور افعال الہی میں عدل کا انکار کرتے ہیں۔ اسی کے نظریہ میں خدا جو کام بھی کرے وہ عدل ہے یہاں تک کہ اگر کسی عمل کے ذریعہ نواب یا عقاب کے بغیر کسی کو ثواب یا عقاب کرے تو یہ فعل حسن ہے اور خالص عدل و حق ہے۔ یہ حضرات عدل کا اختراع افعال خدا کے کرتے ہیں اور ہر اس چیز کو عدل کہتے ہیں جو خدا کی طرف مستند ہو اس بنا پر اگر خدا احسنین کو عقاب اور گنہگاروں کو ثواب عطا کرے تو یہ مین عدل ہوگا اور اگر اس کے برعکس کرے یعنی اچھوں کو ثواب اور بروں کو عقاب کرے تب بھی عدل ہے۔

یہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کے بارے میں عدل و ستم کی تعبیر غیر معلوم ہے اس سے یہ لوگ بزرگ خود پروردگار عالم کی تقدیس کرتے ہیں جبکہ ہم لوگ کیا بلکہ کوئی بھی دانشمند اس قسم کی نسبت کو جو تعصب و نارسائی فکر کی پیداوار ہے اس کو کبھی بھی تقدیس نہیں شمار کرتا۔ اس حکم کی فکر انظم و حساب اصل علت و معلول بسبب تشبہ نظام عالم و افکار بشر میں انکار ہے۔

یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ نور عقل اپنی تمام نورانیت و اشراقیت کے باوجود اولاد کات دینی اور مسانی و احکام اسلام کے سلسلہ میں سمجھ جاتا ہے۔ اور اس منزل پر آکر اس کی روشنی اتنی کم ہو جاتی ہے کہ پیش با افتادہ چیزیں بھی نہیں دکھائی دیتیں۔ لہذا ان مساکین عقل کی ہدایت پر بھروسہ کرنا ناممکن سمجھتا ہے۔

لیکن یہ دعویٰ نہ تو قرآن کے مطابق ہے اور نہ سنت کے مطابق ہے کیونکہ قرآن مجید تعقل سے اعراض کو ضلال کہتا ہے۔ بلکہ معارف الہی اور عقائد دینی کی طرف تذبذب و غور و فکر کرنے کے لئے انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس چراغ سے — جو آنا روشن ہے — استفادہ نہیں کرتے ان کی تشبیہ خدا نے جانوروں اور حیوانات سے دی ہے۔ ارشاد ہے :-

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الضُّعَمُ الْبُكْمُ — (الأنعام - ۲۱)

اس میں تنک نہیں کہ زین پر چلنے والے تمام حیوانات سے بدتر وہ بہرے گوشت (کفار) ہیں۔

رسول خدا ہم فرماتے ہیں: گوشتوں کی ہدایت کے لئے خداوند عالم نے دو راہاں بھی کئے ہیں اول ظاہری راہی جن کو انبیاء کہا جاتا ہے دوم باطنی راہی جس کو عقل کہا جاتا ہے۔ (کنز العمال)

اس فرقہ کے مقابلہ میں مسلمانوں کے دلوں پر اور یہی مقررہ اور شیوعہ۔

۲۔ مقررہ حضرت :

یہ حضرات صفات الہی میں عدل کو مانتے ہیں اور عدل کو انہوں نے مستقلاً ایک بنیاد میں قرار دیا ہے۔ اور اعمال انسانی میں قضا و قدر کو مجبوری کی حد تک مانتے اور خلاف عدل قرار دیا ہے۔ ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ نظام کونی اور نظام شمسی دونوں میں افعال خدا مبنی بر عدل ہیں اور جس طرح انسانی اعمال کو حسن و قبح کے مقیاس پر تو لیا جاتا ہے۔ افعال خدا بھی اسی معیار پر تولے جاتے ہیں۔ اور چونکہ انہوں نے عقل منطقی عدل ایک پسندیدہ اور ظلم و ستم ذمنا پسند افعال ہیں اس لئے معبود مدبر اور حکیم علی الاطلاق کسی ایسے فعل کو انجام نہیں دے گا جو عقلاً مذموم بلکہ ممنوع ہو۔

ہم جس وقت کہتے ہیں: اللہ عادل ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ خداوند عالم حکمت و مصلحت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ خدا کے سلسلے میں حکمت کا مطلب یہ نہیں ہے

کہ وہ اپنی کیوں کو پورا کرنے اور اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لئے بہترین وسیلہ انتخاب کرتا ہے کیونکہ یہ تو انسانی ہے کہ جس کی حرکت نقص سے کمال کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن خدا کا کام تو موجودات کو نقص سے خارج کرنا اور ان کو ان کے یعنی موجودات کے ذاتی مقاصد و کمالات کی طرف پہنچانا ہے اور ہر مخلوق میں حکمت کا مطلب وہ غایات و مقاصد ہیں جو اس میں خدا نے ودیعت کر دیے ہیں۔ اور خدا ان چیزوں کو فیض و وجود بخش کر دوبارہ ان کے استعداد کے تکمیل کی طرف لپاتا ہے۔ بلند ایہ جان لینا چاہئے کہ عدل کا مفہوم تو بہت وسیع ہے لیکن اس کے واضح ترین مصداقی ظلم و عدوان سے دوری ہیں۔

اہم جعفر صادق ؑ نے عدل کے معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا: خدا کے بارے میں عدل کا مطلب یہ ہے کہ تم خدا کی طرف کسی ایسی چیز کی نسبت نہ دو کہ اگر وہی چیز تم سے سرزد ہوتی تو باعث ملامت ہوتی۔ (کفایۃ الموحیدین - ج ۱ - ص ۲۲۵)

سکوک و عمل میں ہر ظلم و فساد اپنے اسباب و اسباب اور انسانی سے اس کے صادر ہونے کے صورتوں میں اختلاف تفاوت کے ساتھ ہمیشہ اس کا بھی نہ صرف یا تو جہالت و نا اگاہی یا ضرورت کی وجہ سے ہوتا ہے اور یا پھر کینہ و عداوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بہت سے ایسے بھی لوگ ہیں جو ظلم و فساد سے اظہار خیراری کرتے ہیں لیکن عواقب امور کی جہالت کی وجہ سے کبھی ظلم و عدوان یا اعمال فاسدہ و مبینہ کے مرکب ہو جاتے ہیں۔

کبھی کبھی ان ایسی چیز کا محتاج ہو جاتا ہے کہ یہاں پر توانائی اور امکانات اس کے اختیار سے باہر ہو جاتے ہیں اور پھر ان اپنے حصول مقاصد کے لئے بہت سے فسادات و تباہیوں پر آمادہ ہو جاتا ہے، ضرورت، حرص شدید، الم و تکلیف، کینہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ان دوسروں پر ظلم کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تو وہ اپنے ہاتھ سے اختیار دے بیٹھتا ہے۔ اور وہ اپنی ساری کوششوں کو حصول مقاصد کے لئے بروئے کار لاتا ہے اور اس سلسلہ میں تمام اخلاقی و انسانی قید و بند کو توڑ دیتا۔

اور مظلوم کی گردن پر سوار ہو تا ہے۔

مگر ذاتِ احدیت ان خصائص و نقائص سے پاک و مبرہ ہے کیونکہ اس کے وسیع علم کے سامنے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اور نہ اس کے لئے کسی قسم کی عاجزی یا ذلت کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اور ظاہری بات ہے جو ذاتِ سبحانیہ جمیع صفات اکمال ہوگی وہ کسی بھی شی کی طرف ابداً محتاج و فقیر نہیں ہو سکتی اس لئے کہ خدا کو یہ خطرہ نہیں ہے کہ کہیں وقت نہ نکل جائے اور جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے تو بغیر کسی محدودیت کے وہ اپنے ارادہ کو پورا کرنے پر قادر ہے اس لئے وہ عادلانہ عدالت سے خارج ہو کر کسی پر ظلم نہیں کرے گا اور نہ تشفی خاطر کے لئے کسی سے انتقام لے گا اور نہ ہی کوئی ایسا کام کرے گا جو اس کے کمال کے منافی ہو۔

پس معلوم ہوا کہ اس قسم کے اعمال کے اسباب ذاتِ پروردگار میں متحقق ہی نہیں ہو سکتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ظلم و ستم کا مصداق وہ ذاتِ حقیقی ہو جس کا فیض جوہ اور قدانت ذاتِ تمام جمہات و وجود پر منجلی ہے۔ خود قرآن مجید ذاتِ پروردگار عالم سے ظلم اور ہر اس عمل کی نفی کرتا ہے جو اس کی ذاتِ مقدس کے مناسب نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے :-

فَمَا كَانَ اللَّهُ يَغْلِبُ لَهُمْ وَلَٰكِنَّ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (اروم ۶۱)

پس خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا مگر وہ لوگ (کفر و کفری سے) اپنے آپ پر

ظلم کرتے تھے۔

اس آیت میں خدا نے اپنی ذات سے ظلم کی نفی کی ہے اور بندوں کی طرف نسبت دے دی ہے۔

اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا ایک طرف تو اپنے بندوں کو

اقامۂ عدل کا حکم دے اور فحشاء و منکر و بنی سے منع کرے اور خود ان چیزوں کا ارتکاب

کرے اور خلافِ عدل کرے ؟ ارشاد ہے :-

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ قَالِ يَا ذَا الْقُرْآنِ وَيُصْهِرُ الْإِنْسَانَ

الْعَشَاءَ وَالنُّجُومَ وَيَعْلَمُ الْغُيُوبَ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ - (النحل ۸۹)

اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور دونوں کے ساتھ نیکی کرنے اور قزاقوں کو دیکھ کر دینے کا حکم کرتا ہے۔ اور بدکاری اور ناشائستہ حرکتوں اور سرکشی کرنے کو منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نجات حاصل کرو۔

اس آیت میں خدا بندوں کو عدل کا حکم دے رہے تو خود اس کے خلاف کیونکر اقدام کر سکتا ہے۔ مترجم۔

قرآن کی نظر میں عدالت کا مسئلہ بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے اور مقام عدالت کو اتنا اونچا کرتا ہے کہ بغیر اس کا مقصد ہی اقدام عدل قرار دیدیا ہے۔ ارشاد ہے:-

إِنَّا أَمَرْنَا مُسْلِمًا مِّنْ بَنِي آدَمَ بِالْقِسْطِ ۚ وَأَسْرَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْزُرَّانَ لِيَقُومُوا لِلنَّاسِ بِالْقِسْطِ ۚ ۱۶۷

ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو اور وحی و روشن معجزے دیکر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور انصاف کی (ترانو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

عدالت اجتماعی کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کا نظریہ ملا خط فرماتے۔ ابن عباس کا بیان ہے ایک دن میں حضرت علیؑ کے پاس ذی قاریں گیا تو دیکھا آپ اپنی جویوں کو ٹانگ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمایا: اس جوتی کی کیا قیمت ہوگی؟ میں نے عرض کیا اس کی کوئی بھی قیمت نہیں ہے اس پر فرمایا: اس پرانی جوتی کی قیمت میری نظر میں تمہاری اس حکومت سے زیادہ ہے لہذا میں اس حکومت کے ذریعہ عدالت قائم کر سکوں۔

اسلام عدالت اجتماعی کی اہمیت کا اتنا قائل ہے کہ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت عدالت اجتماعی کے جادہ سے منحرف ہو جائے اور دوسروں پر ظلم و تعدی کرنے لگے تو ان کو اس اقدام سے روکنا ہوگا چاہے اس کے لئے جنگ کرنا پڑے۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

فَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَغَاتِلُوا الْأُتْرُقَ حَتَّىٰ تَأْتِيَ إِلَىٰ أُمْرِ اللَّهِ فَإِنَّ فَادَتْ فَأَصْلَحُوا

بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ ذَا قُسْطٍ اِنَّ اِلٰهَ يَجِبُ الْمُقْسِطِيْنَ (الحجرات ۹)
 اور اگر مومنین میں سے دوسرے آپس میں لڑیں تو ان دونوں میں صلح کرادیں
 اگر ان میں سے ایک (فریق) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو فرقہ زیادتی کرے تم (میں)
 اس سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے پھر جب رجوع نہ
 تو فریقین میں مساوات کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف سے کام لو۔ بیشک خدا
 انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں ایک خاص نقطہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ دونوں میں صلح کر دے
 ہیں۔ ان کو بہت زیادہ دقت کرنی چاہئے تاکہ نزاع کا خاتمہ عدالت نامہ پر ہو اور کسی بہانہ و حق و
 عدالت میں کمی نہ ہو۔ کیونکہ جہاں پر دو ایسے فریقوں میں جنگ ہوتی ہے کہ جہاں ایک کی طرف
 سے دوسرے پر زیادتی ہو تو اگر یہ بچوئی حضرت مسالحت کے ذریعہ سے سُنَد کو ختم کرنا
 چاہتے ہیں تو اگر یہ معافی تلافی پر دباؤ ڈال کر ایک پارٹی کو اس بات پر راضی کر لیں کہ وہ اپنے
 حق سے دستبردار ہو جائے تو اس بات کا احتمال ہے کہ یہی عذر و معذرت روح تباد
 و زیادتی کو ان افراد میں اور زیادہ تقویت پہونچا دے جنہوں نے جنگ و ستیزہ جوئی میں کب
 امتیاز کیا ہے اور پشتری مسالحت میں زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ ظالم کو کچھ صبر دیا کر راضی
 کر لیا جاتا ہے۔

اور بعض حقوق سے چشم پوشی اگرچہ فی نفسہ ایک پسندیدہ چیز ضرور ہے مگر اسی قسم کے
 مواقع میں ظالم کے دل میں اچھا اثر نہیں چھوڑتی۔ حالانکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ
 میں ظلم و عداوت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ کوئی شخص
 ظلم و زیادتی سے کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتا۔

نظام وجود کو دیکھ کر ہم خود بھی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس میں ایک ایسا توازن و اعتدال
 ہے جو تمام ظالم و ملکی پر حکومت کر رہا ہے۔ اور اس اعتدال کا ظہور ذرات، الکترونیات،

اور تمام اجسام کی حرکت میں نمایاں ہے، کھینٹ وں کی رفتار، سیارات کے دودے کے ساتھ عالم جماد و نبات میں بھی ایک مخصوص توازن و اعتدال موجود ہے۔ بلکہ ایک زندہ موجود کے اعضا میں مکمل اعتدال ہے۔ مختصر یہ کہ ایٹم کے اجزاء داخل سے یکے میں ماسوائے کرات پر سلسلہ موجود ہے۔ یہ ساری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ تمام اجزاء عالم میں ایک انتظام تام موجود ہے۔ حضور سرور کائنات نے اس عدالت عمومی اور توازن تام اور یہ بات کہ کوئی چیز بغیر حساب کے نہیں ہے اس کو اپنے ایک مختصر و بیغ جملہ میں بیان فرمایا: یہ عدل ہی ہے کہ جو آسمان و زمین کو اپنی جگہ پر رکھ رہا ہے۔

قرآن مجید جناب موسیٰ کی زبان سے کھلوا رہا ہے :-

مَا تَسْأَلُنِي اَعْطِيْكَ كُلُّ شَيْءٍ خَلَقْتُهٖ ثُمَّ هَدٰىنِي (طہ ۵۰)

موسیٰ نے کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب صورت عطا فرمائی۔ پھر اس نے زندگی بسر کرنے کے طریقہ بتائے ہیں۔

جناب موسیٰ ایک مختصر سے جملہ میں نظم و لطف و زیبائی سے سرشار کائنات و آفرینش کو جو منجملہ آیات خداوندی ہے۔ فرعون سے جانا ہے جس نے اس کی فکری نجات پا جائے اور وہ الٰہی عادلانہ نظام کے وجود کو پوری کائنات میں محسوس کر سکے۔

نظام و اعتدال تو کائنات پر فطری طور سے نافذ ہے۔ فطرت کا ہر جزو سنن و قوانین طبیعت کے چوکھٹے کے اندر اپنے کمال و سیفرا میں کی طرف رواں ہے۔ اور نظام عام اور اس پر حاکم و رابط میں کسی بھی قسم کا انحراف نظام کو میں اختلال و اضطراب کا سبب بن جاتا ہے۔

فطری طور پر ظواہر طبیعت میں کسی بھی قسم کی بے نظمی خود ظواہر میں عکس العمل کی نشان دہی کرتی ہے اور داخلی یا خارجی عوامل جو راہ تکامل میں ممانع ہوں یہ ظواہر ان کو ختم کر دیتے ہیں اور رشد و کمال کے ادا کے لئے راستہ کو باز کر دیتے ہیں اور دوبارہ نظم کو برقرار

کر دیتے ہیں۔

جس وقت بدن پر بیماریوں کا حملہ ہوتا ہے یا میکروببات کا حملہ ہوتا ہے سفید دُموی خلیا (۵۰-۵۵) ان میکروببات کے حملہ کو روکنے پر جبری طور سے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور طبی علاج و معالجہ ان کے لئے خارجی مدد ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ بدن کو پھر اعتدال پر لانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن انسان پر جو نظام عدلی لگا ہوا ہے اس کا حال اس سے الگ ہوتا ہے کیونکہ انسان کو قدرت اختیار عطا کی گئی ہے۔

لیکن وہ خدا جو رحمان و رحیم، منعم و کریم ہے اس کے لئے محال ہے کہ کوئی ایسا کام کرے جو عدلِ مطلق کے خلاف ہو۔ اور یہی قرآن کی آواز ہے :-

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَوَّضَكُمْ فِيهَا نَاجِيًا
مَوَازِمَ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ (رومن/ ۶۴)

اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے واسطے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں تو ابھی تم ان میں بسائیں اور اسی نے تمہیں صاف ستھری چیزیں کھانے کو دیں۔ یہی اللہ تو تھا۔ پروردگار ہے۔

عالم پر شر و فساد کی حکمرانی کیوں؟

خدا کی عدالت سے لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً جب خدا عادل ہے تو نظام عالم میں یہ بلائیں، خسائر، شرور کا وجود کیوں ہے؟ معاشرہ کے طبقات میں نفاٹیں کیوں ہیں؟ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اس قسم کے سوالات و اعتراضات پیدا ہوتے ہیں جس سے وہ ہشکارا نہیں حاصل کر پاتے اور اس کو عقدہ لایکل سمجھنے لگتے ہیں۔

وہ لوگ کہتے ہیں: یہ کیوں ممکن ہے کہ جب عالم ایک حکمت کے پیش نظر پیدا کیا گیا تو پھر اس میں آلام و شرور کی حکومت کیوں ہے؟ اور تفاوت و بدنہی کا دور دورہ کیوں ہے؟ اور چاروں طرف خرابیاں اور نفاٹیں کیوں موجود ہیں؟

آخر دنیا کے گوشہ و کنار میں وحشتناک حوادث جتنی ہستیاؤں کیوں مورد حملہ قرار دیتے ہیں؟ اور ہزاروں دیرانیاں، تلفات، نقصانات کیوں ہوتے ہیں؟

کیوں یہ خولصورت ہے اور یہ بد صورت ہے؟ یہ صحیح ہے یا بھلا ہے؟ یہ سب بڑے کیوں نہیں خلق کئے گئے؟ کیا یہ اختلافات اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ سر زمین حیات پر کوئی خدا کا فرما نہیں ہے؟

جب تک دنیا سے ظلم، تبعیض، آفت، مصیبت، نقص، ضعف، فقری، بیماری کا فائدہ نہ ہو جائے نظام عدالت کا تحقق ناممکن ہے!

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کو یہ قبول کر لینا چاہئے کہ ماضی وجود میں ہماری تحقیقات ہم کو ان ظواہر وجود کے گہرائی کی انتہا تک نہیں پہنچا تیں اور نہ ان کی نہایتوں اور غایتوں کی توجیہ و تفسیل کے لئے کافی ہیں۔

یہ درست ہے کہ پہلی نظر میں تلخ حوادث اور بتایا ان کی حقائق کی معرفت کے بغیر ہم کو یہ تصور عطا کرتی ہیں کہ نظام عالم میں عدل کا وجود نہیں ہے اور جب انسان اس بات کو ذہن سے سوچتا ہے تو اس کے فکر کا اثرات میں عظیم انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور اسی تاثر کے عالم میں وہ مسلسل غیر منطقی تحلیل کرنے لگتا ہے۔

لیکن اگر ذرا گہرائی اور بنیادی طور پر غور و فکر کریں تو ہم کو یہ پتہ چل جائیگا کہ ہمارے اس تصور کی بنیاد صرف اس بات پر قائم ہے کہ ہم ان موجودات پر حکم لگانے کے سلسلہ میں نبی اور ان لوگوں کی ذات کو جو ہم سے ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ مربوط ہیں اور اپنے اور ان لوگوں کے مصالح کو معیار بناتے ہیں کہ جو چیز ہمارے لئے نفع بخش ہے وہی حسن اور جو ہمارے لئے مضر ہے وہی قبیح ہے پس حسن و قبیح کا معیار وہ ہے جس کو ہماری قاصر نظریں مست ہائے حاکم برہستی پر دقیق معرفت کے بغیر حسن و قبیح دیکھتی ہیں۔ پس کیا حوادث کا ارتباط صرف ہم سے ہے تاکہ ہم اپنی ہی ذات کو حسن و قبیح کا معیار قرار دیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔

ہماری مادی دنیا بغیر پذیر ہے جو حوادث آج بھی ہیں وہ کل ہو سکتے ہیں۔ کچھ چیزیں مادی ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ دوسری چیزیں آجاتی ہیں۔ آج جو چیز بعض لوگوں کے لئے مفید ہے کل ہو سکتا ہے اس کا خارجی وجود ہی نہ رہے۔ لیکن چونکہ ہم انسان ہیں اور اپنے سے اور کائنات سے ایک لگاؤ اور علاقہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ہاتھوں سے چیزوں کا نکل جانا برا اور ہمارے ہاتھوں میں آجانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ انسانوں اور اشیاء سے اس کی وابستگی کو چھوڑ کر بھی عالم کے تغیر پذیر ہونے کی وجہ سے مختلف حوادث پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اگر امکان تغیر ہی ختم ہو جائے تو کوئی حادثہ نہ ہوگا اور پھر ایسی صورت میں خوب و بد کا بھی وجود نہ ہوگا۔ (یعنی یہ تمام چیزیں تو تغیر عالم کے لوازم سے ہیں ان سے عالم کے نظام کا خلافت عدل ہونا لازم نہیں آتا۔ مہرم)

اور پھر اس خیالی دنیا میں نہ نقص ہوگا نہ کمی ہوگی نہ نظروں کے سامنے رشد و نمو کا وجود

ہوگا۔ اسی طرح اس خیالی دنیا میں تضاد و تباین، انتظام و تفاوت، حرکات و ترکیبات میں تنوع کچھ بھی تو نہ ہوگا۔ اور جس خیالی دنیا میں کمی نہ ہوگی۔ مضابط و قانون نہ ہوگا۔ انسانی، اخلاقی، اجتماعی حد بندی نہ ہوگی وہ بھی تو تغیر پذیر ہوگا اور حرکات سیارات کا مولود ہوگا اور جب تحول و تفاوت کا خاتمہ ہو جائیگا تو زمین، سورج، چاند، دنی، مہینہ، سال کچھ بھی باقی نہ ہوگا جس دنیا میں رنج و مصیبت نہ ہوگی، حرکت و سعی نہ ہوگی اور جس وقت خطرات کا احسا نہ ہوگا احساس امنیت پر مسرت و سرور بھی حاصل نہ ہوگا۔

جس دنیا میں امیدوں اور آرزوؤں کا ہجوم نہ ہو اور جانداروں میں عطف و محبت و مودت کا اثر ختم ہو جائے وہاں پر انسانوں کے روابط یا یہ محبت پر استوار ہی نہیں ہو سکتے اور جستجو کے کمال کا جذبہ انسان کے وجود کے گہرائیوں میں ڈوب جائے گا۔

ایک جہاں بنی وسیع کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مکمل ہے آج جو چیز ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ وہ حال یا استقبال میں دوسرے کے لئے فائدہ مند ہو۔ کیونکہ کائنات کی تلاش و حرکت برائے تحقیق ہدف عالم ہے اور تمام موجود کے سود بخندی کے لئے ہے۔ اور بہت سے افراد اس سلسلہ میں نقصان اٹھاتے ہیں اور یا پھر وہ تمام افراد انسانی کے لئے مفید بنی ہے۔

البتہ اگر ہمارے اسکان میں یہ بات ہوگی کہ معارف الہیہ کے سمندروں میں غوطہ لگا کر علوم کی انگلیوں سے اسرار و رموز کے محائف کے اوراق کو تلاش کرتے تو یقیناً حوادث کے عواقب و فلسفہ ہماری نظروں میں واضح و روشن ہو جاتا۔ لیکن جب ہم یہ جانتے ہیں کہ آج کے عوامل علی سبب کے سلسلہ کا نتیجہ ہیں اور یہی بعد والے حوادث کے اسباب اور آنے والے معلومات کی علل ہیں تو پھر ہم کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ ہم جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں اور اس پر خیر و شر کا حکم لگا رہے ہیں یہ حکم جامع اور عمیق نہیں ہے۔

ان اگر ہمارے لئے ممکن ہوتا کہ اوپر سے مجموعہ عالم کے ہر جانب کو۔ خواہ ایک بائی ہو یا سیلی۔ دیکھ سکتے اور تمام اسرار و مشققات عالم کو دیکھ سکتے اور ایک ٹکڑے کے اثر و نتائج پر انسان کی طول تاریخ گزشتہ و آئندہ اور تمام موجودات کی نسبت اور ان کے مقامات اور تمام سائنس ہستی میں، شعاع انزلیت و ابدیت تک مطلع ہو سکتے اور یہ دیکھ سکتے کہ اس حادثہ کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں۔ تب ہمارے لئے حکم لگانا ممکن ہوتا کہ یہ حادثہ خیر ہے، لیکن کیا ان کے پس میں ہے کہ تمام اسرار عالم کا اتنا کامل و مکمل احاطہ کر سکے؟

لیکن جب ہمارے پاس اس تحقیق کی طاقت نہیں ہے اور اس سلسلہ میں ہمارا اقدام بہت ہی ناقص ہے اور اس عالم کے اسرار و رموز معقدہ کے چہرے سے نقاب کٹائی ہمارے لئے ناممکن ہے تو پھر ہمارے اوپر واجب ہے کہ جلد بازی سے کام نہ لیں اور ایسا ناقص فیصلہ کرنے سے توقف کریں۔ اور ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس بات کو بھی سمجھ لیں کہ اپنے مخصوص منافع و مصالح کو اس وسیع عالم کے نظام عام کے لئے معیاس نظر نہ قرار دیکر پفیدہ کریں: ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے امانی لہجہ بات کو۔ جو ظروف خاص کے تابع ہوتے ہیں۔ آخری حکم کا مدرک قرار دیں۔

بسا اوقات تحقیق مقصد کے لئے خود فطرت کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ عادتہ اس کے تصور انسان کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ ہم کیوں یہ تصور نہ کریں کہ یہ غیر متوازن و غیر متناسب حادثہ ایسی زمین مہوار کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں تاکہ اس سے جدید ماحول پیدا ہو سکے جو زمین میں خدا کا جانشین ہو۔ ہو سکتا ہے زمانہ اور محیط کے اوضاع و احوال اس بات کے متقاضی ہوں۔

اگر مشتاک تحولات و انقلابات مقصود و هدف کے پیش نظر جاری و ساری نہ ہوتے اور ادوار مختلف میں دواما باقی نہ ہوتے تو آج زمین پر مختلف النوع حیوان و انسان کا وجود نہ ہوتا۔

آخر چند حوادث و ظاہر استثنائہ کو دیکھ کر ہم عالم وجود کو بے علتی ہرج و مرج

وہ پائیگی سے کیوں متہم کریں؟ اور چند محدود و چھوٹے غیر موزون حوادث کو دیکھ کر انگشت اعتراض کیوں دراز کریں؟ اور ان تمام معقول مظاہر و عجیب و دقیق ظرائف کو بھول جائیں جو لامتناہی حکمت اور ارادہ مطلقہ نامہ کے آثار ہیں؟

بشری علوم اپنے تمام فرجندگی کے باوجود بہت تھوڑے سے اور محدود و قاصر ہیں۔ اور انسان تو ابھی معلومات کی ابتدا میں ہے اور یہ غرورِ علمی صرف الفاظ کی بازیگری ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ جو انسان ابھی صرف اپنے بدن کے اسرار سے کامل طور پر واقفیت نہیں رکھتا وہ نظامِ ہستی کے ہزاروں اسرار کو حل کرنے کی کوشش کرنے لگے تو یہ ایک حماقت کے سونی کیا ہے؟

کارل — (۱۸۸۴ء) — کہتا ہے ہم سے ہمارے جسم سے زیادہ کوئی شئی قریب نہیں ہے اس کے باوجود بھی ہم اپنے جسم کے اسرارِ کثیر سے واقف نہیں ہیں۔

انسان جب تمام جوانبِ ہستی میں تدبیر کو دیکھتا ہے تو اس کا خریفہ ہے کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ کائنات ایک روند تکاملی هدفدار کا مجموعہ ہے۔ اور اس کی ہر چیز ایک معین میزان کے تابع ہے اور اگر کسی چیز کو وہ معقول و معجزہ نہ دیکھے تو اس کو اپنی کوتاہ نظر سمجھے۔ اور یہ احساس کرے کہ اس کا محدود وجود کائنات کے تمام اسرار و احوال کو نہیں جان سکتا۔ لیکن نفسِ عالم وجود میں کوئی نقص نہیں ہے۔

کائنات میں تلخ حوادث کا ہونا ہماری نظر میں اس دیہاتی کے قصہ کے مانند ہے کہ ایک دیہاتی شہر میں گیا تو اس نے دیکھا بڑے بڑے بلڈوزر قدیم عمارتوں کے گرانے میں مشغول ہیں تو اس نے خیال کیا یہ عمارتوں کا گرانا اور اس کو ویران کر دینا جو قوفی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ تخریب اور قدیم عمارتوں کا گرانا کسی پروگرام اور کسی ہدف و مقصد کے بغیر تھا؟ اور کیا دیہاتی کا فیصلہ منطقی ہے؟ ہرگز نہیں وہ تو صرف عمارت کا گرانا دیکھ رہا ہے اسے کیا معلوم یہ انجینروں کے نئے پلان کے مطابق یہ کام انجام دیا جا رہا ہے؟

ایک دانشمند کا کہنا ہے کہ: جو لوگ ظاہر و جہاد پر نفس و مکر کا حکم لگاتے ہیں انکی مثال ان بچوں کی طرح ہے جو ایک ایسے ٹیچر کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جس کو اپنے پروگرام کے مطابق ایک جگہ دکھا کر دوسری جگہ دکھایا جائیگا۔ مگر بچوں کے نزدیک طنابوں کا اکھاڑنا، خمیہ کو اکٹھا کرنا انسانوں اور حیوانوں کی وہ انا آمد و رفت کا ہونا یہ سب باتیں ٹیچر کے ختم ہو جانے کا اعلان ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ دوسری جگہ دکھایا جائیگا۔

اگر ہم حقیقی دو وسیع نظریے مصائب و بجاؤں کے وقوع کو دیکھیں اور ان سے صحیح استفادہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ واقع میں یہ نعمت ہیں مصائب و بلا نہیں ہیں۔ بلکہ نعمت کا نعمت ہونا یا مصائب کا مصائب ہونا اس کے سامنے ان کے رد عمل سے مرتبط ہو کر رہتا ہے۔ اور ایک ہی شئی دو مختلف شخصوں کے لیے اس سے دو صفتوں سے متصف ہوتی ہے۔

انسان کے لئے مصیبت و تکلیف ایک قسم کی خطرے کی گھنٹی ہے جس کے ذریعہ ان اپنی کمی اور نقائص و غلطیوں کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اور درحقیقت یہ الم و تکلیف ایک فطری نعمت و کنٹرول ہے۔

اگر مالدار کی موجب عیاشی و تن پروری ہو تو تکلیف و بد بختی ہے۔ اور ننگہ ستی و فقیروں اگر سبب تربیت و پرورش اور تکامل روح ہو تو نعمت ہے۔ اس لئے مطلقاً ثروت کو خوشبختی اور فقیروں کو بد بختی نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ قانون تمام طبعی مواہب میں قابل اطلاق ہے۔

جو قومیں اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہیں اور اپنے وجود کے بقا کے لئے سعی و عمل کرتی ہیں وہ زندہ اور با اقتدار ہوتی ہیں۔ ہم جس وقت عمل کی صفت سعی اور مثبت کوشش سے کریں اس وقت ہم کو وہ شکل دور نہیں بھول جانا چاہئے جو انسان کو اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لئے ذاتی قوتوں کی تائید کے عمل میں آیا تھا۔ اور جو قوم سعی و کوشش نہیں کرتی اور مطمئن فضا میں زندگی بسر کرتی ہے وہ مادی سہولت اور شہوات و لذائذ

فرق ہونے کی وجہ سے بہت جلد شکست کھا جاتی ہے۔

اور بہا اوقات انسان عظیم مقاصد کے حصول کے لئے ایسی ایسی بڑی سختیاں اور تکلیفیں برداشت کرتا ہے کہ اگر وہ سختیاں نہ ہوتیں تو مقصد کی بزرگی ظاہر نہ ہوتی۔ اسی لئے گڑگاہ تکامل میں جلدی راہ اور اندھی و میکا نیکی حرکت قابل قبول نہیں ہے۔ اور انسانی کوششیں بغیر عزم محکم کے بغیر اس اسی تک نہیں پہنچ سکتیں کیشکاش و تضاد جانور کو بھیج راستہ پر چلا نیوالا گنڈا ہے۔ جمادات مضبوط و فشار کے نتیجہ میں چور چور ہو جاتے ہیں لیکن انسان مشکل و صعوبات میں گھر کر مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور بشر کا جو رخ شر و فخر کے بغیر ہوتا بھی نہیں۔

لذت مطلقہ اور عشق دنیا اور دنیا کو صدف بنالینا گمراہی و ابتذال ہے۔ بد بخت ترین لوگ وہی ہوتے ہیں جن کی تربیت لغت نامہ میں حیات کی سختیوں سے دور رکھ کر زمانہ کے گرم و سرد کوپکے بغیر کر جائے۔

خواہشات کی پیروی بار آور حرکت عزم محکم، سعی مسلسل کے ساتھ جمع نہیں ہوتی کیونکہ نفس و استقامت کی طاقت لذت بالہا و کی ضد ہے۔

لیکن جس طرح دونوں کا جمع ہونا میسر ہے ویسے ہی دونوں کی نفی بھی محال ہے لہذا انسان کا فریضہ ہے کہ سعی مسلسل کرتا رہے تاکہ ذاتی طور پر قوت ارادہ و ثبات منو جاتا رہے اور لذت و عیش کی طلب اسی حساب سے کم ہوتی رہے۔

دنیکہ شیرینی و تلخ حقائق سے بے خبر نازوں کے پروردہ حضرات چونکہ بے اندازہ دنیا و آسائش میں رہے ہیں بھوک کی سختی کبھی برداشت نہیں کی ہے اس لئے نہ وہ لذیذ ترین غذا کی لذت سے آشنا ہیں اور نہ لذت حیات کا ادراک کر سکتے ہیں اور نہ زیبائیوں کا احساس کر سکتے ہیں کیونکہ مشکلات سے آشنا بننے کا میوں اور غیوں کا مزہ چکنا، دشواریوں کی برداشت کی محنت رکھنا، رنجوں اور مصیبتوں کا تحمل کرنا — یہ وہ چیزیں ہیں جو قدم بہ قدم انسان کے ساتھ ہیں — لہذا زندگیات سے فائدہ اٹھانے کی شرط ہے۔

جب انسان ناگوار حوادث کے نیچے پست ہے اور دنیا کی بلندی و پستی کو لمس کرتا ہے تب اس کی نظر میں گرفتار زندگی کی معنوی و مادی مشرکات آتے ہیں۔

حیات مادی میں سرگرم ہونے کی وجہ سے انسان دنیا کا غلام بن جاتا ہے۔ اور آزادی خیر کو کھو بیٹھتا ہے، حیات ابدی سے غافل ہو جاتا ہے یا تغافل کرنے لگتا ہے۔ اور جب تک خواہشات کے پردے اس پر سایہ فگن ہیں اور اس کی روح تاریکیوں میں اسیر ہے وہ مادی مواقع میں یک ننگے کی طرح ادھر ادھر مارا پھرے گا۔ اور خدا کے علاوہ سب ہی کا اسیر ہوگا۔ اس لئے وہ ایک ایسے بیداری کے وسیلہ جو بختگی افکار کا باعث ہو اور نفس مثبت رکھتا ہو محتاج ہے تاکہ اس کو جہان فانی کی یاد دلائے اور آزادی نفس — جو آسمانی تربیت کا مطلوب نہائی ہے — تک پہنچائے۔ اور ان تمام مواقع سے آواز کو کرائے جو بشریت کو کمال و رفعت سے روکتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ تہذیب نفس بہت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لیے خواہشات سے چشم پوشی کرنا ہوگا اور یہ بہت ہی کڑوا گھونٹ ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ اس قیمتی کس سے نفس استعداد روحانی کے لئے آمادہ ہو جائیگا۔ مگر یہ بھی مسلم ہے کہ گناہوں اور لذتوں سے اجتناب ایلوے سے زیادہ تلخ ہے اور بچھو کے ڈنک اور سانپ کے کاٹنے سے زیادہ سخت ہے۔ انسان اپنے حل مشکلات کے لئے اور رفع مواقع کے ملنے اتنی قدرت آسانی سے نہیں رکھتا۔ اور شدید مقاومت کے بغیر بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔

مصائبِ عامل بیداری و حرکت ہیں

جو لوگ کامیابیوں اور قدرت کے نشہ میں مست ہیں اور ان کی ارواح و عقول پر خواہشات غلبہ نے ان سے انسانی اقدار چھین لئے ہیں، گوشہ و کنارِ عالم میں واقع ہونے والے تلخ حوادث کبھی ان کے افکار و بیداری کے لئے زینہ ہموار کر دیتے ہیں اور ان کی عقلوں پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے اٹھا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کمالِ انسانیت کی طرف سیدھی راہ پر گامزن ہو جائیں اور مستقبل میں ایک نیک اور ثرودار نتیجہ کے حامل ہو جائیں، اور بہت سے ایسے لوگ بھگتتے ہیں جنہوں نے ان حوادث و آلام کے نتیجہ میں شاندار مستقبل کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

نفعانِ دہ اثرات، وحشتناک غرور و غفلت اور ان ترقی دروہس کے نتائج میں جن کو بشرانِ حوادث سے سیکھنا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حوادث و آفات — اگرچہ ان میں نسبی شرمی ہوتا ہے — بہت سی نعمتوں اور پوشیدہ الطاف پر مشتمل ہوتے ہیں جو انسان کو بیداری اور عزمِ محکم عطا کرتے ہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ دشواریاں تکامل کی مقدمات ہیں اور اقدارِ انسانی کے لئے زمین ہموار کرنے والی ہیں۔ اور انہیں دشواریوں سے درجہ خلوص و بلند ی یا انحطاط کا انسان میں تبدیل جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے :-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ
وَالثَّمَرَاتِ وَلَكِنَّ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمْ مِّصِيبَةٌ قَالُوا:
إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ - أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ

وَرَحْمَةً وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُحْسِنُونَ (البقرہ ۱۷۷-۱۷۸)
 اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے
 ضرور آزمائیں گے اور (اے رسولؐ) ایسے مہر کر نیوالوں کو کہ جب ان پر کوئی مبت
 آچڑی تو وہ ڈر سگتے بول لگتے ہم تو خدا ہی کے ہیں اور ہم اسی طرف لوٹ کر
 جائیں گے۔ خوشخبری دید کہ انھیں لوگوں پر ان کے پروردگار کی طرف سے
 عنایتیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

مشہور فلسفی ایمرسن (EMERSON) کہتا ہے: وہ تغیرات جو کبھی لوگوں کی
 سعادت کو چکنا چور کر دیتے ہیں۔ وہ اسی طبیعت کی طرف سے انتباہ ہے جس کی خلقت نور
 اور نکال کے لئے کی گئی ہے۔ کیونکہ جب روح انسان میں عبادت خالق کا شوق پیدا ہو جاتا ہے
 تو پھر روح میں اپنا وہ نظام جو مال و دولت اور دوستوں پر مبنی تھا چھوڑ دیتی ہے جس طرح
 چھوٹی پھیلان اپنی پہلی جگہ ترک کر دیتی ہے تاکہ اپنے لئے ایک لائق دور کا انتخاب کر سکیں۔
 مصیبت کے نتائج ذہن بشر پر اس وقت واضح ہوتے ہیں جب مصیبت کو گزرے جو
 زمانہ ہو جاتا ہے، امراض، نقص اعفاء، فقدان ثروت، دوستوں کی موت، ضرورت سے
 زیادہ مصائب کی وجہ سے مایوسی یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا جبران فوراً نہیں ہوتا لیکن جب زمانہ
 گزر جاتا ہے تو ان حوادث میں چھپی ہوئی طاقتوں کا اظہار ہوتا ہے۔
 رشتہ داروں کی موت ابتداءً سوائے مصیبت اور محرومیت کے کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن خود
 ہی دنوں کے بعد ہدایت و ارشاد کا سبب بن جاتی ہے۔ کیونکہ یہ حادثات ہماری زندگی میں
 انقلاب لاتے ہیں، بچپن اور جوانی جن کو بہر حال ایک دن ختم ہونا ہے ان کو خاتمہ تک
 پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور اس کے کاموں سے مانوسیت کو ختم کر دیتے ہیں لیکن اسکی
 جگہ آدمی کے اندر ایک ایسی محبت مردانہ پیدا کر دیتے ہیں جس میں نمود کمال کی استعدادیں
 زیادہ ہوتی ہے۔

جو شخص آفتاب کی حرارت کی پرواہ کئے بغیر، اور کسی نگرانی کے بغیر اگر مثلاً گلاب اچھی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کو انجیر کے درخت کی طرح ہو جانا چاہئے جس کو باغبان نے لاپرواہی کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے اور بے اعتنائی کی وجہ سے باغ کی دیواریں بھی گر چکی ہوں کہ وہ درخت کتنا قوی اور طاقت دار ہوتا ہے جس کے پھلوں سے لوگ استفادہ کرتے ہیں اور اس کے سایہ میں آکر پناہ لیتے ہیں۔

یقیناً خدا ایسے عالم کو خلق کر سکتا ہے جس میں نہ بدبختی ہو نہ رنج و تکلیف لیکن اگر ایسا عالم پیدا کر کے انسان سے اس کی قدرت و آزادی و اختیار کو سلب کرے اور دیگر موجودات کی طرح اس کو بھی اس کائنات و وسیع کے اندر بے ارادہ و اختیار، بے شعور موجود بنا دیتا جو فطرت کے تحت تاثیر کوئی شکل و صورت اختیار کر لیتا تو کیا ایسے موجود کو انسان کہنا مناسب ہوتا؟

کیا انسان اپنی تمام استعداد کو کھو کر اور گران بہا ترین سرمایہ دیکر — یعنی حریت و آزادی — اپنا کمال حاصل کر لیتا؟ اور کیا اس کا انجام انحطاط و سقوط کی صورت میں ظاہر نہ ہوتا؟ اور کیا کائنات سے اس کی خیر و زیائی — یعنی ہر ایک کی اس کے مدد سے تشخیص نہ ہو جاتی؟ وہ خدا کو جو حکیم ہے اور جس کی حکمت پورے موجودات پر حاکم ہے اس نے یہ چاہا کہ خود کی تجدید و اتقان سے اور انسان کو حریت و اختیار — یہ اس کی ایسی نعمت ہے کہ جس کی قیمت لگائی ہی نہیں جاسکتی — دیکر اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرے۔

انسان کے اندر اس نے اچھائی و برائی کی قدرت عطا کی۔ اور کسی بھی شئی — اچھائی یا برائی — پر مجبور کئے بغیر انسان سے ہمیشہ خیر کا منتظر رہا۔ کیونکہ شر اور فحش کو اس نے کبھی پسند نہیں کیا۔ ہاں اس نے فعل حسنِ جمیل کو ہمیشہ پسند کیا ہے اور اس کے فعل اور ترکِ مند

پر اتنا اجر معین کیا ہے جس کا شمار بھی ممکن نہیں ہے۔ اور بدینتی اور جان بوجھ کر شر کرنے سے روکا ہے اور غذا بالیم سے ڈرایا ہے۔ اب یہ انسان کے اختیار کی چیز ہے کہ جی چاہے تو اس کی باتوں پر اپنے ارادہ و اختیار سے عمل کر کے عبد تک رسد یا اس کی ہدایت کی مخالفت کر کے عبد کفور بنے۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ ظہارت و نور کی طرف پھٹنے کا راستہ کھلا رکھا ہے کہ اگر کبھی انسان سے لغزش ہو جائے تو دوبارہ خدا کے دامن لطف و رحمت میں پناہ لے سکتا ہے۔ یہ خدا کا بہت بڑا لطف و عدل اور عظیم رحمت ہے۔

نیک عمل کر نیو اسے کو اگر خدا فوری جزا دیدے تو غیر صالح عمل اور بد سیرتی پر کوئی نصیحت نہ ہوگی جس طرح کہ اگر برے کام پر فوراً سزا دیدے تو فیصلت کو روزالت پر اور طہارت کو جنبش پر کوئی فیصلت نہ ہوگی۔

کائنات کی بنیاد اللہ پر ہے اور مادہ کی بھی تحول پذیری والی صفت کے باعث فیض خدا دنیا میں جاری و ساری رہا ہے۔ اگر مادہ کائنات کو کچھ موجودات سے مل کر مختلف صورتیں اختیار نہ کرتا اور جدید صورت اختیار کرنے کی اس میں صلاحیت نہ ہوتی تو اس کائنات میں کبھی بھی نوع اور تکامل کا وجود نہ پایا جاتا۔ تاغیر ذات کائنات، جامد سرمایہ کی طرح ہے جس سے کوئی سود حاصل نہیں ہو سکتا۔ دراصل گردش سرمایہ ہی سود و نفع کا سبب بنتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص سرمایہ اپنے جریان میں نقصان دہ ہو۔ لیکن کائنات کے تمام مادے دنیا کے سرمایوں کی طرح ہیں جو یقیناً گردش سے سود آور ہوتے ہیں۔

مادہ کی صورتوں میں تضاد بھی فائدہ بخش ہے کیونکہ یہی چیز ہستی کو کمال کی طرف بڑھاتی ہے۔ یہ بات تو ہم اس وقت کہہ رہے ہیں جبکہ لفظ شر کو دنیا میں جس طرح استعمال ہوتا ہے اسی معنی میں استعمال کریں۔ لیکن اگر غور و خوض کیا جائے تو پتہ چل جائے گا کہ شر بمعنی بدی یہ حقیقی صفت نہیں ہے بلکہ یہ بدی کے معنی اضافی ہیں۔ مثلاً اگر اگلنے والے اسلحے اگر دشمن کے ہاتھ میں ہوں تو ہمارے لئے شر ہیں، لیکن اگر ہمارے ہاتھ میں ہوں تو خیر ہیں

شر نہیں ہیں اور اگر نہ ہم ہوں نہ ہمارا دشمن تو یہ اسلئے نہ اپنے ہیں نہ برے ہیں۔
 اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ کائنات کا نظام ایک مشتعل برہنہ ہے اور دنیا کا ستم
 بنانے والے نے کچھ اس طرح بنایا ہے کہ ہماری خواہشات کا پوری ہونا ضروری نہیں ہے حالانکہ
 ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری لامحدود خواہشات بغیر کسی مزاحمت اور مانع کے پوری ہو جائیں لیکن طبعی دلائل
 ہمارے خواہشات کو پوری کرنے کے جوابدہ نہیں ہیں اور خواہشات بھی ایسے ہیں کہ جو بہت قیمتی
 نہیں ہیں۔ لیکن جب ہماری خواہشیں پوری نہیں ہو پاتیں تو ہمارے لئے بے جا رنج کا باعث بنتی
 ہیں اور ہم اپنے عوامل نامرغبات کو شرم سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ تعبیر ہم اس درجہ کرتے ہیں کہ
 شہون ہستی سے آگاہی نہیں رکھتے اور خود اپنے اندرونی اور بیرونی عوامل سے ناواقف ہیں۔
 اگر کسی کو معلوم ہو کہ چراغ میں تیل نہیں ہے اور چراغ جلانے اور وہ نہ بجے تو بجلا دینا
 آہ و زاری نہیں کرے گا۔ زمین و آسمان کو گناہیں دے گا۔

کائنات اپنی سعی مسلسل کے ساتھ شخصی مدد کی طرف سیر و حرکت کر رہی ہے اور اپنے سبب
 و عمل میں قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے۔ انسانوں کی خواہشات اور اس کی مہوس کائنات کو اپنے
 پروگرام سے نہیں روک سکتی۔

اس لئے ہم کو یہ قبول کر لینا چاہئے کہ اس کائنات کے کچھ جریانات ہماری خواہشوں کے
 مطابق نہیں ہیں اس لئے اپنے رنج و غم کو دنیا میں ظلم و ستم سے تعبیر نہیں کرنا چاہئے اور نہ نفسی
 ہی ناس سے بے عداقتی سمجھنا چاہئے۔

ایک دانشمند کہتا ہے طبیعت زیادہ روی اور اسراف کو نہیں جانتی، طبیعت ہمیشہ
 راستگو اور بزرگ ہے۔ اس کے عمل میں نہ کوئی لغزش ہوتی ہے نہ خطا۔ جو کچھ غلطی اور
 لغزش ہوتی ہے وہ صرف ہماری وجہ سے طبیعت عجز و ضعف سے جنگ کرتی ہے اور اپنے
 اسرار و رموز سوائے نومند، پاک اور متقی کے کسی دوسرے پر نہیں کھولتی۔

حضرت علیؑ دنیا کی مذمت فرماتے ہیں لیکن جو لوگ دنیا کو خوب پہچان چکے ہیں ان کے لئے

دنیا کو اچھی جگہ فرماتے ہیں۔ اور آپ خود اگر چشما داند و آلام سے پوری زندگی دوچار رہے لیکن لوگوں کو ہمیشہ خدا کی عدالت مطلقہ کی یاد دلاتے رہتے تھے۔

ایک اور حساس نکتہ کی طرف ہم کو توجہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ خوبی و بدی نفیام ہستی میں دو ایسی چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ایک مستقل ردہ کو تشکیل دیتی ہے۔ بلکہ خوبیاں عین ہستی اور برائیاں عین نیستی ہیں۔ جہاں سے وجود پیدا ہوتے ہیں وہاں عدم بھی صدق کرتا ہے۔ فقر و ناداری، جہل و بیماری یہ چیزیں الگ الگ مستقل وجود نہیں رکھتی ہیں بلکہ فقر و بیماری ناداری ثروت اور نادانی عدم علم ہے اور بیماریاں فساد و سلامتی کا نام ہے۔

البتہ علم ایک واقعیت و کمال رکھتا ہے۔ فقر کا مطلب۔ جیسا کہ گزرا۔ وہی مال و مال دنیائے حق اور جیب کا خالی ہونا ہے۔ پس نہ تو جہل واقعیت ملموس رکھتا ہے اور نہ ہی فقر ایک سرمدی کے سوا کچھ ہے۔

جب ہم آفتوں، درندوں، معینوں کو بڑا اور ناچار یوں کا حشر و ستم سمجھتے ہیں تو ایک قسم کا فقدان و نیستی درمیان میں ہوتا ہے کیونکہ ان کے برا ہونے کی وجہ دوسرے موجود میں منشا نیستی و نابودی کا ہونا ہے ورنہ ہر موجود اس لمبی فاصلے کے دارلے ہستی ہے کسی بھی طرح اس کو نازیبا نہیں کہہ سکتے۔ اگر یہ چیزیں اپنے ساتھ بیماری و موت کو نہ رکھتیں اور سبب اطلاق و فقدان ایک رشتہ ہستی نہ ہوتیں یا رشد و استعداد کی پرورش سے مانع نہ ہوتیں تو ہری بھی نہ ہوتیں۔ جو چیز ذاتی طور سے بری ہے وہ وہ تلفات اور ضایعات میں جو ان کی وجہ سے ناشی ہوتے ہیں۔

پس دنیا میں جو بھی موجود ہے وہ خوبی ہے اور بدی از قسم نیستی و عدم ہے اور عدم وجود کی قسم نہیں ہے لہذا شر بھی وجود کی قسم سے نہیں ہے۔

وجود و عدم بمنزلہ سورج اور اس کے سایہ کی طرح ہیں جب سورج کسی جسم پر پڑتا ہے تو

اس جسم کا سایہ پڑتا ہے لیکن خود سایہ کیا ہے؟ اس کا خود کوئی ذاتی وجود نہیں ہے۔ اس کے موجود نہ ہونے کی علت سوائے سورج کے نہ چلنے اور اس کا اس پر نہ پڑنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ورنہ یہ خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔

تمام چیزوں سے چونکہ خلق کا تعلق ہوا ہے لہذا ان کا وجود خود ان کے لئے وجود ہے۔ اور ان کا وجود واقعی وجود ہے اور اس لحاظ سے یہ چیزیں شر نہیں ہیں۔ بلکہ فلسفہ الہی کے اندر وجود خیر و احسان کا مادی ہے۔ ہر شے اپنے وجود میں خیر ہے۔ اور اپنے لئے خیر ہے۔ اور اگر یہ شر ہے تو اپنے لئے شر ہے۔ اپنے وجود اضافی کے لحاظ سے دوسری چیزوں کی نسبت سے شر ہے۔ اور وجود اضافی حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ یہ وجود اعتباری ہے جس کے وجود بالذات متعلق نہیں ہوا ہے۔

میرے ایک پچھرنی فلفہ اپنے لئے شر نہیں ہیں ان کو برا اور شر اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور اس کی موت و ملامت کا سبب بنتے ہیں اور جس وجود کا تعلق ہوتا ہے وہ وجود الہی فلفہ ہے اور وجود واقعی ہے۔ لیکن جن چیزوں کا وجود اعتباری ہے وہ چونکہ نظام ہستی میں مستقر نہیں ہیں اور واقعی و حقیقی نہیں ہیں اس لئے ان کے بارے میں یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ: خدا نے وجود دئے اضافی و اعتباری کو کیوں پیدا کیا؟ کیونکہ امور اعتباری و انتزاعی اپنے ملزومات سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ اور ان کا شمار امور حقیقی کے لوازم و تعری میں ہوتا ہے اور خود یہ امور وجود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اس لئے ان کی خلقت کے بارے میں بحث بھی نہیں کی جاسکتی۔

موجود واقعی کو خدا ایجاد کرتا ہے اور موجود واقعی اور اس کے صفات بھی حقیقی ہیں کیونکہ ان کا وجود خارج میں بھی ہے۔ ذہنی وجود سے قطع نظر کر کے۔ لیکن صفت نسبی و اضافی چونکہ ہمارے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے اس کے ذہن کے علاوہ خارج میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ لہذا اس کے بارے میں یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا خالق کون ہے؟ کائنات کا مطلب ان چیزوں کے علاوہ جن کا وجود امکان پذیر ہے۔ تمام وہ چیزیں ہیں

جو اپنے اوصاف و لوازم غیر تفکیک کے ساتھ ہیں، جو بذات خود ایک ایسا واحد ہے جو تجزئہ پذیر ہے۔ اور جو چیز حکمت الہی کے متعقبات کے مطابق ہے۔ وہ یہ ہے کہ یا تو کائنات کا وجود ایک شخص نظام کے تحت ہو یا پھر اصلاً موجود ہی نہ ہو۔

وہ کائنات جو بے نظام ہو یا اس میں اصول علت و معلول مفقود ہوں یا اس میں خیرات کی ضرورت برائیوں سے جدا کی ہو۔ ایسی کائنات غیر ممکن ہے اور یہ صرف خیال محال ہے۔ کیونکہ یہ بات محل بحث سے خارج ہے کہ نظام کے ایک جزو سے بحث و کلام متعلق ہو اور دوسرے جزو سے نہ ہو! مجموعہ آفرینش اسی طرح ایک ہے جس طرح ایک انسان کا پیکر اور اس کے اجزاء ایک حکم میں ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے قابل انفکاک نہیں ہوتے۔

پروردگار غنی علی الاطلاق ہے جس کا لازمہ ایجاد اور مخلوق پر فیضان کرنا ہے جیسے کہ ایک بچی بخشش کرتا رہتا ہے جس کے بدلہ میں کوئی جزا یا شکر یہ بھی نہیں چاہتا۔ یا جیسے ایک ماہر فن کار ہوتا ہے جو ہمیشہ کسی توقع کے بغیر اپنے فن پارہ کی تخلیق میں مشغول رہتا ہے۔ لہذا خلق و ایجاد پروردگار عالم کے اوصاف ذاتی میں ہیں۔

نابرابری

فرض کیجئے ایک کارخانہ کے مالک نے کارخانہ چلانے اور اس سے کسب معاش کے لئے کچھ توہمیر
— مزدور — اور کچھ ماہرین ملائے رکھے۔ اور جب تنخواہ دینے کا وقت آیا تو اس نے بیسروں کو تو
کم تنخواہ دی اور جو فن کار اور ماہر تھے ان کو زیادہ دی تو یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے: کیا کارخانہ کے
مالک نے اس طرح تنخواہ تقسیم کرنے کے مزدوروں پر ظلم کیا یا نہیں؟ ظاہر سی بات ہے اس قسم کا تفرقہ
کرنا فیئر و جسط ہے۔ یہاں پر عدالت کا مقصد مرکز یہ نہیں ہے کہ ماہرین اور مزدوروں کو برابر
برابر تنخواہ دی جائے۔ بلکہ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو اس کے استحقاق کے لحاظ سے تنخواہ
دی جائے۔ اور اسی طریقہ کار سے کارخانہ ترقی کر سکے، ورنہ ترقی کرنا ممکن نہیں ہے! اور
اسی قسم کے مواقع پر تفریق عین عدالت ہے اور مساوات ظلم ہے۔

اسی طرح اگر ہم کائنات کو منطوقی مطالعہ کریں اور اس کے تمام اطراف و جوانب کو بدقت نظر
مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ اس کے ہر جز کی ایک خاص و وسیع ہے اور خاص مقام ہے
اور پھر تحقیق عین کے بعد ہم خود ہی احساس کریں گے کہ اس کائنات رنگ و بو میں نور کے ساتھ
تاریکی، ظفر و کامیابی کے ساتھ ناکامیابی توازن عام کے لئے ضروری ہے۔ اور جب تک یہ صورت
نہیں ہوگی نظام عام کا تحقق نہیں ہو سکتا۔

اگر کہیں ایسا ہوتا کہ جہاں تفاوت و اختلاف سے خالی ہوتا تو اس میں تنوع اور
کثرت موجودات کا اثر بھی نہ ہوتا۔ حالانکہ عالم کی عظمت اسی اختلاف اور تنوع ہی کے اندر
ہے۔ جب تک ہم توازن مجموعہ اور اس کے متقابل رابطہ کو جو تکامل بخش اور منفعت خیز ہے
اپنی نظریں نہ رکھیں اس وقت تک ہمارا فیصلہ صحیح و منطقی اور موجب و قابل قبول نہ ہوگا۔ صرف

ایک پیکر کے ایک جزئی کو جو ایک مجموعے سے جدا ہوا ہو دیکھ کر صحیح فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔
 نظام آفرینش توازن اور استحقاق و قابلیت کی بنیاد پر رد کھا گیا ہے اور اس نظام ہستی
 میں جو چیز متعین و ثابت ہے وہ تفاوت ہے نہ تبیین۔ اور اس ترتیب سے مسئلہ یعنی تراویح شخصی
 تر ہو جائیگا کیونکہ تبیین کا مطلب "مساوی استحقاق اور یکساں شرائط کے مواقع پر فرق کیا جائے"
 اور تفاوت کا مطلب غیر مساوی اور غیر یکساں شرائط میں فرق قرار دینا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط و فاسد ہے کہ کہا جائے: اگر دنیا میں تمام چیزیں یکساں ہوتیں اور ہر قسم
 کے اختلاف و تفاوت سے دور ہوتیں تو بہت اچھا تھا؛ کیونکہ حرکت، تکامل، جوش، اخلاقی
 عطا، گرفت وغیرہ سب سب تفاوت ہی کے زیر سایہ متجلی ہوا کرتی ہیں۔

ہم جس قدر حسن و جمال کا ادراک کر رہے ہیں۔ یہ ناممکن ہو جاتا اگر اس کے مقابل میں قبح و بد
 صورتی نہ ہوتی۔ اسی طرح اگر زندگی میں فحش، بدکاری وغیرہ نہ ہوتی تو فضیلت و تقویٰ کی
 اہمیت نہ ہوتی۔ اور ضبط نفس و تہذیب نفس لفظ بے معنی بن کر رہ جاتے۔ اسی طرح اگر فنکار
 صرف ایک ہی رنگ اپنے فن پاروں میں دیتا تو پھر اسکی تقدیر و قیمت نہ ہوتی۔ فنکار کی مہارت
 کا اظہار ہی لون و رنگ کے تنوع پر ہوا کرتا ہے۔

کسی بھی چیز کے تشخیص کے لئے اس کا دوسری چیزوں سے مختلف ہونا ضروری ہے۔
 کیونکہ اشیاء اور خود انسانوں کی معرفت ظاہری یا باطنی اختلاف ہی کی بنا پر ہوا کرتی ہے۔

خلقت کے دلچسپ ترین باتوں میں مواہب زندگی اور استعداد میں اختلاف کا پایا
 جاتا ہے۔ نظام خلقت نے معاشرہ کے افراد کو ایک مخصوص ذوق دیا ہے جو حیات اجتماعی
 کے استمرار کے لئے مناسب ہے۔ معاشرہ کی ہر فرد ایک ایک حاجت کو پوری کرتی ہے اور ایک ایک
 مشکل کا حل نکالتی ہے۔

افراد طاقتوں میں فطری تفاوت سب کو سب کا محتاج بنا دیتا ہے۔ اور ہر شخص اپنی

استعداد اور اپنے ذوق کے مطابق معاشرہ کے کاموں میں مصروف ہے۔ اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ انسان کی ترقی اور اس کا تکامل صرف اجتماعی زندگی کے سایہ ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔ بطور مثال ہوائی جہاز کو لے لیجئے جس میں پیچیدہ آلات بکثرت ہیں اور بڑی باریک بینی سے اس کو ایجاد کیا گیا ہے اس ہوائی جہاز کے اجزا یا ہم حجم و شکل کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور یہ اختلاف اس ہوائی جہاز کے اجزا کے سپرد مختلف اعمال کی وجہ سے ہے اگر ہوائی جہاز کے آلات و اجزاء میں یہ اختلاف نہ ہو تو وہ اڑ ہی نہیں سکتا اور پھر یہ ہوائی جہاز نہ ہوتا بلکہ مختلف باتوں کا بنا ہوا ایک ڈھانچہ ہوتا اور بس۔

پس اگر ہوائی جہاز کے اندر اختلاف عدل ہے ظلم نہیں ہے تو اس دنیا کے موجودات میں اختلاف خواہ انسان ہو یا کچھ اور وہ بھی عدل باری کے مطابق ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیجئے کہ نظام وجود کے موجودات میں جو تفاوت ہے وہ ان کا ذاتی ہے۔ کیونکہ خدا ہر شے کو الگ الگ مستقل و منفرد ارادہ سے نہیں خلق کرتا بلکہ پورا عالم ازل سے سیکر ایڈ تک۔ ایک ارادہ سے پیدا کیا گیا ہے۔ پس جب خدا نے موجودات پر فیضان وجود کیا تو اسی فیضان نے غیر متناہی اشیاء کو ایک ارادہ سے عرصہ کائنات میں ظاہر کر دیا۔ اس نظریہ کی بنیاد پر موجودات کی آفرینش کے لئے ایک شعبی نظام و قانون ہے جو موجودات کے تمام ابعاد و وجود پر سایہ نکلن ہے اور کارگاہ نظام علت و معلول میں ہر چیز کا ایک مقام اور عین جگہ ہے۔ آفرینش اشیاء اور تدبیر جہاں کے سلسلہ میں ارادہ الہی عین ارادہ نظام سے اعتسافی طورہ قاطع اس نظریہ کو ثابت کرتے ہیں۔ اور قرآن مجید بھی اس واقعیت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ وَهَذَا أَمْرُنَا الْوَاحِدُ كُلِّجُ بِالْبَصْرِ (الفرقان)

بیشک ہم نے ہر چیز کا ایک مقرر انداز سے پیدا کیا ہے اور ہمارا حکم تو بس آئنگے کے چمکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے۔

دستگاہ الہی کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ یہ معاشرہ کے دستگاہ و روابط قرار داد کے

ماند ہے بالکل غلط تصور ہے۔ کیونکہ موجودات کا علاقہ اپنے خالق سے حادث و وضعی علاقہ نہیں ہے بلکہ یہ ایجاد و خلق کرنا علاقہ ہے اور تخلیق کے سلسلہ میں امر الہی امر تکوینی حقیقی ہے اور ہر موجود حقیقی ذیہائی و کمال کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خدا کی طرف سے اتنا عطا ہوتا ہے۔

اگر موجودات عالم کے لئے کوئی معین نظام نہ ہوتا تو ہر موجود کے امکان میں یہ بات تھی کہ اس سے ہر شئی صادر ہو۔ اور معلول علت کی جگہ لے لیتی۔ لیکن ہم کو بطور حتم و جزم موجودات کے درمیان روابط ذاتی کا ادراک کرنا چاہئے اور یہ ادراک کرنا چاہئے کہ اس کے لوازم ذاتی وجود کے کس رتبہ میں ہیں۔ اور کس خصوصیت پر تھے۔ کسی بھی حادث کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے مخصوص رتبہ سے تجاوز کر جائے اور دوسرے موجود کے رتبہ میں مشغول ہو جائے۔ اور لغات و اختلاف مراتب ہستی کا لازمہ ہے جو ان کے درمیان شدت و ضعف، نقص و کمال کے لحاظ سے حکم فرما ہے۔

خلاف حق تمیزان دو چیزوں میں تحقق پذیر ہو سکتی ہے جبکہ دونوں میں ایک مخصوص درجہ کمال کے قبول کرنے کی صلاحیت ہو مگر اضافہ کمال ایک پر ہوا اور ایک پر نہ ہو۔

نظام ہستی میں مراتب موجودات کو انسانی معاشرہ میں مراتب اعتباری سے تشبیہ دینا بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ مراتب موجودات امور واقعہ ہیں جو قابل انتقال نہیں ہیں مثلاً ملین کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے وجود کو انسان کے رتبہ میں کرے جس طرح ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم اشخاص کو ان کے مقامات و مناصب منتقل کر کے دوسرے مراتب و مقامات پر منتقل کر دیں۔

اور اسکی وجہ یہ ہے کہ علت کا تعلق جو معلول سے ہوتا ہے یا معلول کا علت ہے وہ ذات علت و معلول سے پیدا ہوتا ہے اب اگر کوئی شئی علت ہے تو کسی ایسی خصوصیت کی بنا پر ہوگی جو اس ذات سے منفک ہی نہ ہو سکتی ہو۔ اور معلول بھی کسی خاص وجہ سے

معلوم ہوتا ہے جو اسکی ذات میں پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ خصوصیت مولیٰ اسی کیفیت و جوہر کے اور کچھ نہیں ہے۔

اس بنا پر تمام موجودات ہستی کے اندر ایک عقیقہ و ذاتی نظام موجود ہے اور ہر مرتبہ وجود یہ اس موجود کا عین ہے اور جب تک تفاوت و اختلاف قصور ذاتی تک محدود ہو کر جو بعض نہیں کہتے۔ کیونکہ کسی بھی امر کے تحقق کے لئے صرف فیض خدا کا فی نہیں ہو کر تا بلکہ اسکی ایک بنیادی شرط متعلق میں قابلیت کا ہونا بھی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض موجودات جس مرتبہ پر ہیں اس سے بلند تر درجہ تک نہیں پہنچ سکے۔ لیکن یہ بات بہر حال محال ہے کہ کوئی موجود قابلیت یا دوسرے کمال کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن خدا اس کمال یا وجود کو روک دے۔

اس کی مثال اعداد و جیسی ہے کہ ہر عدد مخصوص جگہ رکھتا ہے۔ دو کا وجود ہمیشہ ایک کے بعد ہی ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ اسکی جگہ بدل دی جائے اور دو کو ایک کے پہلے قرار دیا جائے۔ اور اگر ہم ایک عدد کی جگہ دوسرے کے بعد بدلنا چاہیں تو درحقیقت وہ عدد معدوم ہو جائیگا۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ تمام حوادث کے لئے عین اسلوب ہیں اور یہ ایک ایسے قوانین کے محکوم ہیں جو ثابت ہیں اور غیر متغیر ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آفرینش کے لئے خدا نے کوئی مخصوص قوانین وضع کر دیے ہیں بلکہ یہ وہی قوانین ہیں جو ہمارے ذہنوں میں مفہوم ہیں اور جو موجودات کے کیفیت و واقعی سے منترع ہوتے ہیں کیفیت واقعی سے مراد وجود کے مراتب و درجات اور نظام علت و معلول ہے اور وہ شئی مراد ہے کہ اور اس نظام کے باہر نہیں جریاں پیدا کر سکتے اور یہی سنت اللہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے:-

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلنَّاسِ عَلَى النَّاسِ مَقَرًّا يَحْبُوبًا (فاطر/۴۲)

پس نتیجہ یہ ہوا کہ قوانین ذاتیہ کا ایک سلسلہ ہے جس پر نظام ہستی کی بنیاد رکھی گئی ہے جس میں ہر موجود کی جگہ اور موقعیت مشخص ہے اور ہستی کے لئے وجود و درجات و مراتب گوناگون و نظام وجود کے بقا کے لوازم میں سے ہے۔ اور یہ قہری طور پر موجودات کے

درمیان تفاوت و اختلاف کے ظہور کا موجب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اختلاف و تفاوت بذاتہ مخلوق نہیں ہیں بلکہ حادثات کے لوازم میں سے ہیں۔ اور اس دنیا کے ہر جز نے جس جگہ کے تعلق تھا وہ اس نے لے لیا اور اس مجبور وجودیہ کے کمال کے لئے جو ایک جدول ضرب کی طرح ہے بعض اجزاء کے ساتھ بے عدالتی و تبعیض روا نہیں رکھی گئی۔

یہ شخص مادی عقل رکھتا ہے اور نظام طبعیت میں اختلاف و تفاوت کو ستم و بے عدالتی خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ پوری کائنات پر عدالت کی حکمرانی نہیں ہے۔ اس کے لئے زندگی بڑی تلخ و ناگوار ہے اور اس کا یہ جلد بازی کا فیصلہ اس بچہ کے فیصلہ کی طرح ہے جو موسم بہار میں باغبان کو ہرے بھرے درختوں کی شاخوں کو کاٹتے ہوئے دیکھ کر فوراً فیصلہ کر دیتا ہے کہ یہ باغبان نادان و دیران گر ہے کیونکہ اس کی نظر میں اس کی حکمت نہیں ہے۔

اگر ایسے شخص کے اختیار میں تمام خواہب دینا دیئے جائیں جب بھی یہ راضی نہیں ہوگا کیونکہ اس کی نظر میں دنیا بے مقصد ہے اور آفرینش کی بنیاد سنگمری پر رکھی گئی ہے پھر ان کی خواہش عدالت پر جو بے معنی ہے کیونکہ ایک ایسی دنیا میں جو بے مقصد ہو کوئی حدف رکھنا یہودہ می بات ہے اگر بقول مادیوں کے انسان کی بازگشت مثل گھاس بھوس کے ہے جو خود بخود کائنات میں اگتی ہے اور پھر فنا ہو جاتی ہے تو ان سے زیادہ ذلیل کوئی مخلوق نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسے عالم میں رہ رہے جو ان کے مناسب ہے نہ موافق بلکہ قوت فکر و احساس اس کے لئے پریشان کن ہے ابتدا ہے اور اس کے ساتھ یہ فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ بد نہختی درج اس کے لئے اضافہ کرتے ہیں اور باعث زیادتی عذاب بھی ہے۔

اگر ان بڑی محنت و محنت سے بشریت کی کوئی خدمت انجام دے اور بڑی مخفیانہ خدمت نوع انسانی کے لئے کرے تو اس کو کیا فائدہ؟ کیونکہ اس کی یاد چاہے جتنی احترام و تقدیر سے منائی جائے یا اس کی قبر پر کوئی یادگار بنا دی جائے یا اس کے نام پر کچھ مہتمم لوگ جائیں تو اس کو تو ذرہ برابر بھی فائدہ نہ ملے گا اور ایک پوچھ و پچر افسانہ سے زیادہ اس کی خدمت

نہ ہوگی کیونکہ۔ مادی حضرات کی نظر میں۔ فطرت نے ایک پیکر بنایا تھا۔ چند دنوں اس سے یازنی کی اور اس کو نچاتی رہی اور پھر دوبارہ اس کو ایک نشت خاک بنادیا۔

اگر ہم بیشتر ایسے لوگوں کے انجام پر غور کریں جنہوں نے بڑے بڑے رنج و غم برداشت کئے ہیں پریشانیوں اور دردانہ فیسی سے دوچار ہوئے ہیں تو پھر ہمارے سامنے ایک بڑا دردناک اور تکلیف دہ منظر ہوگا۔

انسانوں کا یہ حشر دیکھ کر کیا مادیوں کی جنت عذابِ معمم کے علاوہ اور کچھ ہوگی؟ اور انسانیت کی بدنامی اس وقت اوج کمال پر پہنچ جاتی ہے جب ہم مادیوں کا یہ نظریہ پڑھتے ہیں کہ انسان تو مجبوراً محض ہے اس کے پاس نہ ارادہ ہے نہ اختیار۔ اس نظریہ کی بنا پر انسان ایک آئوٹینکشن کی طرح ہے، فطرت از روی میکائیزم و ڈائنامیزم اس کے خدایا میں بھی عمل کرتی ہے۔ اب بتائیے کیا عقل و فطرت اور حقائقِ حیات انسانیت اور اس کے انجام کی یہ تفسیر قبول کریں گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔

اور اگر قبول کریں تو پھر انسان اس گڑباز سے زیادہ نیک نخت نہیں ہے جو بچوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ آیا انسان کے لئے یہ بہتر نہ ہوگا کہ انسانی و اخلاقی اصول اور ملاء ارزش کو صرف شخصی سود و زیاں اور اپنے جنسی رجحانات سے توجیہ نہ کرے؟ اور امکانی حد تک ہر گاہ کو دور کرے اور پائے ہوس سے ہرز بچکر کو توڑ کر الگ نہ کر دے؟۔ یقیناً مادی نظریہ سے تو یہ بہتری ہوگا۔ اور اگر اس کے علاوہ عقل کرے تو بے عقل و نادان و پسماندہ نہیں ہے؟ بھلا جو شخص بھی بصیرت و نیش صمیم کا دارا ہوگا اور غیر طرفدار ہوکر، اغراض و بہت سے ہٹ کر دقت نظر کے ساتھ فیصلہ کے لئے بیٹھے گا وہ اس قسم کی کوتاہ نظری و تحلیل چاہے وہ کتنا ہی سلفطہ آمیز فلسفی و علمی دلائل سے آراستہ ہو۔ کی ارزش و اعتبار کا قائل ہوگا؟

نہ طرز ساختہ چیز سے ترکیب چیز سے۔
نہ وہ آئین جو فنا مرادی میں فقط تاش بقوہ ہیں۔

لیکن مذہبی اعتبار سے شخص مومن عالم کو ایک نظام خود آگاہ و دارای ارادہ و احساس و با مقصد سمجھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ وہی حکمتِ غلیظہ اور عادلہ تمام ذرات وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کے اعمال و افعال کی بھی ناظر ہے۔ لہذا وہ سمجھتا ہے کہ اسی حکیم حاکم کے سامنے جو پولیسی کا ثبات پر محیط ہے ہم کو جو ابدہ ہوتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے۔ جہاں انہما، جہاں وحدت و ہم آہنگی وغیرہ ہے اور تضاد و شرکاء وجود ضمنی و تبعی ہے۔

اور دوسری طرف مذہبی نظریہ انسانی حیات کے لئے ایک وسیع افق کا تصویر پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ حیات انسانی کا انحصار صرف دنیا ہی میں نہیں ہے اور نہ زندگی دنیا کا مطلب ہے کہ انسان عیش و آرام میں سر رہے و غم سے دور ہو کر زندگی بسر کرے۔ وہ تو یہ بتاتا ہے کہ دنیا ایک گزر گاہ ہے اور آخرت کی زندگی تک پہنچنے کا ایک پل ہے۔ یہ دنیا تو امتحان، سعی و مسکن عملِ جہیم کا ایک میدان ہے جس میں ایمان کی درستگی اور کردار کی نستگی کی آزمائش ہوتی ہے لیکن آخرت کی ابتدائی زندگی ہی میں دقیق ترین میزان موجود ہے جس پر انسان کے افکار و اعمال کی اچھائی و برائی تولی جاتی ہے۔ اور وہ بلاں پر عدالت الہی کی حقیقی صورت منجلی ہوتی ہے اور دنیا میں مادی و معنوی ثقب ماندگی اور ہر قسم کی محرومیت کا بہترین طریقہ سے جبران کیا جاتا ہے۔

متاع مادی و دنیوی کی ماہیت کی یہ بد صورتی اور ابتذال دیکھ کر انسان کی آگاہانہ حرکت صرف خدا کی طرف ہوتی ہے۔ اور پھر اس کا پورا وجود و مقصد خدا کے لئے زندہ رہنا اور اسی مژدہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر تو اس کے بعد دنیا کی پستی و بلندی کی اسکی نظریں کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ تمام امور کو واقعت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اور کسی بھی جمال سے دلچسپی نہیں پیدا ہوتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر اس جمال کے سامنے ننگوں ہو گیا تو یہ جمال اس کے مقابلہ انست کے سوتوں کو خشک کر دے گا اور اس کو حقیقت گمراہی کے کنویں میں ڈھکیل دے گا۔

ایک دوسری بات بھی سمجھ لیجئے کہ اگر مسند استغاثہ معطر ہے نہیں ہے تو تفاوت و اختلاف

کی وجہ سے کوئی ظلم متحقق نہیں ہوگا۔ کیونکہ ظلم کا تحقق اس صورت میں ہوا کرتا ہے جب کسی کے لئے تبعیض ہو رہی ہو حالانکہ وہ استحقاق میں برابر ہے۔ لیکن موجودات عالم کبھی بھی خدا پر کوئی حق نہیں رکھتے اور نہ کسی دن کسی چیز کے مستحق تھے اگر ایسا ہوتا تو بعض کو بعض پر برتری دینے میں ظلم ہوتا۔

ہم تو اپنے نفس کے کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں، ہماری سانس کی آمد و رفت، دل کی دھڑکنیں، غور و فکر ایک ایسے سرمایے سے حاصل ہوتے ہیں جس کے ہم مالک نہیں ہیں اور اس کے ہمارے میں کوئی ذمہ داری نہیں کی ہے اور وہ سرمایہ پروردگار عالم کا وہ ہدیہ ہے جو اس نے ابتداً ولادت سے ہم کو بخشا ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہمارے پاس جو بھی ہے وہ سب عطیہ الہی ہے تو ایسے مقام پر تفاوت جو پابیکمت پر ہے نہ ظلم ہے نہ عدل ہے کیونکہ اس کے پہلے کوئی استحقاق ہی نہیں تھا۔ یہ محدود و موقت زندگی خدا کی طرف سے ایک عطیہ ہے وہ اس ہدیہ کے میزان اور نوز کو معین کرنے میں کاملاً اختیار رکھتا ہے اور آزاد ہے۔ ہمارا اس پر کوئی حق نہیں ہے لہذا ہم کو حق اعتراض بھی نہیں ہے چاہے وہ مفت دیا ہوا عطیہ کتنا ہی تھوڑا اور مختصر ہو۔

اے اس کی تفصیل باقی کے صفحے میں بیان کی جا چکی ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

مسئله جبر و اختیار

اصل موضوع پر ایک نظر

مسئلہ جبر و اختیار ان مسائل میں سے ہے جس نے طبیعت و دشمن انسان سے سروکار رکھنے والے مفکرین کی نظر کو اپنی طرف ہمیشہ متوجہ کیا ہے۔ اور یہ مختلف عقائد و نظریات کے مابین ایک معرکہ الارادہ مسئلہ ہمیشہ سے بنا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ: کیا انسان اپنے امور حیات، اور دنیا و دعوٰی میں، اختیار، مقاصد و اہداف میں اپنے مسمعی اور اعمال میں آزاد و خود مختار ہے اس کے شخصی ارادہ کے علاوہ ان چیزوں میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے؟ یا انسان اپنے سلوک و عمل میں مجبور ہے اور کسی بھی عمل کے کرنے اور عدم حکم میں وہ مثل آلہ کے دوسرے عوامل کا محتاج ہے، اور اس کو اس پر عوامل دیگر نے مجبور کر دیا ہے؟

اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ علوم اقتصادی، حقوقی، مذہبی، روحانی اور دیگر وہ تمام علوم جو موضوع انسان سے مربوط ہیں۔ ان سے جتنا فائدہ اٹھایا جائیگا اس معرکہ کے چہرے سے نقاب اتنی ہی اٹھتی چلی جائے گی۔

مسئلہ حریت و اختیار کو موضوع بحث بنانا محض علمی و فلسفی مباحث میں منحصر نہیں۔ بلکہ عملاً یہ مسئلہ ان لوگوں سے بھی متعلق ہے جو انسانی وظیفہ کو بیان کرتے ہیں اور انسان کے اسی بات کا مسئلہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس وظیفہ کا اجراء کریں، اور لوگوں کو عمل کی دقت دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر حریت و آزادی کے ضمنی طور پر بھی معتقد نہ ہوں گے تو ثواب و عقاب کا مسئلہ بے معنی ہو جائے گا۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کے نزدیک اس مسئلہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ کیونکہ اسلامی فکر کا بھی تغاضب ہی تھا کہ اس مسئلہ میں بہت ہی وقت نظر سے کام لیا جائے۔

اور توحید کے بعد علماء نے اسی مسئلہ کو مورد توجہ قرار دیا۔ اس کی بنیادی باتوں، گہرے مسائل، مبہم و تاریک نقاط کو روشن کیا۔ کیونکہ یہ مسئلہ جہاں ایک طرف توحید سے مرتبط ہے وہاں دوسری طرف عبادت اور قدرت الہی سے بھی اس کا رابطہ ہے۔

متکلمین کے — خواہ ماضی کے ہوں یا دور حاضر کے — اس مسئلہ میں دو گروہ ہیں :-

۱۔ ایک گروہ ان کی اعمال کے اندر آزادی کو بالکل تسلیم نہیں کرتا۔ اور اس کا کہنا ہے کہ جو اعمال و مساعی نظر ہمارے ارادہ و اختیار کے تحت نظر آتے ہیں اس میں انسان کے ادراک کا نقص اور اس کے سمجھ کی کوتاہی ہے۔

۲۔ دوسرا گروہ کہتا ہے: انسان یا اختیار ہے اس گروہ کا کہنا ہے کہ ان اپنے امور و اعمال میں حریت کاملہ رکھتا ہے اور اس کے ارادہ کی شعاع بہت وسیع ہے نہ اس کا کوئی مانع ہے نہ رادع۔

ایک طرف انسان خود اپنے وجود میں اپنی پیدائش سے پہلے ان عوامل کے پیش نظر جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں جبر کو محسوس کرتا ہے۔ اور اسی طرح جب وہ بعض حوادث حیات سے دوچار ہوتا ہے تب بھی جبر کو محسوس کرتا ہے۔ بلکہ انسان یہاں تک سوچنے لگتا ہے کہ اس کو تو کسی بھی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ کسی قسم کی آزادی حاصل ہے۔ کیونکہ وہ اس زندگی میں جب داخل ہوتا ہے تو اس میں اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور وہ اس دنیا میں اگر ایک جبری نظام کے ماتحت ہوتا ہے۔ بلکہ وہ دنیا میں ایک ایسے کاغذ کے ورق کی طرح ہوتا ہے جو ہوا کے رحم و کرم پر ہو۔ اور پھر اس دنیا سے رخصت ہونے میں بھی جبر محسوس کرتا ہے۔

اور دوسری طرف یہی انسان بہت سے امور میں اپنی حریت و استقلال کو محسوس کرتا ہے۔ جہاں نہ کوئی جبر ہوتا ہے نہ اکراہ — وہ مشکلات اور موانع کا مقابلہ کرتا ہے۔

اپنے سابق تجربات کی روشنی میں اپنے تسلط کو فطرت پر وسیع کر سکتا ہے۔ کسی بھی مسئلہ کا آدمی اس واقعیت عملی و عینی کا انکار نہیں کر سکتا کہ ہاتھوں اور پاؤں کی حرکت انسان کے اپنے ارادہ کے تابع ہے مگر دل کی دھڑکن اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اسی طرح جگر و پیچڑ کے عمل میں تفاوت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

پس انسان اپنے ارادہ و اختیار اور اس کے نفوذ میں — جو رمز انسانیت بھی ہے اور اس میں مسکویت بھی — یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے کچھ اعمال و افعال میں آزاد و خود مختار ہے اور اپنے ارادہ و اختیار کے استعمال میں دور دور تک جبر محسوس نہیں کرتا۔ اور یہی انسان بعض دوسرے مادی اور غریزی امور میں اپنے کو دست بستہ اور مجبور پاتا ہے اور اس کی زندگی میں اس قسم کے مسائل کی کمی نہیں ہے۔

جبر کے قائل حضرات

جبری لوگ انسان کو اپنے اعمال میں مجبور محض سمجھتے ہیں۔ اشعری حضرات — وہ مسلمان جو ابوالحسن اشعری کی رائے کے پابند ہیں — اسی قول کو تسلیم کرتے ہیں تمام آیات و احادیث میں غور و فکر کئے بغیر بعض آیات کے ظاہری معنی کو اپنا مددک و مستند قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ اشیاء کی تاثیر کا انکار کرتے ہیں اور کائنات رنگ و بو میں کسی علت و سبب کے قائل نہیں ہیں ان کے عقیدہ میں تمام حوادث ڈائریکٹ بغیر کسی واسطہ کے خدا کے معلول ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ انسان کے پاس اگرچہ قدرت و ارادہ دونوں ہیں۔ مگر انسانی افعال میں ان دونوں کا کوئی اثر یا دخل نہیں ہے۔ کیونکہ ارادہ و قدرت معلول عمل کی علت نہیں ہیں بلکہ موثر و حقیقت ارادہ الہی ہے۔ انسان تو اس عمل کو اپنے قصد و ارادہ سے ایک رنگ دے سکتا ہے اور پس۔ اور یہی ارادہ اس عمل کو یا تو عمل صالح یا عمل غیر صالح کی فہرست میں درج کرتا ہے۔ اس بنا پر انسان صرف ایک آلہ و تمجید ہے جس کو قدرت جس طرح چاہتی ہے استعمال کرتی ہے۔

یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم انسان کو صاحب قدرت و اختیار مان لیں تو خدا کی حکومت و قدرت کا دائرہ محدود و فنانا پڑے گا۔ حالانکہ خدا کی خالقیت مطلقہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم اس کے مقابلہ میں کسی بھی فرد انسان کے لئے قدرت کے قائل نہ ہو خدا کی حاکمیت مطلقہ اور توحید کا تقاضا یہی ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ تمام حوادث وجود بیان تک کہ خود انسان کے اعمال خدا کی مرضی کے بغیر موجود ہو ہی نہیں سکتے۔ اور اگر ہم یہ قائل ہو جائیں کہ انسان اپنے اعمال کا خالق ہے تو گویا ہم نے تمام عالم وجود پر خدا کی حاکمیت مطلقہ

کا انکار کر دیا۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ حریت ارادہ کا عقیدہ مشرک بالحد تک منجر ہوتا ہے۔
یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام حوادث عالم کا ظہور عقل متقدمہ کی بنا پر ہوتا ہے اور یہ مسلسل عقلیں
ایک اصلی اور انتہائی علت تک پہنچتی ہیں اور وہ علت اصلی خدا ہے۔

اور انسان جو اپنے کو بظاہر حر اور آزاد سمجھتا ہے اس کی حیثیت ایک بے ارادہ آلہ سے
زیادہ نہیں ہے۔ اور عقل و غرائز و عواطف و احساسات سے سیکر غیر مرئی امواج اور کیمیاوی
عناصر کے تاثرات، اور پانی، ہوا، خاک کا اثر، معاشرہ، تربیت، وراثت کے عوامل اور ان کے
معاہدہ دوست و عداوت پر سب کے سب انسان کے حدود اختیار سے خارج ہیں۔ اور درحقیقت انسان
بیرونی اور اندرونی عوامل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے جن سے اس کو آزادی ملنی ناممکن ہے۔

کچھ لوگوں نے — دائرہ پائیدار — دین و اخلاق کے خلاف اعمال بجالانے کی وجہ
سے عذر تراشی اور اپنی برادرت کے لئے مسئلہ جبر کو قبول کر کے عقیدہ و عمل میں انحراف کئے
ایک راہ تلاش کی ہے اور اپنے فساد و تباہ کاریوں کے لئے اس مسئلہ کو بطور دستاویز استعمال
کیا ہے۔ کچھ ایسے شعراء بھی گزرے ہیں کہ عقیدہ جبر کو قبول کر کے اپنے گناہوں کے لئے جواز
مہیا کر لیا ہے۔ اور بزرگ خود وجدانی فشار اور بدنامی سے بچ گئے ہیں۔

جبر یوں کا یہ طرز فکر عدالت الہی اور عدالت اجتماعی دونوں کے خلاف ہے۔ جبکہ ہم
عدل الہی کو اپنے تمام ابعاد کے ساتھ نظام وجود میں وسیع صورت میں موجود پاتے ہیں
اور خدا کی اسی صفت سے توصیف کرتے ہیں چنانچہ قرآن کہتا ہے :-

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ذَا الْوَلَدِ الْأَعْلَمُ نَزَّاهٌ
بِالْقُبُطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (آل عمران ۱۷)

خدا نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور تمام
فرشتوں نے اور معابد علم و انبیاء و ائمہ جو عدل پر قائم ہیں دیہی شہادت دی ہے

کہ اس زبردست حکمت و اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی (ہر چیز پر)

غالب اور دانا ہے۔

اسی طرح خدا نے استقرارِ عدل کو ان فی معاشرہ میں بختِ رسل اور رسالِ کتب کی غایت قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (احمدیہ / ۱۶۴)

ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح اور روشن معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور (انصاف کی) ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اسی طرح قیامت کے دن خدا اپنے بندوں کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

وَنُفِخُ الصُّورَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَلَا تُفْلِحُ كَفْسٌ مِّمَّنْ دُرِّسَتْ (سجہ)

اور قیامت کے دن تو ہم (بندوں کے بچے برے اعمال تو ملنے کے لئے) انصاف کی ترازوئیں کھڑی کر دیں گے۔ اور پھر تو کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

ذرا سوچئے تو کیا یہ انصاف ہے کہ ہم کسی شخص کو جرم پر مجبور کر کے سزا دیں؟ یقیناً ایسا کرنا صریح ظلم ہے اور اصولِ عدالت سے بعید ہے اور اگر ہم اصل آئندگی کا انکار کر دیں اور کسی بھی مثبت نقش کو انسانی ارادہ کے لئے ثابت نہ مانیں تو ان اور دیگر موجودات میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہے گا۔ جس طرح دیگر موجودات کی دائمی حرکتیں ایک غیر اختیاری سلسلہٴ معلول کی معلول ہیں۔ عقیدہ جبر کی بنا پر ہمارے اعمال و حرکات بھی اسی عنوان کے موجد بنائیں گے۔

اور اگر خدا ہی انسان کے اختیاری اعمال کا خالق ہے اور وہی ان کے اندر ظلم و فساد بھی خلق کرتا ہے یہاں تک کہ اپنے ساتھ شرک بھی وہی کرتا ہے تو پھر اس ذاتِ مقدسہ

کی منتز یہ کیونکر کریں گے ؟

جسکہ قول ماننے سے نبوت، وحی، الحام، ادا امر، نواہی، احکام شرعیہ، بیانات عقائدیہ، ثواب، عقاب کا لغو ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ جب ہم یہ مانیں گے کہ لوگوں کے افعال ان کے ارادوں کے بغیر آٹومٹک طریقے سے ہو جاتے ہیں تو پھر انبیاء و مرسلین کو جو عقول بشر کی مدد کے لئے بھیجا گیا ہے وہ کیا ہے ؟ — جیسا کہ حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ انبیاء و رسل کی بعثت عقول بشر کی مدد کے لئے کی گئی ہے۔

اور جب تک ایف شرعیہ اور دستور آسمانی انسان کے ارادہ و اختیار سے باہر کی چیزیں ہیں تو پھر ان کی کو مکلف بنانے کی کیا توجیہ ہوگی ؟ اور اسی طرح جب جبری کار فرما ہے تو انسان کا سلوک بلکہ اس کی روحیات جو آٹومٹک طریقے سے انسان سے سرزد ہوتی ہیں، اور معاشرہ و افراد کو فضیلت و اخلاق و غیرہ پر آمادہ کرنے کی ساری کوششیں رائیگاں ہو جائیگی تو پھر ان کوششوں اور زحماتوں سے کیا حاصل ؟ کیونکہ اس مقصد کی کوشش بے نتیجہ رہے گی اور ایک مجبور سے تربیت و تغیر کا انتظار بھی بیکار ہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اخطا و سقوط کے بارے میں خود انسان سہول ہے اور اپنے کو اور دوسروں کو نجات دلانے کا مکلف بھی ہے۔ اور اس کا اختیار ہی اس کے مفیر کو مقرر کرتا ہے اور وہ بڑی ہی دقت نظر سے اپنے طریقہ کار کا انتخاب کرتا ہے اور خدا کے لطف و کرم پر بھروسہ کرتا ہے تب خدا اپنی قدرت و نور کے ذریعہ اس کو توفیق بخشتا ہے۔

مشہور فلسفی اینٹ ہیلر — SEANER HELLER — کہتا ہے : جس ذات نے ان عوالم اور قوانین وجود کو خلق کیا ہے اس نے عظمت و حریت کے لحاظ سے قلب میسی چیز نہیں خلق کی ہے۔ یہ قلب — بہت چھوٹا ہونے کے باوجود — تمام طبیعت سے بڑا ہے بلکہ جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کر لی وہ عالم طبیعت و فطرت کے کسی بھی چیز سے اس کا قیاس نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تغایہ بہت ہی رکیک ہے۔ کیونکہ مقام معنوی کی عظمت کسی بھی

دوسری عظمت سے قابل قیاس نہیں ہے۔

عالم طبیعت کے حوادث سے زیادہ واضح اور روشن خدا کی قدرت ہمارے نفوس کے اندر ہے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں اور اندرونی سسٹم سے ایک دوسرا نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ انسان جب خود باطنی طور سے عقل کی اطاعت یا معصیت کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ اپنے اندر یہ احساس بھی پاتا ہے کہ ایک قادر مطلق کے سامنے اپنے کرداروں کی جوابدہی بھی کرنی ہے۔

انسان کے لئے یہ سزاوار ہے کہ جب وہ قانون خداوندی کی مخالفت کرے جس کی عدالت کا اعتراف بھی رکھتا ہے تو اس کے غضب کے ڈرنا ہے۔ اگر انسان خود اپنی خطا پر غضبناک ہے تو اس کو یہ بھی عقیدہ رکھنا چاہئے کہ جس نے قانون بنایا ہے وہ بھی اجتناب کے امکان کے باوجود خطا کر نیو اسے پر غضبناک ہو گا۔

جو شخص اس زندگی میں قانون اخلاق سے لذت محسوس کرتا ہو۔ اسے خود چاہئے کہ اس لذت کا حساب بیباق کر دے۔ کیونکہ معاشرہ افراد کا مجموعہ ہے اس لئے نہیں کر سکتا کہ وہ صرف ان گن ہوں پر تعاقب کرتا ہے جو معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہوں۔ اور معاشرہ کے افراد بھی گنہگار کی طرح داور ہی نہیں کر سکتے کیونکہ انسان کی نیت اور دلوں کے بھید سے نہ معاشرہ واقف ہے نہ افراد معاشرہ لیکن نیت، مقصد یا جو چیز بھی عدالت اجتماعی سے مخفی ہو وہ بہر حال مورد حکم تو ہے اس لئے فرد ہی کو چاہئے کہ میاں سب کرے۔

اب یہاں پر دو ہی صورتیں ہیں - ۱۔ قانون اخلاق کی برتری، انسان کی حریت اور مسکویت کا انکار کر دیں - ۲۔ اس زندگی کے علاوہ ایک دوسری زندگی کو مابین جہاں خدا اپنی عدالت کے مطابق لازمی طور پر فیصلہ کرے گا۔ اور اگر قانون اخلاق اس بات کو تسلیم کرے کہ عالم آخرت میں ایک آخری عدالت کا وجود بہر حال ہے تو اس نے اپنے حدود سے تجاوز نہیں کیا۔

لے مقدمہ علم الاخلاق ص ۲۰۱۹

اعترض و جواب

جبری حضرات یہ بھی کہتے ہیں: خدا ازل سے سیکر ابد تک کے سارے واقع ہونے والے واقعات و حوادث کا خواہ وہ کئی ہوں یا جزئی علم رکھتا ہے اور یہ بھی متفق عید ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی کوئی حادثہ ہو۔ خواہ وہ جزئی ہو یا کئی۔ اس کا علم خدا کو ازل ہی سے ہے۔ لہذا ان تمام سیئات اور گناہوں کا متعلقہ افراد سے معمولی تغیر کے بغیر سرزد ہونا ضروری ہے اور انسان کسی بھی طرح ان کے ترک پر قادر نہیں ہے۔ ورنہ علم خدا جہل ہو جائیگا۔ بقولے خیام گرسے مخورم علم خدا جہل شود، ترجمہ

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یقیناً درست ہے کائنات کے اندر ہونے والے تمام واقعات کا علم خدا کو پہلے سے ہے۔ لیکن اس علم کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں مجبور ہے کیونکہ علم خدا علت و معلول کے بنیادی نظام پر قائم ہے حوادث سے اس کا تعلق نہیں اور لوگوں کے اعمال سبب و مسبب دائرے سے خارج نہیں ہیں اور جو علم علت و معلول کے بیماری سے متعلق ہوتا ہے وہ جبر و اکراہ کا موجب نہیں ہو کرتا۔ لیکن جو خدا عالم میں آئندہ ہونے والے جریان سے واقف ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ افراد انسان اپنے ارادہ و اختیار سے اعمال بجا لائیں اور افراد بشر کا اپنے ارادہ و اختیار میں آزاد ہونا سلسلہ اسباب و مسببات اور علل و معلولات کا ایک جزم ہے اور خود انسان نیک و بد عمل کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے سوا اختیار کی وجہ سے فساد و گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ اب اگر کسی معاشرہ میں باطل اور ظلم کا دور دورہ ہو جائے تو یہ خود لوگوں کی وجہ سے ہوگا۔ اس میں خدا کا ارادہ دخل نہیں ہوگا اور علم الہی بندوں کے فعل خیر یا شر کے اختیار کرنے میں موثر نہیں ہوتا۔

ہاں یہ بات صحیح ہے کہ انسان کی آزادی و انتخاب میں احوال محیط، کشش ہائے فطری، اہلی بطور عوامل اہم اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے اثر انداز ہونے کا مطلب صرف ایجاد تھیل اور راہ کشی ہے۔ اور ارادہ ان کے لئے شوق انگیز ہے۔ لیکن ایجاد جبر و اکراہ نہیں کرتے اور ان امور کے وجود کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان ان امور کے چنگل میں گرفتار

ہے۔ بلکہ وہ ان تعلیمات کی پیروی یا مخالفت میں اور ان کے محدود کرنے اور تغیر میں کمال کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور خود انسان اپنی بعیرت و روشن بینی سے اس کی ہدایت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ان کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ آدمی کے طبعی جوش و شہوات سے ہونے والی جذبات کے چشموں کو نہ بالکل خشک کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کو بے مہار چھوڑا جاسکتا ہے۔

فرض کیجئے ایک ماہر ٹینک ایک کار کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ یہ فنی خرابی کی بنا پر چند کیلو میٹر چلنے کے بعد رک جائے گی۔ اور واقعاً وہ کار چند کیلو میٹر کے بعد رک جائے تو کار کے رکے کا سبب فنی نقص ہے یا مینٹنک کا علم؟ یعنی چونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ کار چند کیلو میٹر کا صلہ طے کرنے کے بعد رک جائے گی اس کے اس علم کی وجہ سے کار رک گئی۔ ظاہر ہے کہ جواب یہی ملے گا کہ فنی نقص کی وجہ سے رک گیا ہے۔ مینٹنک کا خبر دینا یا اس کا علم سابق اس کی علت ہرگز نہیں ہے اور نہ کوئی عقلمند مینٹنک کے علم سابق کو علت بنا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک مدرس جو اپنے درجہ کے تمام طلباء سے واقف ہے وہ ایک طالب علم کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ پڑھتا نہیں ہے۔ کام چود ہے، کامل ہے سالانہ امتحان میں فیل ہو جائیگا۔ جب سالانہ امتحان کا نتیجہ آیا تو وہ طالب علم فیل تھا تو کیا اس کے فیل ہونے کی علت استاد کا علم تھا یا اس کا نہ پڑھنا محنت نہ کرنا تھا؟ ظاہر ہے علم مدرس کو علت نہیں کہا جاسکتا اس کی علت تو صرف طالب علم کی کاہلی اور نہ پڑھنا ہے۔ اسی طرح اگر خدا بندوں کے افعال کو جانتا ہے تو اس کا علم افعالِ عباد کی علت نہیں ہے۔ اور اتنی بات اس موضوع کے لئے کافی ہے۔

عقیدہ جبر کا معاشرہ پر ایک منحوس اثر یہ بھی ہوا ہے کہ اس عقیدہ نے سرکش و ظالم لوگوں کو مظلوموں پر ظلم کرنے کا جواز پیش کر دیا ہے اور مظلوموں کے ہاتھوں کو اپنا دفاع کرنے سے بھی روک دیا ہے!

مسد جبر کو بہانہ بنا کر ظالم اپنے بے رحمانہ اور ظالمانہ افعال کی مسؤلیت سے اپنے کو بے

کھکر بری کر لیا ہے کہ ظلم میں نے نہیں کیا یہ تو خدا نے کیا ہے وہ اپنے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ اور اپنے ظلم کو خدا کی طرف نسبت دیتا ہے کہ میں ہرگز ہرگز سزا وارفعن و اعتراف نہیں ہوں یہ سب خدا نے کیا ہے۔ اور مظلوم کو ظالم کا ظلم برداشت ہی کرنا پڑیگا کیونکہ ظلم و بیداد گری کا مقابلہ کیا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ جس نے اس پر ظلم کیا ہے۔ یعنی خدا۔ وہ مظلوم کو مل نہیں سکتا کہ اس سے انتقام لے لہذا ظلم کو خاموشی سے برداشت کرے۔

البتہ مکتبہ مادی کے پیروکار اس مسئلہ سے مسئلہ جبر و اختیار۔ میں فکری تناقض کے اندر مبتلا ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف تو انسان کو موجود مادی مانتے ہیں اور تعلقات ذہنی کی کام حکم مانتے ہیں۔ یعنی انسان حوالہ بل محط و جبر تا رتخ اور پہلے سے معین شدہ اوضاع کے سامنے ایک غیر موثر عامل ہے اور فاقہ لغز ہے۔ اپنے اعمال کے اختیار کیا بلکہ اپنے انکار و نفع حیات میں بھی مقہور طبیعت و فطرت ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے: کوئی بھی حرکت و تطور یا اجتماعی اقتدب ہو وہ محیط و ماحول کے اوضاع مادیہ کا طبعی نتیجہ ہوا کرتا ہے اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا کیونکہ انسان کا۔ کوئی ذاتی ارادہ نہیں ہے۔ ارادہ معاشرہ و ماحول کے اقتصادی و مادی اوضاع کا تابع ہوتا ہے، بلکہ ارادہ کو دل انسان کا ذہن حرکت تا رتخ کے جبری سیر کے قہری توازن کا تابع و محکوم ہوتا ہے۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ وہی طریقہ اختیار کرے جس کو معاشرہ کے مقتضیات اور فکری تصورات نے اس کے لئے معین کر دیا ہے۔ لہذا انسان کے سامنے اپنے ارادہ و اختیار کے اظہار کا راستہ بالکل بند ہے۔ اور نہ ہی اس کے اپنی مسؤولیات کی معرفت کا کوئی دور ہے۔

— یعنی خلاصہ یہ ہوا کہ انسان معاشرہ و ماحول سے مجبور ہے فاقہ لا ارادہ، مگر مزہم اور دوسری طرف یہ لوگ کہتے ہیں: نظام معاشرہ میں افراد انسان کی شخصیت بہت ہی موثر ہے اور اسی نے یہ لوگ انضباط مسلکی و حزبی پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور استعمار زندہ تنظیوں کو بغاوت مسلمی نہ پرآ مادم کرتے ہیں۔ اور لوگوں کے اختیار و حریت کا فائدہ اٹھا کر ظلم انسان

کے مفاد میں تغیر پیدا کرنا چاہتے ہیں اور خود تو جو کرتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ اور ان کا انسان کے لئے بلکہ فرد کے لئے اعتراف کرنا مادیہ ڈیالیکٹیک کے ساتھ صریح ناقص ہے۔ یہ گویا اعتراف و اقرار ہے کہ قوت و اختیار افراد انسانی تک کے پاس موجود ہے معاشرہ میں تو محل بحث بنتی ہے۔

اگر یہ لوگ یہ کہیں کہ منسلوئم جمہور کو حرکت میں لانا اور ان کی انقلابی تحریکوں کو تقویت پہنچانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ رجعت پسند و کہنہ عہد قدیم کے بطن سے نظام جدید کے سورج کو نکال جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کام غیر منطقی ہے کیونکہ تحول کیفی اور انقلاب اپنے حدود کے خارج و بے موقع نہیں ہو سکتا اور طبیعت ہر شخص سے بہتر اپنے کام کو ڈیالیکٹیکی رول کے مطابق انجام دے لے گی۔ اور افکار کی تیغ و تحریک درحقیقت طبیعت کے کاموں میں بے جا مداخلت ہے۔

یہ کہنا کہ آزادی کا مطلب اور اک ضرورت و قوانین طبیعت کی شناخت اور اہداف و مقاصد معینہ کے حصول کے لئے ان چیزوں سے امکان استفادہ ہے۔ نہ کہ قوانین طبیعت سے مقابلہ و مقاومت ہے۔ تو اس سے بھی اسکاں و ابہام دور نہیں ہوتا کیونکہ شناخت قوانین اور ان کے اہداف معینہ میں استفادہ کے بعد بھی یہ اسکاں باقی رہتا ہے کہ مادہ و طبیعت ان مقاصد کو معین کرتی ہے یا خود انسان اس کا معمم ہوتا ہے؟ اور اگر یہ انسان ہے جو تعمیم کرتا ہے تو کیا اس کے تعینات اس کی خواہشات و شرائط طبیعت کی تصویریں یا ان کے جریان کے برخلاف بھی امکان پذیر ہیں؟ مادی حضرات کا خیال ہے کہ ان ایک موجود مادی ہے بلکہ اس کے عقائد و افکار بھی تحولات اقتصادی و مادی کا نتیجہ ہوتے ہیں، مواضع طبقاتی کے تابع اور معاشرہ کے روابط تولیدی کے مخلوق ہوتے ہیں اور حیات بشری مادی ضرورتوں اور مخصوص اوضاع کے رد عمل کے طور پر جوستے ہیں۔

ان اگرچہ مادی مخلوق ہے اور معاشرہ کے مادی روابط، اور طبیعی و جغرافیائی اند

فیزیائی علاقے کا اس پر اثر بھی ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسرے وہ عوامل بھی ہیں جو کہ چشمہ خود کو اپنی کابطن اور فطرت ہے وہ بھی طول تاریخ میں ان لوگوں کی سرنوشت میں موثر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی عقلی و فکری حیات صرف مادہ اور علاقائی مادہ ہی کا نتیجہ ہو یہ ناممکن سی بات ہے۔ مگر عوامل مذہبی و معنوی اور عواطف روحی کا ان کے انتخاب راہ میں جو اہمیت رکھتے ہیں ان سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ نیز اس کا ارادہ حلقاات عمل و اسباب فعل یا ترک کے زنجیر کی ایک آخری کڑی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ان طبعی فعل و انفعالات کے تحت تاثیر ہے اور تاریخ و عامل تولید ظہور حوادث کے لئے نہیں ہوا کرتے ہیں۔ لیکن نہایہ عامل نہ تو تاریخی حوادث کے عامل ہیں اور نہ ہی سرنوشت ان میں نقش اعلیٰ رکھتے ہیں اور نہ ان سے اس کے ارادہ و حریت کو سلب کر سکتے ہیں کیونکہ یہ عامل کمال کے اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ اپنی قیمت فوق طبیعت کو پہچان لیا ہے اور اس کے زیر سایہ مسؤلیت و آگاہی کو پہنچ گیا ہے۔

اس لئے وہ مادہ کا اسیر و مکوم نہیں ہے بلکہ اس کے پاس ایسی طاقت و قوت ہے جس سے طبیعت پر حکومت کر سکے اور روابط مادی کو دگرگوں کر سکے۔

کارل مارکس (Karl Marx) نے نقش نہائی کو اپنے نظریات میں اقتصادی بنیاد قرار دیا ہے اور اس کا ایک معین کنندہ عامل سے تعارف کرایا ہے۔ لیکن مارکس کا دوست اس کے حکم پر حاشیہ لگاتے ہوئے کہتا ہے: مادی تاریخ کے بنش کے مطابق، آخری نظریہ واقعی زندگی کی تجدید ہے۔ جس نے اور مارکس نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا۔

لوگوں نے مارکس کے نظریہ کو مسخ کر دیا اور اس کا مطلب یہ کر دیا کہ عامل اقتصاد دی ہی تنہا عامل تعیین کنندہ ہے اور اسی طرح اس کی بات کو ایک بے معنی بنا دیا۔

ان وضع اقتصاد دی ہی بنیاد ہے۔ لیکن وہاں کچھ ایسے عوامل بھی ہیں جو اوپر ہی حصہ کو مکمل کرتے ہیں۔ مثلاً طبقاتی جنگ اور اسی کے نتائج کے لئے سیاسی کیفیت، تشکیلات حاکمہ جو

پیرزدہ مذہبی کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، حقوقی صورتیں، یہاں تک کہ مقابلہ کر نیوالوں کے انکار میں اس جنگ کا رد عمل، سیاسی و حقوقی و فلسفی نظریات، دینی ثقافتیں، اور ان امور کا اس ثقافت کی طرف پلٹ جانا جو اس میدان میں مسیطر ہے اور جو پیکار تاریخی کے جریان میں موثر ہوتی ہے اور جو بہت سے حالات میں واقعی طور پر اس کی شکل و صورت کو معین کرتے ہیں۔

یہ تمام عوامل مسلسل عمل و رد عمل میں رہتے ہیں اور بطور استمرار اقتصاد کی ممکنہ ایسے راستے کھوتی رہتی ہیں جو ایک قسمی ضرورت کی طرح بھی ختم نہ ہونے والے منافقات کو جنم دیتی رہتی ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں: اگر آپری حصہ کو مکمل کر نیو اسے عوامل ہی پیکار ہائے تاریخی کی شکل و صورت معین کر نیو اسے میں تو آپ ایک طرف اسے اقتصاد کی تعیین کنندگی پر کیوں بھروسہ کرتے ہیں؟ اور اگر آپری حصہ کو مکمل کر نیو اسے عوامل ہی تعیین کنندہ ہیں تب تو یہ ہمارے مفروضہ کی بنیاد یہ وہی بنیاد ہیں:

اس کے علاوہ اگر دو چیزیں ایک دوسرے کے وجود کی شرط ہیں اور باہم وابستہ ہیں تو بنیاد ہی کو اولیت دینے کا کیا مطلب ہے؟

جس طرح تغیرات طبیعت عمل و عوامل خارجی کے تابع ہیں اسی طرح بشری معاشرہ میں بھی کچھ سنسن و قوانین ہیں جنکی بنیاد پر امتوں کا زوال و انحطاط یا ترقی و افتاد ہوا کرتا ہے، اس بنا پر تاریخی حوادث تو اندھے جبر کے تابع ہیں نہ تعادف و اتفاق کے۔ بلکہ یہ تمام تحولات و تغیرات کمون و خلق کے قوانین و سنسن کے تابع ہیں اور ان سنسن میں انسانی ارادہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس بات کو واضح و روشن کرتی ہیں کہ امتوں کی تاریخ بننے

میں ظلم و جور، عدوان و طغیان کا بہت بڑا تمہ رہا ہے اور یہ وہ سنت الہی ہے جو تمام بشری معاشرہ میں جاری و ساری رہی ہے۔ ارشاد رب العزت ہوتا ہے :-

۱۔ كَذٰۤاۡ اَنۡرَدۡنَا اَنۡ يَّجۡلِكَ ذُرِّيَّتُہٗ اَمۡوَنًا مِّنۡ رَّيۡبِہَا فَعَسَوۡا۟ فِیۡہَا فَحۡقَ عَلَیۡہَا
اَلْقَوۡلُ فَاۡتَمۡوَنَّاہَا تَدۡمِیۡمًا (الشّٰرۡح ۶۷)

اور ہم کو جب کسی بستی کا ویران کرنا منظور ہوتا ہے تو ہم وہاں کے خوشامیوں کو اطاعت کا حکم دیتے ہیں تو وہ لوگ اس میں نافرمانیاں کرنے لگے تب وہ بستی عذاب کی مستحق ہو گئی۔ اس وقت ہم نے اس کو اچھی طرح تباہ و برباد کر دیا۔

۲۔ اَلَمْ تَرَ کَیۡفَ فَعَلۡنَا مِثۡلَ بَعۡدَ - اِنۡمَ ذَاتِ الْیَعۡرَابِ - اَلۡتٰی لَکُمۡ یُخۡلَقُ مِثۡلُہَا فِی الْبِلَادِ - وَ تَمۡوَدُّ اِلَیۡنَا جَاۡلُوۡا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ وَ یَزۡعُجۡنَ ذِیۡ الْاَوۡدَادِ
السَّیۡدِیۡنَ طُفُوۡا فِی الْبِلَادِ - فَاکۡفُرُوۡا فِیۡہَا الْفُسَادَ - فَصَبَّ عَلَیۡہِمۡ رِیۡبُکَ سَوَّاعِظًا - اِنَّ زَیۡلَکَ لَیۡلٌ مُّصَادِقٌ (الحج ۱۳)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے غار کے ساتھ کیا یعنی ارم و لے دراز قہر جن کا کل تمام دنیا کے شہروں میں کوئی پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ اور تمہو کے ساتھ (کیا کیا) جو وادی (قریٰ) میں پھر تراشیں (کر گھر بنا رہے تھے)۔ اور فرعون کے ساتھ (کیا کیا) جو سزا کے لئے بھیجیں رکھتا تھا یہ لوگ (مختلف) شہروں میں گھس رہے تھے اور ان میں بہت سے فساد پھیل رہے تھے تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا لگا دیا۔ بیشک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔

اس آیت میں بھی عذاب کی علت طغیان و عدوان کو قرار دیا گیا ہے۔
(ترجمہ)

نہ ان کو سزا دی جس کی سزا میں بھی کہا جاتا ہے (مترجم)

قرآن اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ جو ظالم اپنے خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ تاریخ میں تکلف و معاشات کے ثبوت کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :-

۳۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلٰی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلًا لِشَيْعَةٍ اِسْتَضْعِفَ طَآئِفَةً مِنْهُمْ يَتَّبِعُوْنَ اٰبْنَاءَهُمْ وَكُتُبُحْنِيْ نِسَاءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُنٰفِقِيْنَ

(القصص / ۳)

بینک فرعون نے (مصر) سرزمین میں بہت سر اٹھایا تھا اور اس نے وہاں کے رہنے والوں کو بھی گروہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ (نبی اسرائیل) کو عاجز کر رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں (بیویوں) کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بینک وہ بھی معتمدوں میں تھا۔

۴۔ فَاسْتَضَفَ قَوْمَهُ فَاطَاعُوْهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قَاۡمُوْا قَوَّامًا فَاِستَعِيْنُوْا (الزمر / ۵۳)

دغرض فرعون نے بتائیں (باکر) اپنی قوم کی عقل ماری اور وہ لوگ اس کے تابعدار بن گئے۔ بے شک وہ لوگ بدکار نہ تھے ہی۔

ان چاروں آیات میں فور کیجئے تو نتیجہ آپ کے سامنے آجائے گا۔

چونکہ افراد انسان سے معاشرہ بنتا ہے اور انسان جزء معاشرہ ہونے کی وجہ سے کل سے پہلے ہوتا ہے۔ انسانی فرد اپنی عقل و حکمت و ارادہ فطری کے ساتھ اپنے ذاتی وجود پر اجتماعی وجود سے مقدم ہوتا ہے اور فرد کی روح معاشرہ کی روح کے مقابلہ میں مجبور و بے اختیار نہیں ہے۔ قائلین جبر نے یہ خیال کیا کہ افراد مجتمع — معاشرہ — میں اس طرح گھس جاتے ہیں جیسے جزدہ کی ہیں اور پھر وہ ایک جدید حقیقت بن کر نکلتے ہیں۔ مثلاً شکر و پانی مل کر شراب بن جاتا ہے۔ یعنی بطور مرکب حقیقی مانتے ہیں تو ایسی صورت میں یا تو ہم معاشرہ کے ترکیب حقیقی کا انکار کر کے افراد کی آزادی و استقلال کو قبول کریں اور یا مرکب حقیقی مان کر فرد کی آزادی و استقلال سے دست برداری کا اعلان کریں۔ ان دونوں باتوں — معاشرہ مرکب حقیقی ہو

اور افراد آزاد و مستقل ہوں — کو ماننا ممکن و محال ہے۔

معاشرہ اگرچہ افراد سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے مگر درعین حال امور اجتماعی و مسائل انسانی میں افراد، معاشرہ کے زیر دست اور مجبور نہیں ہیں۔ کیونکہ فطرت بشر کی اصالت — جو اصل طبیعت انسانی سے مایہ حاصل کرتی ہے — ہی انسان کو حریت، اختیار و آزادی بخشی ہے اور اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ معاشرہ اس پر جو کچھ لادنا چاہتا ہے اسی سے انکار کر دے۔ اسلام اگرچہ معاشرہ کے لئے حیات موت، قدرت و طاقت کا قائل ہے اور گویا اس کو ایک مستقل شخصیت سمجھتی ہے مگر اس کے باوجود معاشرہ کے اندر اصلاح اور فساد کا مقابلہ کرنے کے لئے افراد ہی کو مرکز و اصل مانتا ہے اور طبقاتی و منع کو کسی فکری یا معینی عقیدہ کے لئے جبری عمل کی طرح تسلیم نہیں کرتا۔

امر معروف و نہی از مکر معاشرہ کے فرمان سے کشتی کا دستور ہے اور محیط کے فساد و تباہ کاری کے خلاف ایک ناقہ رانی ہے۔ قرآن مجید تصریح کرتا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا تَقْرِضُوا لَكُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذَا أَهْتَدَيْتُمْ (النساء/۷۷)
اے ایمان والو تم اپنی خبر لو جب تم راہ راست پر ہو تو کوئی امر و نہی جو اگر سے تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ؟ قَالُوا كُنَّا مُسْتَعْصِفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضَ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتَمَاجِدُوا فِيهَا قَالُوا لَكَ مَا أَضَاهَمُ جَمْعُكُمْ كَسَاءَتْ مَصِيرُوا (اسنا/۱۶)
بے شک جن لوگوں کی قبض روح فرشتوں نے اس وقت کی ہے کہ وہ راہِ حرب میں پڑے، اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے تو فرشتے قبض روح کے بعد حیرت سے کہتے ہیں ہم کس حالت و غفلت میں تھے تو وہ دعوٰی کرتے ہیں کہ ہم تو روئے زمین پر یکسے تھے تو فرشتے کہتے ہیں کہ خدا کی ایسی بس جو وہی زمین میں تھی بھی

گنجی نشن زخمی کرم دکہیں ہجرت کر کے چلے جاتے۔ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

یہ آیت ان لوگوں کی باتوں کو ناپسند کر رہی ہے جو یہ عذر کرتے ہیں اُسے بھائی ہم اپنے ماحول و حالات سے مجبور ہیں! آیت ان کا عذر قابلِ سماعت نہیں سمجھتی۔

جب تک انسان با اختیار نہیں ہے، اس وقت تک تقویٰ کا بے معنی لفظ ہے۔ انسان کی قدرو قیمت اس کی آزادی کا لازمہ ہے کسی بھی شخص کے استقلال اور شخصی قدر و قیمت کا اقرار اسی وقت کیا جاتا ہے جب معلوم ہو جائے کہ یہ سالک حق ہے نفس کا مخلص ہے۔ لیکن اگر فطری ذہن کے سامنے سرنگوں ہو جائیں تو پھر ہماری کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ کوئی ایسا عامل نہیں ہے جو انسان کو معین راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دے اور نہ ایسی کوئی طاقت ہے جو انسان کو کسی فعل کے ترک پر مجبور کر دے تو اسی وقت انسان خود کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

اگر انسان منہی طور سے — نہ کہ شعوری طور سے — اپنے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنی وضع فاسد کے بدنے کا ارادہ کرے تو وہ متقی کہلانے کا استغناء نہیں رکھتا۔ البتہ اگر اس کے تمام اعمال و افعال صمیم قلب سے شعوری طور پر قصد و اختیار کے ساتھ ہوں تب وہ متقی کہلانے کا مستحق ہے۔

قائمین اختیار

اس مکتب خیال کے لوگ کہتے ہیں: انسان خود ہی اس بات کا احساس کرتا ہے کہ وہ اپنے عمل میں آزاد ہے اپنے حسب دل خواہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اپنے حسب خواہش جو قدم چاہے اپنی زندگی میں اٹھا سکتا ہے ایسے قوانین کا وجود جو انسان کو یہ شعور عطا کرتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے جواب دہ ہے، بعض اعمال پر ندامت و پشیمانی، وہ سزا میں جو قانون نے مجرمین کے لئے معین کر دی ہیں، انسان کے وہ اقدامات جنہوں نے تاریخ کا دھارا بدل دیا ہے، علوم و کائنات کے میدان میں انسانی ایجادات یہ ساری چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان اپنے افعال میں آزاد ہے۔

اسی طرح مسئلہ تکلیف، بغث، انبیاء، الہی قوانین کا انسان کے لئے پیش کرنا، معاد، یہ ساری چیزیں بھی انسان کے افعال و اعمال میں اس کی حریت و اختیار پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ ایک بے معنی سی بات ہے کہ خدا اپنے بندوں کو مکلف بنا کے بلکہ ان کو ایمان پر مجبور کر کے ثواب یا عقاب دے۔

اسی طرح یہ بات خلاف انصاف ہے کہ خالق کائنات اپنے قدرت و ارادہ سے ہم کو جس آیت پرے جانا چاہتا ہے اسے جائے اور پھر اس فعل کی خاطر جو ہم سے بے اختیار سرزد ہوا ہے ہم کو سزا دے!

اگر واقعا لوگوں کے تمام افعال خدا کا فعل ہے — بندوں کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہے — تو تمام تباہ کاریاں، ظلم و ستم، خدا کی طرف سے ہوئے ہیں حالانکہ ذات اقدس الہی ہر دم کے ظلم و تباہ کاری سے منزوع ہے۔

اگر کسی بھی کام میں ہمارے انتخاب و اختیار کو دخل ہی نہیں ہے تو تکلیف ایک غیر عادلانہ فعل ہوگا اور نہ جبارانہ دہرستی علامت ہوں گے اور نہ انصاف کے نواسے مستحق تعریف ہوں گے۔ کیونکہ مسکویت تو صرف امکانات اور اختیاری چیزوں میں ہوا کرتی ہے۔ انسان اسی وقت علامت یا مستحق ستائش و تعریف ہوتا ہے جب اپنے عزائم و افعال میں مختار ہو ورنہ نہ علامت ہو سکتی ہے نہ تحسین: آزادی انسان کے سلسلہ میں اگر وہ حد افراط میں داخل ہو گیا ہے اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ انسان بلا کسی سارے کے مختار مطلق ہے۔ گویا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ خدا ان امور کے احکام کو حکم نہیں دے سکتا جو بندوں کے افعال سے متعلق ہیں اور نہ ہی بندوں کے اختیاری افعال سے خدا کی قدرت کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر خدا عاجز ہے کہ بندے کے فعل اختیار کا کے سلسلہ میں کوئی اپنا حکم نافذ کر سکے۔

یہ حضرات جو عقیدہ رکھتے ہیں اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ خداوند عالم نے کائنات اور اس میں ہونے والے حوادث کو ایک قطعی نظام کے تحت بنا کر اپنا کام ختم کر دیا۔ کائنات کی تخلیق کے بعد اس میں ہونے والے واقعات و حوادث کا واسطہ خدا سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور بندوں کے افعال بھی جہاں جتنی کے واقعات و حوادث میں سے ہیں انہیں کا بھی خدا سے ڈائریکٹ کوئی رابطہ واسطہ نہیں ہے اور خدا بندوں کے افعال میں کسی بھی قسم کی مداخلت یا تعریف نہیں کرتا۔ کائنات بلا اختیار کے عقائد کا یہ خلاصہ ہے جس کو ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دیا۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ: موجودات کائنات کو تو ایسی طبیعت اور انسانی ارادہ وجود میں لاتا ہے اور دورانِ عالم و اعمال بشر کا خداوند عالم سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے۔ وہ شخص درحقیقت کون میں تاثیر کو ایک دوسرے مرکز کی طرف منسوب کرتا ہے جو خود مخلوقات سے ہے پس ایسے شخص مخلوقات کو خدا کے ساتھ خالقیت میں شریک جاتا ہے اور خدا کے مقابل میں ایک دوسرے پروردگار کا قائل ہو گیا ہے اور شعوری یا لاشعوری طور پر ذات خدا کے ساتھ ذات موجودات کے استقلال کا قائل ہو گیا ہے۔

اور کسی بھی موجود کے لئے — خواہ وہ بشر ہو یا غیر بشر — حریت نامہ کا عقیدہ مستلزم شرک ہے یعنی اس موجود کو خدا کے ساتھ فاعلیت و استقلال میں شریک ماننا ہے۔ اللہ بے شک یہ بات خود دو گانہ پرستی کی ایک قسم ہے۔ جو ان کی توحید کی بلندی سے گرا کر شرک کی تاریک کھائی میں ڈھکیل دیتی ہے۔ کیونکہ اس عقیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ خداوند عالم سے اسکی فرماں روائی کی قہر و سے 'جو تمام نظام ہستی پر محیط ہے' سلب اختیار کر لیا جائے اور بشر کو اس کے قہر و اختیار میں بلا شرکت غیر ایک مطلق العنان حاکم مان لیا جائے جس کا کوئی معارض نہ ہو۔ اور کوئی بھی واقعی توحید پرست اس قسم کی غلطیت کو چاہے وہ کتنی ہی محدود ہو — عالم ہستی اور اعمال بشر — کبھی بھی قبول نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہر توحید پرست پر — عین اس عالم میں کردہ عمل و اسباب طبعیت کا قائل بھی ہو — واجب ہے کہ حوادث و خواہر میں صرف خدا ہی کو موثر حقیقی تسلیم کرے۔ اور ہر موجد کو یہ بھی عقیدہ رکھنا چاہئے کہ اگر خدا انسان کے افعال و اعمال میں ان کے ارادہ و اختیار کو سلب کرنا چاہے تو سلب کر سکتا ہے۔

موجودات جہاں جس طرح اپنی ذات میں استقلال نہیں رکھتے بلکہ ذات خدا سے وابستہ ہیں اسی طرح یہ موجودات علیت و تاثیر میں بھی استقلال نہیں رکھتے اور اسی عقیدہ کو توحید افعالی کہا جاتا ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہم اس بات کا یقین رکھیں کہ نظام ہستی اپنے تمام عمل و محولات و سنن کے ساتھ خدا کا فعل ہے اور اسی کے ارادہ سے ان چیزوں کا وجود ہوا ہے اور اسی طرح عامل و سبب کا درحقیقت وجود اور اسکی فاعلیت و تاثیر بھی خدا ہی کا عطیہ ہے۔

اس تفسیر کی بنا پر توحید افعالی کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ ہم جہاں ہستی کے نظام سبب و مسبب کا انکار کر دیں اور یہ کہنے لگیں کہ ڈائریکٹ ہر اثر خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے اور عامل کا وجود عدم برابر ہے۔ بلکہ ہم خدا کے ساتھ عالم اسباب کے بھی قائل ہیں (منہزم) البتہ اگر یہ تصور کیا جائے کہ نظام ہستی سے خدا کی نسبت اسی طرح ہے جس طرح

ہنرمندی نسبت ہنر کی طرف ہوتی ہے۔ یعنی من باب المثال جیسے اسٹیجو اور اس کا بنانے والا کہ اسٹیجو اپنے وجود میں بنانے والے کا محتاج ہے۔ لیکن جب فنکار نے اسٹیجو بنا دیا تو پھر اب فنکار کی ضرورت نہیں ہے وہ حسین و جمیل اسٹیجو لوگوں کو دعوتِ نظارہ دیتا رہے گا چاہے اس کا بننے والا سر جائے۔ اگر کوئی اس قسم کا تصور خدا اور اس کی مخلوقات کے لئے کرے تو یقیناً شرک ہے۔ اور عقیدہ توحید کے منافی ہے۔

علاوہ اس کے جو شخص موجودات اور افعال میں نقشِ خداوندِ عالم کا انکار کرتا ہے وہ تمہری طور پر خدا کی قدرت کو محض دکر دیتا ہے اور یہ — تحدیدِ قدرت — عقل و منطوق کے خلاف ہے کیونکہ اس سے دو خدایاں پیدا ہوتی ہیں پہلی تو یہ کہ یہ بات جہاں عمومیت قدرت پروردگارِ عالم کے انکار کو مستلزم ہے۔ وہاں اس ذاتِ غیر محدود و لامتناہی کی محدودیت کو بھی مستلزم ہے۔ اور دوسری یہ ہے کہ اس سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مخلوقِ خالق سے مستغنی ہے اور یہ احساس انسان کو مغیان و کشرش پر آمادہ کرتا ہے درآن حالیکہ خالق کے حضور میں تسلیمِ مطلق اور اس سے تعلق اور اس پر بھروسہ کرنے کا ممکن اثر انسان کی شخصیت و اخلاق اور اس کے سلوک و روحانیت پر پڑتا ہے اور چونکہ اس کے ظاہر و باطن میں خدا کے سوا کوئی حاکم فرماندہ نہیں ہوتا اسی لئے نہ خواہشاتِ نفسانی اس کو اپنی گرفت میں لے پاتی ہیں اور نہ کوئی انسان اس کو اپنی غلامی میں لے سکتا ہے۔

خداوندِ عالم قرآن مجید میں کائنات کے ادارہ کرنے میں کسی بھی مخلوق کی شرکت کو بالکل ختم کر دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے :-

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا قَلَمٌ یَّکُنْ لَّهِ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ دَکُلَمٌ یَّکُنْ لَّهِ وَلِیٌّ مِّنْ الدِّیْنِ وَکَثَرُ کَ تَکْلِیْمًا (الاسراء/۱۱)

اور کہو کہ ہر طرح کی تعریف اس خدا کو (سزاوار) ہے۔ جو نہ تو کوئی اولاد رکھتا ہے اور نہ (سارے جہاں کی سلطنت میں) کوئی اس کا سا جھے دار ہے

اور نہ اسے کسی طرح کی کمزوری ہے کہ کوئی اس کا سر پرست ہو اور اسی کی بڑائی اچھی طرح کرتے رہا کرو۔

قرآن مجید نے بہت سی آیتوں میں خدا کی قدرت مطلقہ کو صراحت سے بیان کیا ہے مثلاً:-
 رَدُّهُ مَلَكَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

(المائدہ — ۱۶)

سارے آسمان و زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب خدا ہی کی سلطنت ہے

اور وہ ہر چیز پر قادر (د توانا) ہے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ
 رَدُّهُ كَانَ عَلَيْهِمْ يَوْمَئِذٍ

(فاطر/۳۲)

اور خدا ایسا (گیا گزرا) نہیں ہے کہ اسے کوئی چیز عاجز کر سکے (نہ آسمانوں

میں اور نہ زمین میں بے شک وہ بڑا جبار و قہار) بڑی (قابو) قدرت والا ہے۔

یاد رکھیے موجوداتِ عالم جس طرح اپنی تعداد میں خدا کی محتاج ہیں اسی طرح کمالا اپنے حدود — خلقت — میں بھی محتاج ہیں۔ اور مجموعہ کائنات کو ہر وقت خداوند قدوس سے فیض وجود کا استفادہ کرتے رہنا چاہئے۔ ورنہ یہ نظام درہم برہم ہو سکتا ہے کیونکہ عالمی قوتوں سے جو بھی صادر ہوتا ہے وہ خدا کی خالقیت وفاعلیت کے طیف ہیں ہوتا ہے۔ اور مابین موجودات کا ارادہ خداوندی سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔ اس بنا پر کسی مہارت کو بھی ذاتی استقلال حاصل نہیں ہے اور یہ اسی طرح ہے کہ جیسے بجلی کے لمپ کے لئے ضروری ہے کہ ابتدا وہ خزانہ سے بجلی لے اور پھر اسے روشنی کے لئے بھی خزانہ سے طاقت حاصل کرتا ہے۔ قرآن مجید صراحت سے کہتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ

(سورہ فاطر/ ۱۵)

لوگو تم سب کے خدا کے (ہر وقت) محتاج ہو اور (صرف) خدا ہی (سب سے) بے پرواہ سزاوار محمد (دُعا ہے)۔

اس طرح تمام حقائق اس کے ارادہ سے پیدا ہیں اور اس سے وابستہ ہیں اور ہر وجود علی الدوام اس سے استمداد کرتا ہے اور پورا نظام وجود صرف ایک محو کے گرد گھومتا ہے امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں :-

خدا لوگوں کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اور خدا کی سلطنت میں وہ چیز نہیں ہو سکتی جس کو وہ نہ چاہے (امول کافی ج ۱ ص ۱۶۰)

اگر پروردگار عالم ہر وقت ہم پر حریت ارادہ، امکانات، قوتی، حیات کا فیضان نہ کرتا رہے تو ہم کبھی بھی عمل کے کرنے پر قادر نہ ہوں۔ کیونکہ اس کے نا تغیر پذیر ارادہ سے ہم سے یہ چاہا ہے کہ ہم اپنے ارادی افعال کو اپنے اختیار سے انجام دیا کریں۔ اور جو چیز اس نے ہم سے چاہی ہے اس کا ایفا کریں اور اس نے یہ چاہا ہے کہ انسان اپنے حب خواہش و شخصیت مستقل نیک و بد یا روشن و تاریک خود تعمیر کرے۔

پس اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ارادی افعال کا تعلق خدا سے بھی ہوتا ہے اور ہم سے بھی اور یہی مذہبِ ایشیادنا مشریع کا عقیدہ ہے۔ (ترجمہ) — جو سوا یہ طاقت خداوند عالم نے ہم کو بخشا ہے اور ہمارے اختیار میں دیا ہے اس کو ہم جان بوجھ کر خود ساختہ آزادی اور نیک کاموں میں اسی طرح خرچ کر سکتے ہیں جس طرح فساد و تباہ کاری و برائی کے لئے خرچ کر سکتے ہیں اگرچہ یہ خدا کی طرف سے ایک مخفوس چوکھٹے کے اندر ہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح سمجھئے کہ طاقت خدا کی دی ہوئی ہے اور اس کا استعمال اور اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے۔

ایک مثال سے اور بات واضح کروں۔ فرض کیجئے ایک آدمی کے سینہ میں مصنوعی قلب لگا دیا گیا ہے اور ایک میشری کے ذریعہ — جو میشری اس قلب مصنوعی سے متصل ہے —

اس معنوی قلب میں حرکت بخشی گئی ہے اور اس بیٹری کے کنٹرول کر نیوالے کمرے کو ہمارے اختیار میں دیدیا گیا ہے اور اس بیٹری کی چابی ہمارے پاس ہے۔ ہم جس وقت چاہیں چابی لگا کر قلب متحرک کر سکتے ہیں۔ یعنی یہاں پر جو چیز ہمارے اختیار میں ہے وہ ایک طاقت ہے جو بیٹری کے ذریعہ ہر وقت دل کو متحرک رکھے ہوئے ہے لیکن اس طاقت کا کنٹرول ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم جب تک چاہیں بیٹری کے ذریعہ اس طاقت سے دل کو متحرک رکھیں اور جب چاہیں اس کی حرکت کو ختم کر دیں اور دل کو جب تک متحرک رکھیں اس کو اختیار دیدی جو چاہے کرے تو اب اگر دل بچھایا برا کام کرے تو یہ اس کی خواہش اور اس کے اختیار کی بات ہے وہ اس طاقت سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے وہ جانے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن وہ طاقت ہمارے کنٹرول میں ہے۔

اسی طرح ہماری طاقت خدا کی بخشی ہوئی ہے ہم جس طرح چاہیں اس طاقت کو استعمال کریں یعنی اس سے فائدہ یا نقصان حاصل کرنا یا کچھ ہمارے اختیار میں ہے لیکن وہ طاقت خدا کے کنٹرول میں ہے جب تک چاہے وہ طاقت ہمارے پاس رکھے اور جب چاہے ختم کر دے۔ اور یہ وہی مذہب اعتدال ہے جو مذہب جبر اور مذہب اختیار دونوں سے الگ ہے اور اب ہم اسی مذہب کی — یعنی مذہب اعتدال — مزید توضیح کرنا چاہتے ہیں —

درمیانی بات

موجوداتِ جہاں کمال کے چاہے جس درجہ میں پہنچ جائیں۔ اس درجہ کی مخصوص ہدایت سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اور درجات گونا گوں ہستی کے مناسبت سے ہدایت کی خصوصیت بھی مکمل طور سے متفاوت ہے۔

یہ بات ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس کائنات کے مختلف موجودات کے درمیان ہم جہاں چاہیں اپنی جگہ معین کر لیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نباتات فطرت کے جبری طاقتوں میں اسیر و بے بس ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جمیعہ کے تغیرات کے سامنے اپنے مکمل کا مختصر سا اظہار رد عمل بھی کرتے ہیں۔

اور جب ہم حیوانی خصوصیات کی تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حیوان کے خصوصیات نباتات سے مکمل طور پر تفاوت رکھتے ہیں۔ حیوان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی غذا کی تلاش خود کرے۔ کیونکہ طبیعت حیوان کے لئے دسترخوان نہیں بچھاتی۔ اور نہ اس کے لئے غذا تیار کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ تلاش غذا کے لئے وہ کافی وسائل کا محتاج ہوگا۔ لہذا خدا نے اس کو تمام وسائل سے مکمل کر کے پیدا کیا ہے۔

اگرچہ حیوان قوت غریزیہ کی شدید کشش اور جاذبہ کے ماتحت ہونے کی وجہ سے ایک فرمان بردار موجود ہے اور عین اس حالت میں ایک حد تک آزاد بھی ہے اور کسی حد تک فطرت کی سخت گیری اور قید سے بھی اپنے کو آزاد بنا لیتا ہے۔

علمائے حیوانات کا عقیدہ ہے کہ جب تک حیوان اپنی فطری ساخت اور قوی و آلات کے لحاظ سے کمزور ہوتا ہے اس وقت تک اس کو نظر غریزہ قوی تر اور فطرت کی بروہ راست

حمایت و سرپرستی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اور جتنا جتنا حسی، نیچلی اور عقلی طاقتوں سے مضبوط اور استقلال و قدرت سے محکم تر ہوتا جاتا ہے اتنا اتنا ہدایت غوریز کی لحاظ سے کم و کمزور و دور ہوتا ہے۔ جیسے بچہ اپنی ابتدائی زندگی میں ڈائریکٹ پدر و مادر کی تمام تر حمایت و توجہ کے ماتحت ہوتا ہے اور پھر جتنا جتنا منزلی رشد سے قریب ہوتا جاتا ہے والدین کی ڈائریکٹ سرپرستی سے اتنا اتنا دور ہوتا جاتا ہے۔

انسانی جو مرحلہ تکامل کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہے اور تنہا وہ موجود ہے جو قوت ارادی، قوت تیز و تشخیص کا مالک ہے وہ غریزہ کے لحاظ سے بہت ترین سطح پر ہے۔ حالانکہ تدریجی آزادی کے مرحلے میں نسبت بنانا ان کے اختیار نام کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ لیکن تجہیزات میں ضعف و نارسائی کے ساتھ ساتھ۔

بنانات کی تمام ضرورتوں کو جاننے طریقہ سے طبیعت خود پورا کرتی ہے۔ اور حیوانات کی ضرورتوں کے سلسلہ میں ماں کی ذمہ داری آتی ہوتی ہے کہ وہ حمل اور تغذیہ اور بچہ کی حفاظت کی پابند ہوتی ہے۔ لیکن حیوانوں میں غرائز بطن طفولیت ہی سے بیدار و پر بار ہیں اور ماں ان کی حرکت اور تربیت کی ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اور اس طرف سے وہ مطمئن ہے لیکن انسان کو دیکھتے ہیں کہ وہ فطری طاقتوں کا مالک نہیں ہوتا، ناساعد حالات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے میں وہ حیوان سے بدرجہا کم تر ہے۔ اسی لئے وہ سالہا سال تک دوسروں کا خصوصاً والدین کا۔ جب تک خود کفالی اور مدار استقلال کو نہ پہنچ جائے اور اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ محتاج رہتا ہے۔ قرآن مجید انسان کے ضعف کی صراحت کرتا ہے خَلِقَ الْإِنْسَانَ ضَعِيفًا۔ (الناسم/۹۶) آدمی تو بہت کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

پس طبیعت انسان کو حیوان سے بہت پہلے آزاد کر دیتی ہے اور اس کے حوالہ کر دیتی ہے۔ اور مراحل تکامل کو طے کرنے کے ساتھ ایک طرف تو اس کے اختیارات، تحریکات اور آزادادی میں وسعت ہوتی چلی جاتی ہے اور دوسری طرف ضرورتیں، علاقے، ارتباطات

بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ انسان اپنی آزادی اور اختیار سے جتنا فائدہ اٹھاتا ہے اس کی ضرورت اور عاجزی بھی بڑھتی جاتی ہے۔

یہ مخصوص کیفیات جو موجودات ہستی کو گھیرے ہوئے ہیں مفکرین کی نظر میں اسباب تکامل ہیں اور موجود جس قدر بھی رشد حاصل کرتا جائے اور ترقی کی سیڑھی سے اوپر چڑھتا جائے آزادی کی طرف زیادہ سے زیادہ بڑھتا ہے۔ اور یہ پیش رفت و ترقی ضرورتوں اور عدم تعادل کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے اور پھر ان حالات میں لکھن کی مشین کام کرنے لگتی ہے۔

لیکن انسان میں حریت و آزادی کی تبدیلی کے لئے غرائز طبیعت کے مقابلہ میں ایک مخالف قوت کا وجود ضروری ہے تاکہ انسان اپنے کو دو ایسی مخالف طاقتوں کے درمیان محسوس کرے جن میں کسی ایک طاقت اس کو اپنی طرف کھینچ رہی ہو تاکہ انسان مجبور ہو کر اپنی حریت و اختیار سے حسب دلخواہ بغیر کسی جبر و آکراہ کے کسی ایک کو اختیار کرے۔ اور پھر تمام اصول جبر و تحصیل و ذہنی پیش بندی کے اپنی برسانہ و سازندگی کا مخصوص اصول و ضوابط کی بنیاد پر آغاز کرے۔

اور پھر اس صراع و نزاع کے درمیان یا تو انسان مہمیت رہا نہ اور امانت الہی کو بھجے۔ امانت الہی کا بوجھ اتنا سنگین ہے کہ آسمانوں اور زمین نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا مگر انسان نے اٹھالیا کیونکہ وہ ظالم و جاہل ہے۔ اٹھا کر اپنی خواہشات کی آندھیوں کا اسیر ہو جائے اور انحطاط و پستی میں جا گرے۔ اور پھر اپنی فکر پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے نافع و انتخاب گراں دہ کے سہارے اور اپنی بھرپور استعداد سے استفادہ کرتے ہوئے رشد و تکامل کے راستہ پر چل پڑے اور سیرا تعالیٰ کو شروع کر دے۔

اگر انسان غرائز کی جبری طاقت سے آزاد ہو کر، بلتھوں اور پیروں میں پڑی ہوئی غرائز کی زنجیروں کو توڑ کر، سرمایہ اور انسانی قوتوں کو بروئے کار لا کر ان سے استفادہ کرنے پر قادر ہو جائے تو پھر اس کے عواطف و احساسات کے مراکز ضعیف ہو جاتے ہیں اور سابق طبیعت کے چراغوں کی روشنی عقل کے سامنے مدھم پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ہر زندہ موجود کی ہر وہ

طاقت یا عضو جس کو بغیر استعمال چھوڑ دیا جائے تو وہ طاقت ہو یا عضو کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس جب کسی عضو یا طاقت کو بنیادی طور پر استعمال کیا جائے تو اس میں کمال پیدا ہو جاتا ہے۔
 بنا برین جس وقت انسان کا آگاہانہ و فطری ارادہ، عقل و تشخیص کی طاقت کے الہام کے ساتھ روشن فکر راہ اور اس کا منشاء حرکت بن جائے تو پھر آدمی کی بصیرت و تفکر، تحقیق و واقعیت کے پانے کا راہ کٹ اور رہبر بن جاتی ہے۔

اس کے علاوہ دو مخالف قطب کے درمیان تیر و تردید کی حالت آدمی کو غور و فکر پر آمادہ کرتی ہے تاکہ وہ تلاش عقل کی مدد سے صحیح راستہ اور غیر صحیح راستہ پہچان لے اور اسی خواہش و احتیاج کی بنیاد پر مرکز تفکر اپنا کام کرنے لگے ہیں اور انسان کی فکر و آگاہی کو تقویت ملتی ہے اور جوش و طاقت و حرکت زیادہ ہوتی ہے۔

حریت ارادہ، سرگردانی و حیرت سے نکلنے کی خواہش، زندگی سے محبت یہ چیزیں سبب پیدائش آرزو ہوتی ہیں۔ اور انسان کی خواہشات اور کمال مقاصد کا ذریعہ بنتی ہیں جو اسل ارادہ کی طاقتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مقصد تک پہنچا دیتی ہیں۔ اسی لئے جو موجودات اپنی ذاتی سرشت کی پیروی پر مجبور ہیں۔ ان میں آرزو و ارادہ کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ کیونکہ آرزو اور ارادہ کا تحقق و ملن ہوتا ہے جہاں اختیار ہو۔

اسی طرح علم، تمدن، آزادی خواہی، ملکیت وغیرہ کا بھی تحقق وہیں ہوتا ہے جہاں اختیار پایا جائے۔ اور انسان اپنی حریت و سعی مسلسل کے ذریعہ کمال علمی و رشد بلکہ نام العباد فطرت و سرشت میں ترقی کر سکتا ہے۔ اور اپنی طاقتوں، استعداد اور بلند انسانی فطرت کا استعمال کر کے ایک ایسی منزل تک پہنچ سکتا ہے جہاں وہ فضائل کا منبع فیاض اور

معاشرہ کیلئے عامل ثمر دار بن جائے اور یہ سب چیزیں اختیار کے ثمرات میں سے ہیں اس طرح اختیار کے ثمرات کو ہم ہر جگہ

ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اودھر قرار ان اختیار و تکرین اختیار کے درمیان نزاع و کشمکش خود ہی شاہدیتیں ہے کہ بشر میں غنمی طور سے اختیار کو سب ہی قبول کرتے ہیں۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں انسان میں اختیار کے حدود و شرائط کیا ہیں؟ اور انسان کس حد تک مختار ہے؟

اس مسئلہ — جبر و اختیار — میں شیعوں نے قرآن مجید اور مذہبی پیشواؤں کے جو عقیدہ حاصل کیا ہے وہ نہ مطلق جبر ہے اور نہ مطلق اختیار ہے بلکہ ایک تیسرا نظریہ ہے جس میں نہ تو مذہب جبر کی حامیاں ہیں، جو عقل و فکر، وجدان، اخلاقی اور اجتماعی معیار کے مخالف ہیں اور جو تمام غلطیوں اور فجائع کی نسبت خدا کی طرف دیتا ہے اور آخر میں عدل الہی کا انکار کر دیتا ہے اور نہ ہی اس تیسرے نظریہ میں مذہب اختیار کی خرابیاں ہیں مثلاً قدرت خدا کے عموم کا انکار، افعال و اعمال و خلق و ایجاد میں توحید کا انکار وغیرہ اور وہ تیسرا نظریہ جبر مطلق و تفویض مطلق کے درمیان کا ایک راستہ ہے۔

مذہب اعتدال

یہ بات واضح ہے کہ ہماری ارادی حرکتوں اور سورج، چاند، زمین، حیوان کی حرکتوں میں بہت ہی روشن فرق ہے۔ ہمارے باطن سے ایک ارادہ جوش مارتا ہے جو فعل و ترک کے دروازے ہمارے سامنے کھول دیتا ہے اور آزادی انتخاب کو، مین ہدیر کرتا ہے۔

اعمال عالم اور برے اعمال کے کرسف کے لئے ہمارا اختیاری عزم، قوت تشخیصی و تمیز اور ہماری مرضی سے ہو کرتا ہے۔ اور اس عظیم الہی سے استفادہ رشد و بصیرت و شعور سے ہونا چاہئے۔ پہلے تو اس کی تشخیص کرنی چاہئے، حساب کرنا چاہئے تب اختیار کرنا چاہئے اور ارادہ الہی ہی ہے کہ ہم اس کی حکومت میں اس آزادی سے فائدہ حاصل کریں۔

یاد رکھئے ہم جو بھی کام کرتے ہیں وہ اصلاح کے علم و بصیرت سے خارج نہیں ہوتا۔ اور تمام امور اور جہانات زندگی، ان لوں کی میسر و نفع سے ہی اس کے علم سے مشروط و مقید ہوا کرتے ہیں اور محدود ہوتے ہیں جو بہت پہلے سے علم خدا میں ہوتے ہیں۔ اور ہم ایک نقطہ بھی اس سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اور ہمارے اندر چھپی ہوئی طاقت سے فائدہ اٹھانا خدا کے مسلسل و مستمرہ دے کے بغیر ناممکن ہے۔

خدا اپنی عظیم قدرت قاہرہ سے اور بصیرت نامہ سے ہمارا مراقب اور ہماری نیتوں اور کرداروں سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کی حکومت و نظارت ہمارے تصور سے مافوق ہے اور وہ جس وقت چاہے اس رشتہ فیض کو قطع کر سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہماری آزادی اور ہمارا اختیار اس کے نظام عمومی سے خارج نہیں ہے اس لئے اس طرف سے مسئلہ توجہ میں کوئی مشکل درپیش نہیں ہے۔

وہ انسان جو اسی کائنات میں اپنی طاقت و ارادہ کے زیر سایہ موثر ہے وہ خود بھی نظامِ ہستی کے طبعی قوانین کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ انسان بے اختیار پیدا ہوتا ہے اور بغیر کسی ارادہ و اختیار کے مر جاتا ہے۔ طبیعت اسکو ضرورتوں کی زنجیر میں جکڑ کر اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور درمیانِ حال وہ اپنی استعداد اور اپنے امکانات سے فائدہ حاصل کر نیوالا ہے۔ اور آزادی و استغناء اس کے اندر غلاقت اور ایک ایسی طاقت ایجاد کرتی ہے کہ جس کے مہارے وہ طبیعت کو تسخیر اور عوامل محیط پر مسلط ہو سکے۔

اسی لئے امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: نہ جبر ہے نہ اختیار ہے بلکہ امر واقعی ان دونوں — جبر و اختیار — کے درمیان ہے۔ (کافی ج ۱ ص ۶۰)

بس انسان کو اختیار تو ہے لیکن ہر طرح کا نہیں ہے۔ کیونکہ مخلوق کے لئے اختیار کی استقلال کی چاہ ہے وہ محدود دائرہ میں ہو۔ فاعلیت خدا میں مشرک ہے۔ لیکن یہ محدود اختیار جو خالقِ طبیعت کے مرضی کے مطابق ہے اور جس میں اوامرِ الہی بطور سنن حاکمہ اس طبیعت پر جس میں بشر بھی ہے متبہی ہوتے ہیں وہ مشرک نہیں ہے۔ اسلامی نظریہ میں انسان نہ تو ایسی مخلوق ہے جو قدر کا جبری محکوم ہو اور نہ ایسی مخلوق ہے جو بے مقصد تاریک محیط میں آزاد چھوڑ دی گئی ہو۔ بلکہ وہ استعداد و مہارت و آگاہی اور مختلف خواہشات سے سرشار ہے اور ایک فطری ہدایت و باطنی رہبری کے ہمراہ ہے۔

مکتب جبر و اکراہ کے پیروکاروں کو دراصل اشتباہ اس طرح ہوا کہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ انسان کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں:

۱۔ افعالِ عبادت کو خدا کی طرف منسوب کر دین تو انسان کے سلب آزادی اور جبر کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

۲۔ افعالِ عبادت کو صرف بندوں کی طرف منسوب کر دین تو خدا کی قدرت کی محدودیت لازم آتی ہے۔

مالانکہ ہمارے ارادہ کی حریت قدرت خدا کے علوم میں بے اثر ہے۔ کیونکہ یہ تو خدا سے ہی چاہا ہے کہ سنت الہی کی بنیاد پر آزادی کے ساتھ شخص ہر کام کو ہم کر سکیں۔

بندوں کے اعمال و افعال کو ایک طرف تو خود بندوں کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف خدا سے بھی منسوب کرنا صحیح ہے۔ پس فرق اتنا ہے کہ افعال کی نسبت بندوں کی طرف بغیر واسطہ ہے اور خدا کی طرف جو نسبت ہے وہ با واسطہ ہے اور دونوں نسبتیں حقیقی و واقعی ہیں۔ اس طرح نہ تو ان کا ارادہ خدا کے ارادہ سے ٹکراتا ہے اور نہ ہی انسان کا ارادہ خود ارادہ الہی کے برخلاف ہے۔

اسباب کا اپنے سببات میں اثر انداز ہونا نیک عقیدہ اور نظام عالم میں دو مخلوقات کا اعتراف نہ صرف بلکہ خالقیت میں شریک نہیں ہے۔ بلکہ خالق کی خالقیت کے بارے میں کمال عقیدت ہے کیونکہ اس سے احاطہ اور حاکمیت مطلق اور مرد و خیران الہی تمام کائنات پر۔ جس میں انسان بھی شامل ہے۔ برقرار رہتا ہے۔

اگر ہم بطور اطلاق (خدا کے علاوہ) نظام ہستی میں ہر موثر کا انکار کر دیں تو حرکت مادہ کے لئے کوئی قابل قبول تفسیر نہیں ملے گی۔ اور جب موجودات کا ایک دوسرے میں موثر ہونے کا انکار کر دیں تو علت و معلول کے اثبات کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا۔

یہ قول: تمام حوادث مادہ کی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور خداوند عالم اپنی مدد و استمرار خالقیت سے دائمی طور پر مادہ میں ہر لحظہ حرکت پیدا کرتا رہتا ہے؛ بھی غیر منطقی ہے کیونکہ حرکت حقیقت واحدہ ہے لہذا یہ خود بخود مادہ کے مختلف تحولات کا باعث نہیں بن سکتا بلکہ مادہ جو بوسیدہ حرکت مختلف اسکال اختیار کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لئے ان مختلف اسکال کا وجود قدرت خدا کے ہاتھوں ہوا ہو تاکہ تنوع موجودات کا تحقق ہو سکے۔ یہاں پر ایک سوال ہو سکتا ہے: حوادث و موجودات میں مادہ کا کوئی اثر ہوتا ہے کہ نہیں؟ اگر مادہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو نظام وجود میں یہ آثار منظر کہاں سے آئے؟

اور اگر مادہ کا اثر ہوتا ہے تو پھر یہ قبول کرنا پڑے گا کہ خدا تمام حوادث کو ڈائریکٹ نہیں پیدا کرتا جیسے کہ علت اپنے معلول مادی کو ڈائریکٹ پیدا کرتی ہے خدا ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ مادہ موثر ہوتا ہے لیکن وہ اپنی تمام طاقتوں اور استعداد کو خدا سے حاصل کرتا ہے۔ اور خدا نہ مادہ ہے نہ حرکت فی المادہ ہے۔

یہ اعتراف کر لینا کہ : خدا نے مادہ کے اندر ایسی طاقتیں اور استعداد بخشی ہیں کہ جس کے ذریعہ مادہ خود اپنے اندر اور دوسروں کے اندر تحولات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ؛ خدا کی خالقیت مطلقہ میں کوئی اشکال پیدا نہیں کرتا۔ اور انسان کے لئے خالقیت محدودہ کا قبول کر لینا۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ انسان میں ایسا فقر و احتیاج موجود ہے جو اس کے تم وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ خدا کے ارادہ و مشیت کے منافی نہیں ہے اور نہ اس سے خدا کی خالقیتِ لاحدود میں کوئی خلل پڑتا ہے۔ اور نہ ہی اس سے کوئی معقول اشکال لازم آتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ سے — کافی ج، ص ۱۸۳ — ایک حدیث منقول ہے فرمایا :
خدا چاہتا ہے کہ اشیاء اسباب کے ماتحت جاری ہوں۔ لہذا اس نے ہر شے کے لئے سبب قرار دیا ہے۔

خلق خدا کے اسباب میں ایک سبب انسان اور اس کا ارادہ ہے اور اس کائنات میں ہر موجود کی پیدائش کے لئے خدا کی طرف سے مخصوص اسباب و علل قرار دیے گئے ہیں کہ جب تک وہ اسباب نہ ہوں گے وہ مہیات نہ ہوں گے۔ اور یہ ایک عمومی قاعدہ ہے جو ہمارے افعال اختیاری کو بھی شامل ہے۔ دیگر اسباب و علل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہمارے ارادہ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی ہونی چاہئے۔ تاکہ صدور فعل ہو سکے۔ قرآن مجید کی وہ آیتیں جن میں ہر شے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے وہ آیتیں دراصل ازل سے خالقِ عالم کے ارادہ ازل کو بیان کرنے کے سلسلہ میں ہیں اور ان کا مقصد جو

کی صورت عامہ کا بیان ہے اور اسکی قدرت کاملہ اور اعظمہ تامہ کا اثبات مقصود ہے اور یہ بھی مقصود ہے کہ اس کے امر کا نفاذ بلا استثناء تمام عالم کو مل ہے۔ لیکن یہ وسیع و شاسل اور عام قیام و کامل نفوذ بشری اختیارات کی آزادی کا سانی نہیں ہے کیونکہ اختیار بشری تو خلق ہے اور اسکی خدا نے یہ حریت انسان کو بخشی ہے تاکہ وہ اپنی زندگی بسر کر نیکا طریقہ اختیار کر سکے۔ اس نے کسی بھی فرد یا قوم کو دوسرے کی غلطی کا مسئول نہیں بنایا ہے۔

اور اگر یہی ضد ہے کہ بشر کو مجبور مانا جائے تو پھر انسان کو اختیار پر بھی مجبور ماننا چاہئے اور انسان کی حریت لازمہ مشیت الہی ہے نہ کہ اس کی محکومیت کا لازمہ ہے۔

بنابرین جس وقت ہم کسی اچھے کام کے کر نیکا ارادہ کرتے ہیں تو وہی ہوتی طاقت تو خدا کی ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا عمل ہے خدا کا عمل نہیں ہے۔

خداوند عالم قرآن مجید میں انسان کے بارادہ ہونے کو اور عمل کی نسبت انسان کی طرف ہے اس کو بیان کر رہا ہے اور جبری حضرات کی رد کر رہا ہے اور وہ اس طرح کہ عذاب دنیا اور مصائب دنیا کو ان کی عمل کا نتیجہ بنا رہا ہے وہ تمام آیات جو ارادہ الہی سے متعلق ہیں ان میں ایک جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں پر افعال اختیار کی نسبت ارادہ الہی کی طرف دی گئی ہو۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزال / ۷-۹)

تو جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہے وہ اسکو دیکھ لے گا۔

وَلَسَّالْنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (الغفل / ۹۳)

اور جو کچھ تم لوگ (دنیا میں) کیا کرتے تھے اس کی باز پرس تم سے ضرور کی جائے گی۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْلَئِنَّ اللَّهَ مَآ أَمَرَ كُنَّا كَآبَاؤُنَا وَلَا
 حَرْفُنَا مِن شَيْءٍ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا نَارَ سِنِّ
 قُلُوبِهِمْ هَلْ يُعَذِّبُكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۚ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ
 قَدِ انْتُمُ الْإِنسَانُ تُخَرِّصُونَ (الانعام ۱۲۷)

غریب مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم لوگ شرک کرتے اور نہ ہمارے
 باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز (اپنے اوپر) حرام کرتے۔ اسی طرح (باتیں بنائیں گے)
 جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں وہ (میغیروں کو) جھٹلاتے رہے یہاں تک
 کہ ان لوگوں نے ہمارے عذاب (کے مزے) کو چکھا (لے) رسولی تم کہو کہ کیا
 تمہارے پاس کوئی دلیل ہے (اگر ہے) تو ہمارے (دکھانے کے) واسطے
 اس کو نکالو (دلیل تو کیا پیش کر دے گے) تم لوگ تو صرف اپنے خیال خام کی
 پیروی کرتے ہو اور صرف اٹکل بھولیا کرتے ہو۔
 اگر ہدایت دگر ہی انسان میں شیت الہی کی وہ سے ہوتی تو روسے زمین پر فساد کا نام
 و نشان بھی نہ ملتا۔

لَوْلَئِنَّ اللَّهَ لَسَخَّرَ لَلسَّيِّئِينَ النَّاسَ جَمِيعًا (الزمر ۲۱)

اگر خدا چاہتا تو سب لوگوں کی ہدایت کر دیتا۔
 منفرین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہر قسم کا فساد خدا کے ارادہ سے واقع ہوتا ہے
 میں کہ خود قرآن نے حکایت کی ہے:-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ فَاجْشَوْا فِجْشَةً قَالُوا: وَحَيْذُ نَأْتِيهِمَا آيَاتُنَا مِنَ اللَّهِ أَمْرًا نَّجِيًا
 قُلُوبُهُمْ: إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ اتَّقُوا اللَّهَ عَلَىٰ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (الاحزاب ۳۷)

اور وہ لوگ جب کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اسی طریقہ پر اپنے
 باپ داداؤں کو پایا اور خدا نے (یہی) حکم دیا ہے (لے رسولی تم صاف

کہدو کہ خدا ہرگز برے کام کا حکم نہیں دیتا کیا تم لوگ خدا پر (افترار کے) وہ باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

خداوند عالم نے جس طرح عمل صالح کے لئے ثواب مقرر کیا ہے اسی طرح فساد و باطل کے لئے جزا اور عقاب بھی مقرر کیا ہے لیکن گناہوں پر سزا مقرر کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس نے گناہوں کے کرنے کو بھی کہا ہے۔ اگر کوئی سمجھد ارادی مٹی کے تیل کے استنکاب میں مایوس کی تیلی جلائے اور تیل کو آگ لگ جائے تو ممکن ہے خود جلانے والا بھی اس میں جل جائے۔ یہ ایک فطری قاعدہ ہے جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے اور آگ جلانے والے نے اگرچہ اس قاعدہ کو جانتے ہوئے یہ اقدام کیا ہے۔ تو پھر اس کا یہ عمل نہ صرف یہ کہ فطری ضرورتوں کے تابع نہیں ہے بلکہ فعلند انسان کی طبیعت کے بھی خلاف ہے۔

مسئلہ جبر و اختیار میں انسان کی ہستی اور اس کے افعال کے طبعی آثار تو ارادۃ الہی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے اختیاری افعال خود انسان کے ارادہ سے واقع ہوتے ہیں۔ پس شیعہ نقطہ نظر سے اسلامی نظریہ یہ ہے کہ انسان اس قسم کے ارادۃ مطلقہ کا حامل نہیں ہے کہ خدا کے اس ارادہ و مشیت کے برخلاف جو قوانین و سنن بنا کر کائنات کے اندر پھینے ہوئے ہیں ان کے چوکھٹے سے تجاوز کر کے کوئی اقدام کرے۔ کیونکہ۔ معاذ اللہ۔ خدا نہ تو اپنی مخلوق کے مقابلہ میں کمزور ہے نہ عاجز ہے نہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اور نہ آدمی ہی اتنا مجبور ہے کہ وہ سب دلعنواہ اپنے لئے زندگی کا راستہ بھی منتخب نہ کر سکے اور حیوانات کی طرح دست بستہ غرایز کا اسیر ہو۔

قرآن مجید تصریح کر دیا کہ خدا نے لوگوں کو پہل ارشاد کی ہدایت کر دی ہے لیکن ان انسان کو نہ اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ہدایت قلاع کا راستہ اختیار کرے اور نہ اس پر مجبور کیا ہے کہ ضلالت و گمراہی کا راستہ اختیار کرے۔

وَلَا تُكَلِّمُ الْكَافِرِينَ إِنَّمَا أَكَلَّتْ أَلْسِنُهُمْ لَقَدْ كَفَرُوا۔ ہم نے ان کو راستہ بھی دکھادیا (یاد رہے) خود شکر گزار ہو خواہ ناشکر (اللہ عزوجل) پس ثابت ہوا کہ انسان کے اختیاری افعال کی نسبت خدا کی طرف دینا قرآن کی نظر میں مردود ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ قضا و قدر

قضا و قدر

مسئلہ قضا و قدر ان جنہائی مسائل میں سے ہے جس میں بہت سے مواقع میں مختلف اسباب کی وجہ سے تحریف ہو گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس مسئلہ کو لوگوں نے وقت نظر سے سمجھا ہی نہیں اور جن لوگوں نے سمجھا بھی اس میں ان کو ان کی بدینتی نے اکھا دیا۔ اسی لئے ہم یہاں پر مختصر طریقے سے اس کے بارے میں بحث کریں گے اور کوشش بھر رکھیں گے سمجھانے کی سعی کریں گے۔

دیکھئے اس کائنات میں ہر چیز کو حساب و منطق اور دقیق قانون کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ اور ہر چیز اپنے حدود و مشخصات کو ان اہل و موجبات سے کب کرتی ہے جس سے وہ وابستہ ہے جس طرح ہر موجود اپنے وجود کو اپنی علت سے حاصل کرتا ہے اسی طرح ہم ظاہری و باطنی حقائق کو بھی علت ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اور اسی کی طرف اندازہ گیری بھی ہوتی ہے۔ اور چونکہ ہر علت و معلول میں ایک قسم کی مجاہدت و سختی ہوتی ہے۔ اس لئے طبی طور سے ہر علت اپنے مناسب اثر کو اپنے معلول میں منتقل کرتی ہے۔

اسلام کی نظریں قضا و قدر کا مطلب، خدا کا وہ قطعی حکم ہے جو کائنات کے امور کے جریان اور ان کے حدود و اندازہ کے بارے میں ہو۔ اور نظام آفرینش میں ہونے والی ہر چیز — اور اسی میں اعمال انسانی بھی شامل ہیں — اپنی علت کی طرف سے حکم قطعی پاتی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ علت کا عام قاعدہ ہر چیز کو شامل ہے اور ہر چیز اس کے دائرہ میں ہے۔ یہ ہے کہ ان کے اختیاری افعال بھی علت کے عام قاعدہ کے اندر آتے ہیں۔

یعنی ہر معلول کے لئے ایسا علت مندرجہ ذیل ہے (ترجمہ)

قضا : یعنی وہ مضبوط و حتمی عمل جس میں رجوع نہ ہو۔ اور یہ خدا کا فعل ہوتا ہے یعنی خالقیت۔
 قدر : یعنی اندازہ دینے کا فن یا نظام آفرینش کا ایک سسٹم تک ہوتا ہے۔ اسی کو نظام آفرینش
 کے جریان کی کیفیت و چگونگی کا بیان کرنا بھی کہا جاتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق یعنی
 ہوں گے کہ خدا نے ایک سسٹم تک اور حساب شدہ جہاں ہستی کو پیدا کیا اور قدر
 اس کی خالقیت کا محمول ہے جس کا اثر تمام موجودات میں ہے۔

اور تقدیر سے مراد خارجی و عینی اندازہ گیری ہے۔ یعنی عملی تحدید خارجی ہے۔ مکالمہ نقشہ
 بنانے والے انجینئر جس طرح مکان کا نقشہ اور خاکہ ذہنی طور پر مکانی تیار ہونے سے پہلے بناتیے
 ہیں وہ والا اندازہ مراد نہیں ہے اور قرآن مجید انھیں قالب ڈالے ثابت کو تمام خصوصیات کے
 ساتھ اور ہر چیز کے اندازہ کو قدر کے نام سے یاد کرتا ہے :-

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (الفرقان / ۴۹)

بیشک ہم نے ہر چیز ایک مقرر انداز سے پیدا کی ہے۔

قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (الطلاق / ۴۲)

خدا نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

تمام عقلی اور طبعی ضرورتوں کو اور تمام ان اجزائے علت کو جو حوادث کی پیدائش کا موجب
 ہوتے ہیں خدا نے ان کو قضا سے تعبیر کیا ہے۔ اور اپنے معین شروط کے ساتھ جب تک وہ
 انداز سے پورے نہ ہو جائیں اور مقتضیات مکمل نہ ہو جائیں قضا کا وجود نہیں ہوا کرتا۔

خداوند عالم موقعیت زمانی و مکانی اور حوادث کے حدود کو نظر میں رکھ کر پھر اسی بنیاد پر
 قضا کا حکم نافذ کرتا ہے۔ اور اس عالم میں جو بھی عامل ظاہر ہوتا ہے وہ علم و ارادہ حق کا مظہر
 ہوتا ہے اور قضا کے الہی کے نفاذ کا وسیلہ ہوتا ہے۔

ہر چیز کے اندر تکامل کی استعداد ہو کر رہی ہے۔ اور مادہ جو قانون حرکت کے ماتحت
 ہے اس میں مختلف صورتوں کے قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد ہوتی ہے اور عوامل کے

کے تحت تاثیر مختلف حالات و کیفیات کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی مادہ بعض عوامل سے ایسا ایندھن بن سیکر جو اسکو حرکت پر آمادہ کر سکے بعض دوسرے عوامل سے ٹکرا کر ان کی موت میں آکر اپنا وجود ختم کر دیتا ہے۔ اور کبھی اپنی پیشروی کو باقی رکھتے ہوئے مختلف مراحل کو پیچھے چھوڑتے ہوئے حد کمال تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی پیشروی کو باقی نہ رکھ کر ٹھہر جاتا ہے۔ کبھی تو بطور عجلت اپنی حرکت میں سرعت پیدا کرتا ہے اور کبھی تقدم کو طے کرنے کے لئے جس سرعت کی ضرورت ہوتی ہے اس کو ختم کر دیتا ہے اور بہت ہی سست رفتاری سے حرکت کرتا ہے۔ پس اس کی بازگشت ایک ہی قسم کے قضا و قدر سے مربوط نہیں ہے۔ کیونکہ علت ہی معلول کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے، اور چونکہ مادی موجودات کا تعلق مختلف علتوں سے ہوتا ہے اس لئے ایک دوسرے کے میسر میں تفاوت ہو کرتا ہے۔ اور ہر علت موجود معلول کو ایک مخصوص دھڑ پر لگا دیتی ہے۔

فرض کیجئے ایک شخص آنت بڑھنے کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو یہ بیماری کسی مخصوص وجہ سے ہوئی ہوگی اور اس کا انجام دو طرح ہو سکتا ہے :

- ۱۔ آپریشن کر کے ٹھیک ہو جائے تو اس کا دھڑ اس علاج کی وجہ سے بدل گیا۔
- ۲۔ یہ آپریشن نہ کر کے مر جائے تو یہ دوسرا راستہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مریض کے راستے مختلف اور تغیر ہیں اور خود مریض کی مرضی کے تابع ہیں لیکن مریض کی مرضی — چاہے جو بھی ہو — قضا کے الہی کے دائرے سے خارج نہیں ہے۔

یہ بات قطعاً شرعاً و عقلاً غلط ہے بلکہ تکنیکیاً بھی ناجائز ہے کہ مریض یہ ٹکڑ بیٹھ جائے کہ اب تو تقدیر کی بات ہے اگر قسمت میں زندگی لکھی ہے تو زندہ رہوں گا علاج کروں یا نہ کروں اور اگر موت لکھی ہے تو چاہے ہزار علاج کروں مر جاؤں گا — اب اگر مریض علاج کر کے اچھا ہو جاتا ہے تو یہی اس کی تقدیر و قسمت ہے اور اگر علاج نہ کر کے مر جاتا ہے تب بھی اس کی ہی تقدیر و قسمت ہے۔ دونوں صورتیں اس کا مقدر ہیں۔

جو لوگ سستی اور کاہلی کرتے ہیں اور کسی قسم کا کام نہیں کرتے۔ پہلے طے کر لیتے ہیں کہ کام نہ کریں گے تاہم ہر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں اور جب جیب خالی ہو جاتی ہے اور فقیر پوٹتے ہیں تو اپنی فیکری کو مقدر کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہی لوگ کام کرنے محنت مزدور کرتے اور پیسے والے ہو جاتے جب بھی وہ تقدیر ہی کا کرشمہ ہوتا۔ لہذا چاہے الٹا کیا کرے یا نہ کرے بہر صورت وہ تقدیر ہے۔ خلاف تقدیر کچھ نہیں ہے۔

بنابراین سر نوشت میں تبدیلی و تفسیر قانون علیت کے مخالف نہیں ہے۔ جو عامل بھی کائنات میں موثر ہے وہ علیت نامی کے قلمرو سے خارج نہیں ہے اور جو چیز سر نوشت کے بغیر و تبدیلی کا سبب بنتی ہے وہ خود بھی حلقہ ہائے علیت میں سے ایک حلقہ ہے اور مظاہر قضا و قدر الہی کا ایک عامل ہے۔ مختصر یہ کہ ایک قضا و قدر دوسرے قضا و قدر سے بدل جاتا ہے۔

البتہ قوانین میٹافیزیقی — حیات بعد الموت — کا تعلق حوادث سے ایک طرح کا نہیں ہوتا جیسے کہ قواعد علوم بھی اس سے زیادہ کے مساعد نہیں ہوتے۔ قوانین میٹافیزیقی ظاہر و حوادث پر حکومت کرتے ہیں البتہ اتجاہات میں بے تفاوت ہیں۔ اور درحقیقت حوادث و ظاہر اور ان کی جہت گیریاں سب ہی قوانین میٹافیزیقی کے محکوم ہیں۔ حوادث کا رخ چاہے جدھر ہو وہ ان قوانین کے چوکھٹے سے باہر نہیں ہوتے یوں سمجھئے کہ حوادث ایک قسم کے زندہ موجودات ہیں جو ایک وسیع جنگل میں چر رہے ہیں چاہے جدھر کا رخ کیوں نہ کریں گے اسی جنگل میں رہنا واجب و شرق و مغرب جدھر بھی جائیں اس جنگل سے خارج نہیں ہوں گے۔

اور قضا و قدر الہی وہی اصل علیت کا ہر جگہ وجود ہے اور ایک امر میٹافیزیقی ہے جس کو احکام علم کے ساتھ یکساں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

اصل علیت صرف اتنا بتاتی ہے کہ ہر حادثہ کے لئے ایک دلیل ضرور ہوتی ہے۔ اس کے بعد حوادث کے سلسلہ میں اس سے زیادہ کوئی پیشگوئی نہیں کر سکتی۔ اور قانون میٹافیزیقی

میں اصلاحیت نہیں ہے۔

قانون میٹا فیزیقی کائنات کے مختلف حوادث کے لئے ایک زمین ہے۔ حادثات کے نفاذ سے کوئی فرق نہیں ہے یہ قانون۔ یوں سمجھئے۔ ایک سڑک کی طرح ہے جس پر لوگ چلتے ہیں اس کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کون کس طرح جا رہا ہے؟ اور کون کس طرف؟ حضرت علیؓ ایک شکستہ دیوار کے نیچے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے دفعتاً وہاں سے اللہ کر دوسری دیوار کے سایہ میں آ بیٹھے؛ لوگوں نے کہا اے علیؓ قضاۃ الہی سے فرار کرتے ہو؟ فرمایا قضاۃ الہی سے اس کی قدر کی پناہ لیتا ہوں۔ یعنی ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف گریز کرتا ہوں۔ بیٹھا اور فرار کرنا دونوں تقدیر الہی ہیں۔ اگر شکستہ دیوار گر جائے تو مجھے ضرر پہنچ جائے تو یہ بھی قضا و قہد ہے اور اگر جائے خطر سے دور ہو جاؤں تو یہ بھی قضا و قہد ہے۔ قرآن مجید ان نظام و قوانین طبیعت کو جو کائنات پر حاکم ہیں اسے حتی و ناقابل تغیر جہاں رکھتے ہیں بطور سنت الہی یاد کرتا ہے:-

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (الاحزاب/۶۳)

اور تم سنت الہی کے اندر ہرگز تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔

اور اس کو بھی سنت الہی قرار دیتا ہے:-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (النور/۵۵)

وہ ایمانداروں! تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے

کام کئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ایک ذائقہ دے گا اور ان کے دین

مذہب کو تبدیل کرے گا

پر نائب مقرر کرے گا۔ جس طرح ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے
ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے (اسلام) اس پر انہیں
ضرور ضرور پوری قدرت دے گا اور ان کے مخالف ہونے کے بعد (ان کے
ہر کسی کو) امن سے ضرور بدل دے گا کہ وہ (اطمینان) میری عبارت کریں گے
اور کسی کو ہمارا شریک نہ بنالیں گے اور جو شخص اس کے بعد بھی ناشکر کی کرے
تو ایسے ہی لوگ بدکار ہیں —

اسی طرح یہ بھی سنت الہی قرار دیا ہے :

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يَغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (الرعد ۱۱)

جب تک لوگ خود اپنی نفسی حالت میں تفسیر نہ ڈالیں خدا ہرگز انہیں ڈالاکرتا۔

اسلامی نظریہ میں واقعات کا انحصار صرف مادی علتوں میں نہیں ہے اور نہ ہی حسی
علاقات اور مادی ابعاد تک نظر کو محدود رکھنا چاہئے۔ کیونکہ معنوی عوامل بھی اس
حد تک ہیں کہ جہاں مادی کے پہونچنے کا امکان نہیں ہے اور ان عوامل معنوی کا وقوع
حادثات میں مستقل ہاتھ ہے۔ کائنات کی ترازو میں نیکی و بدی میں فرق ہے انسانی زندگی
میں احسان کے ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ مثلاً بنی نوع انسان کے ساتھ احسان، خیر،
خدمت، محبت، مودت یہ وہ اسباب ہیں جو انسان کے انجام کو سعادت اور نعيم دائم میں
بدل دیتے ہیں۔ اور ستم، ظلم، تجاوز، کشرشی، خواہشات نفس کی پیروی، غیر مشروع خود
پرستی کا نتیجہ ہمیشہ غمی، برے اثرات، پر تمام ہوتا ہے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو اندازہ
ہوتا ہے کہ گویا کائنات خود مکافات عمل دیتی ہے اور گویا یہ کائنات ہنسہ سیم و بھیر ہے۔
بلکہ اعمال کے انجام بھی مجملہ قضا و قدر ہیں کہ جس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ تم جہاں بھی جاؤ گے

وہ تمہارا دامن گیر ہوگا۔

ایک دانشمند کہتا ہے: کائنات کو بے شعور نہ کہو ورنہ تم اپنی طرف بے شعوری کی دوگے کیونکہ تم کائنات سے پیدا ہوئے ہو۔ اگر کائنات میں شعور نہیں ہے تو تم میں کہاں آگیا؟

قرآن عوامل معنوی کے لئے کہتا ہے:-

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا الْفِتْنَةَ عَلَيْنَا بَرَكَاتٍ مِنَ
السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (نور: ۹۷)

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگار بن جاتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر ان فاسق، ان لوگوں نے (ہمارے پیغمبروں کو) جھٹلایا تو ہم نے بھی ان کی کرتوتوں کی بدولت ان کو عذاب میں گرفتار کیا۔

وَمَا كُنَّا مُنْجِي الْقُرَىٰ إِلَّا أَهْلَهَا ظَالِمُونَ (قصص: ۵۸)

اور ہم تو بستیوں کو برباد کرتے ہی نہیں۔ جب تک وہ ان کے لوگ ظالم نہ ہوں۔

یہی مسئلہ قدر و قضا مکتب جبر کے پیروکاروں کے دیلون میں سے ایک دیل ہے۔ وہ

کہتے ہیں: انسان سے مستقلاً کوئی کام سرزد نہیں ہوتا کیونکہ خداوند عالم نے انسان کے ہر کام کو خواہ وہ کئی ہو یا جزئی، بد ہو یا نیک مقدر کر دیا ہے لہذا انسان کے فعل اختیاری کا کوئی مورد باقی نہیں رہتا۔ لیکن جبر اور ختمی انجام میں یہ فرق ہے کہ ہر حادثہ کا ظہور اس وقت لازمی ہو جاتا ہے جب اس کے تمام اسباب و علل متحقق ہو جائیں اور منجملہ اسباب و علل خود انسان کا ارادہ بھی ہے اور چونکہ انسان ایک موجود مختار ہے اس لئے اس کے اعمال اپنے ہدف معین کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور انسان باریش کے قطرہ کی طرح نہیں ہے کیونکہ باریش کا قطرہ ایک مخصوص جگہ سے چل کر قوت جاذبہ کے غنیل مخصوص جگہ ہی پر گرتا ہے لیکن انسان اپنے اعمال میں اپنے

قانون کے مطابق فطرت کا پابند نہیں ہے۔ اور اگر وہ قطعو کی طرح پابند ہوتا تو اپنے ان عقائد میں جس میں غور و فکر کرتا رہتا ہے اپنی مرضی سے اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ بخلاف قانونِ تجربہ کہ وہ ایک ایسا انسان موجود مانتا ہے جو آزاد تو ہے مگر اس کے ارادے مغلوب و معطل ہیں اپنے ارادہ کے مطابق کچھ کر نہیں سکتا اور وہ یہ بھی نظریہ رکھتا ہے کہ تمام عقلیں ذات انسان سے خارج ہیں اور تمام عقلوں کا تعلق صرف خدا سے ہے۔

پس قضا و قدر اس وقت مستلزمِ جبر ہوں گے جب ہی قضا و قدر انسان کی طاقت اور ارادہ کے جانشین ہوں۔ اور انسان کے ارادہ و خواہش کا اس کے اعمال میں کوئی بھی عمل دخل نہ ہو۔ حالانکہ قضا و قدر الہی وہی نظامِ سبب و مسبب کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہماری تمام خواہشیں پوری نہیں ہو پاتیں لیکن یہ ان کے مجبور ہونے کی بھی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ بشر کے لئے اختیار کا قائل ہونا اور اسی کے ساتھ اس کے اختیار کو صرف اس کے اعمال میں محدود کر دینے میں کوئی منافات نہیں ہے۔ اور اثباتِ اختیار کی دلیلیں انسان کے لامحدود اختیار کو نہیں ثابت کرتیں۔

سرزمینِ وجود پر پروردگارِ عالم نے بہت سے عوامل خلق کئے ہیں۔ کبھی تو یہ عوامل انسان پر واضح ہو جاتے ہیں مگر کبھی پوشیدہ و مخفی رہ جاتے ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر انسان قضا و قدر کی واقعی اور دقیق تفسیر سمجھ لے تو پھر ہی انسان اپنی معلومات کے چوکھٹے کے اندر اپنی طاقتوں سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے پہلے سے زیادہ کوشش کرنے لگے گا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ معرفت واقع حاصل ہو جائے اور اسی کے نتیجہ میں زیادہ کامیابی حاصل کر سکے۔ اور خواہشوں کا پورا نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ انسان کی قوتیں محدود ہیں۔ حصوں کا میابی کے عوامل تک رسائی نہیں ہو پاتی جس کے نتیجہ میں خواہشیں نقشِ بر آب ہو جاتی ہیں۔

پس معلوم ہو کہ ہر موجود کا انجام اپنی سابقہ عقلوں سے مربوط ہوتا ہے۔ مگر وہ بھی

اصل معیت عمومی کے قبول کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ خواہ ہم مبدا الہی پر ایمان لائیں یا نہ لائیں کیونکہ انجام آزادی کے مسئلہ میں یہ موثر نہیں ہے۔ یعنی خواہ انسان کا نظریہ ہو کہ کائنات کا نظام اسباب و مسببات لب اللہ کے ارادہ و مشیت سے وابستہ ہے یا اس کا نظریہ ہو کہ یہ نظام کائنات مستقل ہے خدا سے اس کا کوئی ربط نہیں ہے دونوں صورت میں عقیدہ جبر و قضا و قدر کا نتیجہ نہیں ہے۔ خلاصہً مقصود یہ ہے کہ ہر حادثہ کا رابطہ اپنی علتوں سے الٹ ہے۔ اور منجملہ علتوں کے خود ان کا اعتبار و ارادہ ہے نہ کہ سبب و مسبب کا انکار۔

قضا و قدر الہی ہر عالم پر ہونے والی چیز کو اس کے خاص مجرے علت سے پیدا کرتا ہے اور ایک قانون عام کی طرح خدا کی مشیت پورے عالم پر مچائی ہوئی ہے اور ہر تغیر بھی سنت الہی کے بنیاد پر ہے اور اس کے علاوہ کسی صورت میں قضا و قدر کا تحقق نہیں ہوگا اور جو بھی علمی نظریہ اصل معیت عمومی کو قبول کرتا ہے وہ اس قسم کے روابط کو قبول کرنے پر مجبور ہے چاہے مکتب الہی کا پیرو ہو یا مکتب مادی کا پیرو ہو۔

اب اگر کسی بھی حادثہ کا ظہور — اس میں افعال و افعال بھی شامل ہیں — اصل و سبب کی بنا پر قطعی ہو جائے اور یہ محدث قطعی مفید جبر ہو تو پھر دروزن مذکوروں کا نتیجہ جبر ہوگا اور اگر محدث حوادث کا قطعی ہونا مفید جبر نہیں ہے تو الہی مکتب اور مادی مکتب میں کیا فرق ہے؟

اُن جو تفاوت ثابت ہے وہ یہ ہے کہ دینی تصور کا خیال ہے کہ یہاں پر معنوی امور کا ایک سلسلہ ہے جو ان عوامل کا جزو ہے جو بہت سے حوادث کی پیدائش میں بہت اثر ہیں۔ یہ دینی تصور یہ بھی کہتا ہے کہ وجود میں کچھ ایسے معنوی اسرار و رموز ہیں جو عوامل مادی سے کہیں زیادہ دقیق اور پیچیدہ ہیں۔ یہ دینی تصور زندگی کو روح، مقصد، معنی عطا کرتا ہے اور ان کو نشاط، قوت، فکر، بصیرت کی گہرائی افقی میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ اور ان کو ہونا ک مہلت کے گڑھے میں گرنے سے روکتا ہے اور

بغیر توقف و رکود کے انسانی سیر کو کمال کی طرف پہنچاتا ہے۔ یہ باتیں مادی تصور میں نہیں پائی جاتیں۔

بنابریں ایک فرد الہی کہ جو بطور راسخ و قدح کا معقد ہے اور اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ انسان و جہان کی خلقت میں حکیمانہ مقاصد مضمر ہیں اس اعتماد و توکل کے ساتھ جو صراطِ مستقیم طے کرنے میں خدا پر رکھتا ہے اور اپنے کاموں میں اسکی حمایت و پشتیبانی پر بھروسہ رکھتا ہے وہ شخص اپنے فعالیت کے ثمرات و نتائج کا زیادہ اور مطمئن تر ہو کر امیدوار رہتا ہے۔

لیکن جو شخص جہاں مادی کے تار پود میں گرفتار ہے۔ اور مخصوص تفکر کے دائرے میں مادی قضا و قدر کی طرف میلان رکھتا ہے وہ اس عزت سے برخوردار نہیں ہے۔ کیونکہ اپنے ارادوں کی تکمیل پر اطمینان نہیں ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں نظریوں میں تربیتی، اجتماعی، روحانی لحاظ سے بہت عظیم فاصلہ موجود ہے۔

اناطول فرانس (ANATOLE FRANCE) کہتا ہے: یہ دین کی قدرت و نیکو کاری ہے جو انسان کو اعمال میں عواقب و اسباب کی تعلیم دیتی ہے۔ اور جس وقت ہم قضا الہی کے فلسفہ کے اصول سے دستبردار ہو جائیں گے۔ جیسا کہ ہم آجکل عصرِ علم و حریت میں ہیں۔ تو ہمارے پاس کوئی دوسرا ایسا وسیلہ نہیں رہ جائیگا جس سے ہم کو معلوم ہو کہ ہم دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ اور کس مقصد کے لئے اسی جہان میں قدم رکھا ہے؟

رازِ سرِ نوشت ہم کو اپنے طاقتور اسرار میں گھیرے ہوئے ہے۔ اور واقعی ہم کو کسی چیز میں خود و منکر نہیں کرنا چاہئے تاکہ غم انگیز زندگی کے ابہام کا احساس ہی نہ کر سکیں اور ہمارے رنج و غم کی جڑیں ہمارے اس جہلِ مطلق کی وجہ سے ہیں کہ ہم کو اس زندگی میں اپنے وجود کی علت بھی معلوم نہیں ہے۔

اگر ہم جہد فی و روحانی تکالیف اور روح و احساس کے شکنجوں کے فلسفہ کو سمجھیں

اور ایک شیت الہی کا اعتقاد کر لیں تو ان خداوند کو برداشت کر لیں گے۔
مومن مشکبختوں اور اپنے روحانی عذاب سے بھی لذت کا احساس کرتا ہے۔ انتہائی
ہے کہ مومن سے جو گناہ و خطا سرزد ہو جاتی ہے اس کی وجہ سے مایوس نہیں ہوتا۔ لیکن
جس دنیا میں شعلہ ایمان بالکل بجھ چکا ہے وہاں درد، مرض حتیٰ کہ اپنے کو بھی مار بیٹھا
ہے اور سوائے بے تکلی شوخیوں اور مسخرہ پن کے وہاں کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

قضا و قدر کی ناقص تفسیر

کچھ نوزائیدہ متقف حضرات قضا و قدر کے بارے میں غلط تصور کی وجہ سے کہتے ہیں، قدر کا عقیدہ انسان میں جمود و رکود پیدا کرتا ہے اور انسان کو زندگی میں کسی بھی کوشش اور عمل سے مانع ہوتا ہے۔

مغفل دنیا میں اس غلطی کے عام ہونے کی وجہ مسئلہ قضا و قدر کا صحیح مفہوم نہ جاننا ہے اور خصوصاً اسلامی تعلیم کے سطح سے عدم واقفیت ہے۔ اور اس غلط مغربی تصور کا مشرقی لوگوں میں پھیلنے کی علت یہ ہے کہ مشرقی ابھی مغرب سے پیچھے ہے۔ ہر وہ شخص یا قوم جو اپنے مادی و معنوی خواہشات تک نہیں پہنچ پاتا وہ دل کو بہلانے کے لئے الخطا، مصیر، صدقہ، توفیق، قضا، قدر جیسے انعطاف کا سہارا لیتی ہے۔ رسول اکرم کا فرمان ہے: میری امت اور میرے ماننے والوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ وہ گناہ و تباہ کاری کے مرکب ہو اور فساد کی توجیہ کے لئے کہیں گے قضا و قدر الہی کا تقاضا ہی یہی تھا۔ ہم کیا کریں ہمارے کوئی غلطی نہیں ہے یہ سب مقدر کا کھیل ہے (ترجمہ)۔ اگر اس قسم کے لوگوں سے تمہاری ملاقات ہو جائے تو ان سے کہہ دو میں ان سے بیزار ہوں۔

زندگی میں انسان کو حصول مقصد کے لئے قضا و قدر اس کے سعی بہم سے کبھی نہیں روکتی۔ بلکہ جو لوگ اس مسئلہ میں ضروری دینی فکر سے مطلع ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام نے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ روح و معنی کے ساتھ ساتھ حیات مادی کی تنظیم میں اپنی ضرورت سے زیادہ کوشش صرف کریں یہ ایک ایسی دعوت ہے جو انسان کی کوششوں میں سرعت پیدا کرنے کے لئے موثر ہے۔

مفرق مفکرین میں سے جن لوگوں نے قضا و قدر کی ناقص تفسیر کی ہے۔ ان میں ایک جان پولی سارتر (JEAN PAUL SARTRE) ہیں چنانچہ ان کا تصور یہ ہے: قضا و قدر الہی کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ انسان کا اپنے افعال و اعمال میں حریت و اختیار کا عقیدہ نہیں مانا جاسکتا۔ ان دونوں میں سے ایک ہی عقیدہ کو مانا جاسکتا ہے۔ یا تو خدا اور اسکی قضا و قدر اور یا پھر ان کی حریت و اختیار! چنانچہ وہ کہتا ہے: میں چونکہ ان کی حریت کا قائل ہوں اس لئے خدا پر عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ اگر میں خدا پر عقیدہ رکھوں تو اسکی قضا و قدر پر بھی عقیدہ رکھنا ہوگا اور اگر قضا و قدر کو مان لوں تو ان کی حریت سے ہم قہر اٹھانا پڑے گا۔ لیکن چونکہ میں حریت انسان کا عقیدہ رکھتا ہوں لہذا خدا پر ایمان نہیں رکھ سکتا!

حالانکہ خداوند عالم کی قضا و قدر عام ہے ایک طرف سے اور انسان کی آزادی و حریت سے دوسری طرف سے کوئی منافات نہیں ہے۔ قرآن مجید جو شیت الہی کو عام جانتا ہے اسی کے ساتھ ان کی آزادی کا قائل ہے اس کو خود سازی پر آگاہ و توانا دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اچھے برے کی شناخت، نشت و دنیا کی پہچان اور ان میں سے ایک کو اختیار کرنا یہ خود ان کا کام ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاكَ سَبِيلَ الْفَاسَادِ وَآمَّا كُفْرًا (الدھر ۲)

ہم نے انسان کو راستہ بھی دکھایا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکر دوسری جگہ ہے:-

وَمَنْ أَمَّا ذَ الْآخِرَةِ وَ سَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا (الاسراء ۱۹)

اور جو لوگ آخرت کے متنی ہوں اور اس کے لئے جیسی چاہئے ویسی کوشش بھی کریں اور وہ ایمان دار بھی ہو تاویہی لوگ وہ ہیں جن کی کوشش

منقول ہوگی۔

اور جو لوگ قیامت میں یہ کہیں گے ان کی ملامت کرنا ہے :-

لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبْدْنَا مِنْ دُذُنِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا
حَدَّثَانَا مِنْ دُذُنِهِ مِنْ شَيْءٍ (رائع / ۳۷)

اگر خدا چاہتا تو نہ ہم ہی اس کے سوا کسی اور چیز کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ
دادا اور نہ ہم بغیر اس کی مرضی کے کسی چیز کو حرام کرتے۔

قرآن کی کسی بھی آیت میں فساد و ضلال کی نسبت یا اصلاح کے ممانعت کی نسبت قطعی
الہی کی طرف نہیں ہے۔ کوئی ایسی آیت آپ کو نہیں ملے گی جس میں ارادہ ان کی جگہ اللہ کے
ارادہ کو دخل دیا گیا ہو۔ اور نہ کہیں یہ ملے گا کہ قرآن کہہ رہا ہو کسی فرد یا افراد کو اس لئے مبتلا
کیا گیا ہے کہ فساد کے الہی کا تقاضا ہی تھا۔ البتہ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ فلاں کو غضب خدا
گھیر لیا یا سرکشوں کو خدا عذاب الیم دے گا۔

اور چونکہ خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ لائقہ ولا تھلی نعموں کا انعام کیا ہے لہذا
اگر ان میں سے کوئی طریق اصلاح و طہارت کی طرف ملے تو وہ توبہ قبول کرے والا ہے۔ واپسی
کا راستہ کھول دیتا ہے اور توبہ قبول کر لیتا ہے اور یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

انسان کے ارادہ و اختیار کا دائرہ اگرچہ جملہ حیوانات سے وسیع ہے مگر پھر بھی اسی دائرہ
کے اندر ہے جو خدا نے اس کے لئے محدود و معین کر دیا ہے۔ اس لئے انہی پوری زندگی میں
ہر خواہش کو پورا نہیں کر پاتا۔ اسی لئے ایسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کام کے انجام دینے
کا ارادہ کرتا ہے لیکن چاہے جتنی بھی کوشش کرے نتیجہ تک نہیں پہنچ پاتا اس کی علت
یہ نہیں ہے کہ خدا کا ارادہ اس کے ارادہ کے مقابلہ میں حائل ہو گیا اور اس کے انجام کار سے مانع
ہو گیا۔ بلکہ ایسے مواقع پر کچھ مبہول خارجی عوامل ہوتے ہیں جو ان کی دانائی اور توانائی
کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں وہ ان کے مقاصد کے راستے میں حذر راہ بن جاتے ہیں۔

اور اسکی خواہش کو پورا نہیں ہونے دیتے۔

جب ہم یہ جانتے ہیں کہ کوئی علت بغیر معلول کے اور کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا اور ہمارے وسائل اور امکانات بہت ہی محدود و قاصر ہیں تو ہم کو یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ہم اپنی تمام خواہشات کو پورا بھی نہیں کر سکتے۔

خداوند عالم نے اس نظام وجود میں مبادیات و عوامل پیدا کئے ہیں۔ بعض تو انسان کیلئے مضموم ہیں مگر کثرت ان عوامل کی ہے جو غیر معلوم ہیں بلکہ ان کا حساب ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس معنی کے بنیاد پر فضا و قدر نہ صرف یہ کہ انسان کے اختیار کو سلب نہیں کرتے اور نہ ہی اسکی فعالیت اور سعادت بخش زندگی تک پہنچنے سے مانع ہوتے ہیں۔ بلکہ فکر و عمل کیلئے راہنما ہیں اور اپنی کوشش بھروسہ انسان کو حرکت میں لاتے ہیں تاکہ افزائش و دانش کی راہ میں اور جتنے بھی دقیق تر عوامل جو زندگی کی کامیابیوں کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں ان کو پہنچائیں۔ بس اس قسم کے فضا و قدر پر عقیدہ رکھنا خود انسانی مقاصد کی تکمیل و ترقی کے لئے ایک موثر ہے اس بحث اور گزشتہ بحث کے ضمن میں انسان کی تفاوت و سعادت کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کیونکہ تفاوت و سعادت انسان کے افعال و اختیار پر اور حرکات اختیار پر ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تفاوت و سعادت نہ تو انسان کے اختیاری اعمال کی صفت بنتی ہیں اور نہ ان عوامل طبعیت کی صفت بنتی ہیں جو وجود انسان میں موثر رول ادا کرتے ہیں۔

یاد رکھئے ماحول اور وراثت اور تمام وہ چیزیں جو انسان میں طبعی طور سے نمودار ہیں ان میں سے کوئی بھی شے انسان کی تفاوت و سعادت میں الزامی اثر نہیں رکھتی۔ یہ چیزیں انسان کے انجام کو معین نہیں کرتیں۔ بلکہ جو چیز ان کا مستقبل بناتی ہے اور اس کو

۱۔ اس کے منہ پہلے گزار چکے ہیں۔

ترقی یا تنزلی تک پہونچاتی ہے وہ خود انسان کا ذاتی اختیار ہے اور یہ بات ہے کہ وہ اپنی علمی اور عقلی قدرت سے اور اپنی صلاحیتوں سے کس قدر فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

سعادت و خوشبختی کا اس بات سے کوئی علاقہ نہیں ہے کہ انسان مواہب طبعیت کے کس کیت یا کیفیت میں متمتع ہے۔ بلکہ جس کے ہاتھوں میں فراوان سرمایہ ہے اس کی سنو بھی محاسن تر ہے بقول شخصے "ہر کر باش بیش برفش بیشتر" اور اس کا انحراف ایک کزود و کم مایہ کے انحراف کے برابر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حساب انھیں امکانات و استعدادات کے مطابق ہوگا جن سے وہ متمتع ہے۔

یہ بات بہت ممکن ہے کہ جس شخص کی ذات میں پوشیدہ توانائی اور ذخیرہ کم ہے اور ظواہر طبعیت کے سحر فاسے قابل توجہ سرمایہ کا مالک بھی نہیں ہے۔ لیکن اپنی وضع و موقع کو اپنی عائد شدہ تکالیف و مسوئیات سے ممکن طور پر تطبیق دیتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اس سعادت تک پہونچ جائے جو انسانی مرتبہ و مقام کے لائق و مناسب ہے۔

کیونکہ ان میں سعادت و کامیابی تک پہونچا ہے وہ اپنے اندر ذخیرہ شدہ صلاحیتوں کے صحیح استعمال کی وجہ سے ہے۔ ویسے اس کے برعکس بھی ممکن ہے۔ باین معنی کہ مالدار اور ثروت مند سعادت تک نہ پہونچ سکے بلکہ ہو سکتا کہ مورد استفادہ کر کے گمراہ و شقی ہو جائے اور کبھی بھی فلاح یافتہ نہ ہو سکے :-

سَقَى نَفْسِي بِمَا كَسَبْتُ رَهِيْنَةً (الدثر - ۳۸)

ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے۔

قرآن کا نظریہ یہی ہے کہ ہر شخص کی شقاوت یا سعادت اس کے اختیاری امور و وابستہ ہے۔ ترکیب طبعی و نفسی سے نہیں! اور یہ خداوند عالم کی آیات عدل میں سے ایک آیت ہے۔

بداد بھی شیعوں کے مخصوص عقائد میں سے ہے۔ باین معنی کہ عوامل و اسباب کے

بدلتے سے معیر بھی بدل جاتا ہے اور جو چیز بحسب ظاہر دائم و قطعی معلوم ہوتی ہے وہ انسان کے اعمال و افعال و میرت کے بدلتے سے تغیر پذیر ہو جاتی ہے۔ جس طرح مادی عوامل کبھی انسان کے معیر کو بدل دیتے ہیں اسی طرح موجد ہر عوامل معنوی بھی کبھی موثر ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو چیزیں پس پردہ ہیں اور مجرئے ظاہری کے خلاف ہیں یہ معنوی عوامل ای کو ہمارے لئے ظاہر کر دیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تغیر اسباب و شروط کی وجہ سے ہمارے لئے امر جدید کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور امر اول کی مصلحت ختم ہوتے ہی امر ثانی کی مصلحت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ نسخہ میں ہوتا ہے۔ اور جس طرح بعد والے قوانین پہلے والے قوانین کو نسخہ کر دیتے ہیں اور اس سے خداوند عالم کی جہالت یا مذمت کو نہیں ثابت کیا جاسکتا بلکہ نسخہ حکم تشریعی سابق کے ختم ہو جانے کا کاشف ہے بس یہی صورت حکم تکوینی میں بدلائی ہوتی ہے۔

باد کا یہ مطلب لینا کہ "ایک چیز کی حقیقت خدا پر مخفی تھی اس کے بعد ظاہر ہوئی لہذا خدا نے پہلا حکم بدل دیا" بالکل غلط اور استنباط ہے۔ اب عقیدہ خدا کے علم کے احاطہ کامل کے منافی ہے کوئی بھی مسلمان اس قسم کا عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔

دعا بھی ان معنوی عوامل میں ہے جس کی اہمیت میں کمی نہیں کرنی چاہئے۔ خداوند عالم ہر شخص کے اندرونی اسرار سے واقف ہے۔ مگر بندے کا عالم روح و معنی میں اپنے رب سے دعا کرنا اور بندہ کا اپنے خدا سے رابطہ بمنزلہ اس نظام عمل کے ہے جو انسان کے طبیعت سے رابطہ و علاقہ میں ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے دعا خود مستقل ایک عمل کر نیوالی چیز ہے۔

لہذا انسان کا فریضہ ہے کہ اگر کبھی مشکلات کے محاصرے میں آجائے تو دامن یاس و غم کو نہ پکڑے۔ کیونکہ رحمت الہی کے دروازے کبھی کسی کے لئے بند نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے آئندہ بالکل ایسا امر جدید ملے کہ آئے جس کا انسان تصور بھی کر سکتا

ہو۔ ارشادِ خدا ہے :-

كَلَّ يَوْمَ هَوٰى شَانِ (المؤمن / ۳۸)

وہ ہر روز (ہر وقت) مخلوق کے ایک نہ ایک کام میں ہے۔

اسی لئے کسی بھی صورت میں دعا سے دست بردار نہیں ہونا چاہئے اور دعا کے ساتھ کوشش بھی بہت ضروری ہے کیونکہ بغیر کوشش کے دعا کے بارے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ الداعی بلا عمل کا لڑھی بلا دستور۔ بلکہ ان کا فریضہ ہے کہ اپنی کوششوں کے ساتھ ساتھ نہایت علوم و رجاء سے اپنا معاملہ خدا کے حوالہ کر دے اور تقاریر مطلق سے امداد و اعانت طلب کرتا رہے۔ اور یہ بات شک سے بالکل ہے کہ خدا اپنے مومن بندہ کی مدد کرتا ہے۔ ارشاد ہے :-

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ ۚ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِلَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (ہود / ۱۸۵)

وہ رسولؐ، جب میرے بندے میرا حال تم سے پوچھیں تو رکھہ و کم میں ان کے پاس ہی ہوں اور جب مجھ سے کوئی دعا مانگتا ہے تو میں اس دعا کو نیا لے کر اس کے دعا رسن لیتا ہوں اور جو مناسب ہو تو قبول کرتا ہوں۔ پس انھیں چاہئے کہ میرا بھی کہہ سکیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ تاکہ وہ سیدھی راہ پر آجائیں۔

البتہ یہ بات مفروضہ ہے کہ روح اسی صورت میں اوج کمال تک پہنچتی ہے اور ان کو بحیر سعادت میں غرق کر دیتی ہے جب انسان اضطراب و دماندگی کے گڈھے میں گرے بغیر اپنے کو ملل و اسباب سے منقطع کر کے خدا سے وابستہ ہو جائے۔ تو یہاں پر اپنے کو اپنے خدا کے ساتھ دیکھے گا اور خدا کے لطف و عنایت خاص و بے پایاں کو محسوس کرے گا۔

امام سجادؑ دعائے ابو حمزہ ثمالی میں فرماتے ہیں : خدایا ! مطالبے راستے تیری طرف کھلے پاتا ہوں اور تیری طرف امیدوں کے گھاٹ بھرتے دیکھتا ہوں۔ تیرے فضل و کرم سے استغاثت ان لوگوں کے لئے، جو نہجہ سے لوٹنا گئے ہیں مباح دیکھتا ہوں۔ دعا کے دروازے

صافین و مظلومین کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ میں جانتا ہوں تو امید کر نیوالوں (کی دعا کو) قبول کرتا ہے اور مظلومین کی مدد کرتا ہے۔

روایت میں ہے : اپنے گناہوں کی وجہ سے مرنے والوں کی تعداد اپنی موت سے مر نیوالوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح روایت میں یہ بھی ہے : احسان کی وجہ سے زندہ رہنے والوں کی تعداد اپنی عمر طبعی کے مطابق زندہ رہنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہے : انسان کی موت گناہوں سے زیادہ ہے بہ نسبت طبعی موت کے اور انسان کی زندگی احسان کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت حیات طبعی کے (سفینۃ البحار ج ۱ ص ۲۸۸)

دعا اور اسکی برکت سے خدا نے جناب زکریا کو کبھی عطا کیا اور توبہ و انابت کی وجہ سے جناب یونس بن مثنیٰ اور ان کی قوم کو غلاب و بلاکت سے نجات دی۔

خداوند عالم نے کائنات میں جن قوانین کا اجراء فرمایا ہے وہ قوانین خدا کی لامحدود توانائی کو محدود نہیں کر سکتے اور اسکی قدرت عمومی کو اس سے چھین نہیں سکتے جس طرح خدا ایجاد و خلق پر قادر تھا۔ ان کے تغیر و تبدیل، محو و اثبات پر بھی قادر ہے اور اسکی استمرار پر بھی قادر ہے قوانین و مظاہر قدرت کے سامنے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔

لیکن بعض ظواہر طبیعت کے ہر وقت تبدیل پر قادر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے نظام عالم میں جو مقررات معین کر دیے ہیں ان کو توڑنا ہی رہے۔ اور قوانین و سنن و اصول میں الٹ پلٹ کرتا ہی رہے۔ بلکہ خود یہ تغیر و تبدیل بھی کچھ اصول و قوانین کے تابع ہے جس کو ہم کبھی محسوس ہی نہیں کر سکتے۔



jabir.abbas@yahoo.com